MAUL - 506

ایم.اے.اُردو

سمسٹر دوم

MASTER OF ARTS (URDU)

SECOND SEMESTER

نظم – ۲

NAZM - 2

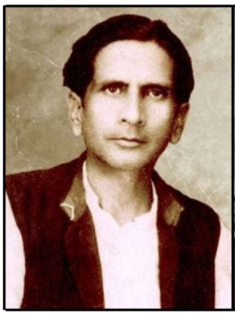
اسرارالحق مجاز

فیض احمد فیض

ن.م.راشد

مخدوم محی الدین

اختر شیرانی

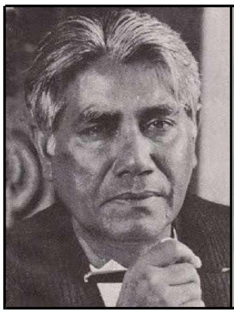
اختر الایمان

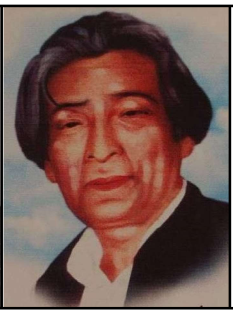
جاں نثار اختر

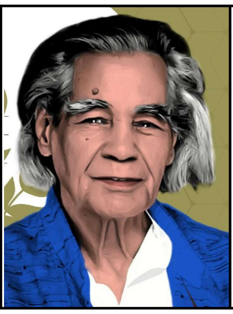
علی سردار جعفری

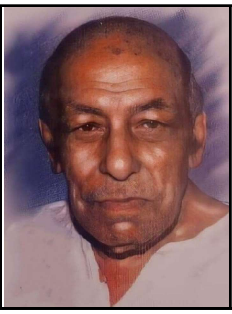
معین احسن جذبی

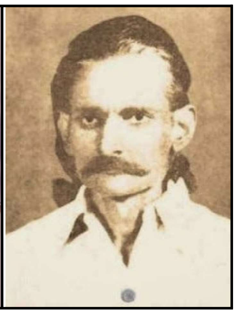
میراجی

اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

HALDWANI (NAINITAL) - 263139

ایم.اے.اُردو

MASTER OF ARTS (URDU)

سالِ اوّل

FIRST YEAR

سمسٹر دوم

SECOND SEMESTER

ایم.اے.یو.ایل - ۵۰۶ - نظم - ۲

MAUL - 506 - NAZM - 2

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

HALDWANI (NAINITAL) - 263139

سرپرستِ اعلیٰ:

پروفیسر او. پی. ایس. نیگی، وائس چانسلر، اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

کمیٹی بورڈ آف اِسٹڈیز:

پروفیسر رینو پرکاش (ڈائریکٹر اسکول آف ہیومنٹیز (SOH) اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی (UOU)، ہلدوانی۔

پروفیسر توقیر احمد خاں، ریٹائرڈ پروفیسر شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی۔

پروفیسر سید محمد ارشد رضوی، گورنمنٹ رضا پی. جی. کالج، رام پور، اُترپردیش۔

شہپر شریف، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

محمد افضل حسین، اسسٹنٹ پروفیسر وکورس کوآرڈِنیٹر شعبۂ اُردو، اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

رجسٹرار:

پروفیسر پی. ڈی. پنت، اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

کورس کوآرڈِنیٹر و ایڈیٹر:

محمد افضل حسین (اُستاد بریلوی)، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

C جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں

اس کتاب کا کوئی بھی حصّہ کسی بھی شکل میں یونی ورسٹی کی تحریری اجازت کے بغیر شائع نہ کیا جائے۔ یہ کتاب ''اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی'' کے ایم.اے. اُردو سالِ اوّل، سمسٹر دوم، نظم-۲ کے نصاب کا جز و ہے۔ مزید معلومات کے لئے یونی ورسٹی حکام یا صدرِ شعبۂ اردو سے یونی ورسٹی کے حسبِ ذیل پتے پر رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔

DEPARTMENT OF URDU

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

UNIVERSITY ROAD, BEHIND TRANSPORT NAGAR (Teenpani Bypass)

HALDWANI-263139 Phone:05946-261122

پیش لفظ

اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی کا قیام اُترا کھنڈ قانون ساز اسمبلی کے ایک ایکٹ کے تحت ۳۱/اکتوبر ۲۰۰۵ء کو عمل میں آیا جس کا مقصد فاصلاتی نظامِ تعلیم کے ذریعے آبادی کے بڑے حصے کے ایسے اَفراد کی تعلیمی ضرورتوں کی تکمیل ہے جو کسی مصروفیت یا مجبوری کے سبب کالجوں یا یونی ورسٹیوں تک نہیں پہنچ پاتے ہیں۔ یونی ورسٹی کے تعلیمی پروگرام ''ماسٹر آف آرٹ'' کے تحت ''ایم.اے.اردو'' کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ایم.اے.اردو سالِ اوّل، سمسٹر دوم، نظم-۲ کے نصاب کا جزو ہے۔ یہ کتاب ۱۰/اکائیوں پر مشتمل ہے جو الگ الگ موضوعات پر مختلف اسباق کی شکل میں ہیں۔

عزیز طلبا و طالبات!

فاصلاتی نظامِ تعلیم کی کتابوں کو {خود تدریسی مواد {SLM}(Self Learning Material) کہا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو یہ مواد خود ہی پڑھنا ہے۔ روایتی درس گاہوں کے برخلاف اِسے پڑھانے کے لئے آپ کے سامنے استاد موجود نہیں ہوگا۔ اِس صورتِ حال کے تحت اسباق کو اِس طرح تیار کیا گیا ہے کہ آپ کو کلاس میں اپنی اور استاد کی موجودگی کا احساس ہو سکے۔ اِسی لئے ہر اکائی کا آغاز ''اغراض و مقاصد'' سے کیا گیا ہے تا کہ آپ کو اِس بات کا اندازہ ہو سکے کہ اکائی کو پڑھنے کا مقصد کیا ہے؟ اُس کے بعد ''تمہید'' دی گئی ہے جس میں سبق کو مختصر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اکائی کے درمیان ''اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے'' کے تحت کچھ سوالات بھی دِیے گئے ہیں تا کہ آپ نے جو کچھ پڑھا ہے، اُسے کس حد تک ذہن نشین کیا ہے؟ اِس بات کا بھی اندازہ لگایا جا سکے۔ کتاب کے آخر میں اُن سوالات کے جوابات بھی دِیے گئے ہیں لیکن آپ کو چاہیے کہ پہلے خود اُن سوالات کو حل کریں پھر آخر میں دِیے گئے جوابات سے اپنے جوابات ملالیں تا کہ آپ کو اپنی صلاحیت کا اندازہ بھی ہو اور آپ کی ذہنی ورزش بھی ہو جائے۔ امتحان میں آپ سے جس طرح کے سوالات پوچھے جائیں گے اُس کے نمونے بھی دِیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی ہر اکائی کے آخر میں مشکل الفاظ کی ''فرہنگ'' اور ''حوالہ جاتی کتب'' کی فہرست بھی دی گئی ہے تا کہ آپ اُن کتابوں کے مطالعے سے اپنی معلومات میں مزید اضافہ کر سکیں۔

ہم آپ کی کام یابی کے لئے دعائیں اور نیک خواہشات پیش کرتے ہیں۔

ایڈیٹر

ایم.اے.اُردو

(M.A.URDU)

سالِ اوّل

FIRST YEAR

سمسٹر دوم

SECOND SEMESTER

ایم.اے. یو.ایل - ۵۰۶ - نظم - ۲

MAUL - 506, NAZM - 2

اکائی نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
بلاک نمبر 01:			5
اکائی 1	اختر شیرانی......''اے عشق! کہیں لے چل''	ڈاکٹر ریاض احمد	6
اکائی 2	مخدوم محی الدین......''چاند تاروں کا بن، چارہ گر''	ڈاکٹر ریاض احمد	23
اکائی 3	ن.م.راشد......''دریچے کے قریب''	ڈاکٹر ریاض احمد	38
اکائی 4	فیض احمد فیض......''یاد، تنہائی''	محمد افضل حسین	52
اکائی 5	اسرارالحق مجاز......''نذرِ علی گڑھ''	محمد افضل حسین	71
بلاک نمبر 02:			85
اکائی 6	میراجی......''سمندر کا بلاوا''	ڈاکٹر ریاض احمد	86
اکائی 7	معین احسن جذبی......''میری شاعری اور نقاد''	پروفیسر محمد نعمان خاں	100
اکائی 8	علی سردار جعفری......''نئی دنیا کو سلام''	محمد افضل حسین	119
اکائی 9	جاں نثار اختر......''روشنیاں، زندگی کے موڑ پر''	ڈاکٹر ریاض احمد	142
اکائی 10	اخترالایمان......''یادیں''	ڈاکٹر بی.بی.رضا خاتون	161

بلاک نمبر 01

اکائی 01	اختر شیرانی......''اے عشق! کہیں لے چل''	ڈاکٹر ریاض احمد
اکائی 02	مخدوم محی الدین......''چاند تاروں کا بن، چارہ گر''	ڈاکٹر ریاض احمد
اکائی 03	ن.م.راشد......''دریچے کے قریب''	ڈاکٹر ریاض احمد
اکائی 04	فیض احمد فیض......''یاد، تنہائی''	محمد افضل حسین
اکائی 05	اسرارالحق مجاز......''نذرِ علی گڑھ''	محمد افضل حسین

اکائی 01 : اختر شیرانی ''اے عشق! کہیں لے چل''

ساخت :

01.01 : اغراض ومقاصد

01.02 : تمہید

01.03 : اختر شیرانی کے حالاتِ زندگی

01.04 : اختر شیرانی کی شاعری

01.05 : نظم ''اے عشق! کہیں لے چل'' متن

01.06 : نظم ''اے عشق! کہیں لے چل'' تجزیہ

01.07 : خلاصہ

01.08 : فرہنگ

01.09 : سوالات

01.10 : حوالہ جاتی کتب

01.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اختر شیرانی کے عہد سے واقفیت حاصل کرسکیں گے۔ اختر شیرانی کے حالاتِ زندگی کا جائزہ لے سکیں گے۔ اختر شیرانی کی نظم نگاری کی انفرادیت جان سکیں گے۔ اختر شیرانی کی رومانی شاعری سے رُوشناس ہوسکیں گے۔ اختر شیرانی کی غزلیہ اور نظمیہ شاعری پر تبصرہ کرسکیں گے۔ اختر شیرانی کی نظم ''اے عشق! کہیں لے چل'' سے لطف اندوز ہوسکیں گے نیز مذکورہ نظم کی فنی اور جمالیاتی خوبیوں کا احاطہ اور اس کی تشریح کرسکیں گے۔

01.02 تمہید

اُردو ادب کے قدیم وجدید شعرا نے شعری ادب کی مختلف اصناف پر زورِ قلم صرف کیا ہے تاہم اصنافِ شاعری میں غزل شروع ہی سے مقبولیت کے اوّل مقام پر فائز رہی ہے۔ غزل کے بعد اصنافِ شاعری میں سب سے زیادہ مقبولِ عام اور کارآمد صنف نظم رہی ہے۔ اردو شعر وادب کی تاریخ کا یہ المیہ ہے کہ نظیر اکبر آبادی جیسے نظم گو شاعر کو اُن کے عہد میں وہ مقام نہ ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ حالاں کہ بعد کے برسوں میں نظمیہ شاعری میں نظیر اکبر آبادی کو اوّلیت کا مقام حاصل ہوا۔ اردو شاعری کے دَورِ جدید میں مولانا محمد حسین آزادؔ اور خواجہ الطاف حسین حالیؔ اور اُن کے ہم عصر شعرا نے اس صنف کی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہوئے جدید نظم نگاری کے روشن مستقبل کی بنیاد ڈالی۔ بیسویں صدی کے نصف اوّل میں بہت سے نظم گو شعرا نے صنفِ نظم نگاری کو استحکام بخشا۔ حالاں کہ کئی معروف نظم نگار شعرا مختلف فکری ونظریاتی رجحانات کے زیرِ اثر رہے۔

شعر و ادب میں عصری و فکری رجحانات و نظریات کا داخل ہونا نامناسب نہیں ہے لیکن کسی خاص تحریک اور نظریے کا دُم چھلاّ بن کر اس کا ڈھنڈورا پیٹنا اچھے شعرا کا شعار نہیں۔ چناں چہ نظم گو شعرا نے کئی ادبی و غیر ادبی تحریکوں سے متاثر ہو کر شاعری میں نت نئے انداز کے تجربات کیے۔ ایسے شعرا کی تخلیقات بہت دنوں تک ادب کا حصہ نہ رہ سکیں لیکن جن شعرا نے نظم نگاری کے فن کو ہیئت و اسلوب کے نئے تجربات کے ساتھ استحکام بخشا اُن میں جوشؔ، فیضؔ، اقبالؔ، اخترؔ الایمان، جمیلؔ مظہری، فراقؔ گورکھ پوری، حفیظؔ جالندھری، روشؔن صدیقی، مخدوؔم محی الدین، ن۔م۔راشدؔ، معین احسن جذبیؔ، میراجی، علی سردار جعفری اور اختر شیرانی کے نام بطورِ خاص لیے جا سکتے ہیں۔

اپنے عہد کے دیگر معروف شعرا کے ساتھ ساتھ مذکورہ شعرا کی روش اور جدید نظم نگاری کی ڈگر پر چلتے ہوئے اختر شیرانی نے اپنی ایک الگ شناخت قائم کی جسے رومانی شاعری سے موسوم کیا گیا۔ اس اکائی میں آپ شاعرِ رومان اختر شیرانی کی معروف و مشہور نظم ''اے عشق! کہیں لے چل'' کا متن کے ساتھ تجزیاتی مطالعہ بھی کریں گے اور اس کی عصری معنویت سے بھی روشناس ہوں گے۔

01.03 اختر شیرانی کے حالاتِ زندگی

اختر شیرانی کا اصل نام محمد داؤد خاں شیرانی تھا۔ اُن کی پیدائش ۴؍مئی ۱۹۰۵ء کو ریاست ٹونک کے ٹونگرہ نامی گاؤں میں ہوئی۔ اختر شیرانی کا خاندان سرحدی پٹھانوں کے مشہور قبیلے شیرانی سے تعلق رکھتا تھا جو شروع میں ڈیرہ اسماعیل خاں سے متصل جنوبی وزیرستان میں آباد تھا۔ اختر شیرانی کے والد حافظ محمود خاں شیرانی اپنے وقت کے صاحبِ طرز ادیب اور ماہرِ لسانیات مانے جاتے ہیں۔ حافظ محمود خاں شیرانی کے والد مولوی محمد اسماعیل خاں شیرانی ریاستِ ٹونک کے ملازم تھے۔ مولوی محمد اسماعیل خاں شیرانی، سید احمد بریلوی کے مشن میں شامل تھے۔ سید احمد بریلوی کی موت کے بعد مولوی محمد اسماعیل کو نوابِ ٹونک نے بناس ندی کے کنارے ایک باغ اور پچاس بیگھے زمین دے کر بسایا تھا۔ اختر شیرانی کا بچپن ٹونک میں گزرا۔ اُن کی پرورش و پرداخت نہایت خوش اُسلوبی سے شہزادوں جیسے حالات میں ہوئی۔

﴿۱﴾ **تعلیم و تربیت:** اختر شیرانی نے ناظرۂ قرآن اور ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ اُن کی ابتدائی زندگی شاہانہ ٹھاٹھ باٹ سے ہوئی۔ لڑکپن کا زیادہ تر حصہ لاہور میں گزرا جہاں اُن کے والد ماجد اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر تھے۔ حافظ محمود شیرانی نے والیِ ریاست ٹونک کے عتاب کی وجہ سے لاہور میں مستقل سکونت اختیار کی۔ اختر شیرانی نے ۱۹۲۱ء میں اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لیا اور منشی فاضل کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ اسی کالج سے ادیب فاضل میں بھی کامیابی حاصل کی اور بعد میں میٹرک کا امتحان بھی پاس کیا۔ انگریزی میں کوئی اعلیٰ ڈگری نہ ہونے کے باوجود اُنہیں انگریزی ادب پر دست رَس حاصل تھی۔ اختر شیرانی کم عمری میں ہی شاعری کی طرف راغب ہوئے۔ وہ شروع سے ہی بے حد عاشق مزاج اور حُسن پرست واقع ہوئے تھے جس کا مکمّل پرتو اُن کی پوری شاعری میں دکھائی دیتا ہے۔ ابتدا میں اختر شیرانی نے صابر علی شاکر سے اور بعد میں علامہ تاجور نجیب آبادی سے اصلاحِ سخن لی۔

اختر شیرانی کو لاہور سے بے انتہا محبت تھی۔ اُن کا گھریلو ماحول نہایت مہذّب اور مذہبی تھا لیکن جب اختر شیرانی نے باہر کی دنیا دیکھی تو آزادانہ روش اختیار کر لی۔ اس آزادانہ روش نے اُنہیں بلانوشی کا غلام بنا دیا۔ اختر شیرانی کی کئی خواتین سے وابستگی رہی۔ سلمیٰ سے محبت میں ناکامی کے بعد کئی بار عشق میں مزید ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا۔ اُن کی رومانی طبیعت اور عاشقانہ مزاج نے اُنہیں رومانی اور جمالیاتی خیال سے وابستہ کر دیا۔ اختر شیرانی کی نظموں میں مذکورہ حالات و کوائف کا نرالا انداز اور وارفتگی کا حسین امتزاج دکھائی دیتا ہے۔

اختر شیرانی کے آٹھ شعری مجموعے اور ایک خطوط کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔شراب نوشی کی زیادتی نے اختر شیرانی کے جسم کو وقت سے پہلے کھوکھلا کر دیا۔وہ صرف ۴۳ر سال کی عمر میں ۹ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو دارِفانی سے کوچ کر گئے۔لاہور میں اُن کے انتقال پر اُن کے قریبی دوست اور مرغ زار کے ایڈیٹر احمد ندیم قاسمی نے تفصیل بتاتے ہوئے لکھا ہے:

> ''۱۹۴۷ء میں جب پاکستان قائم ہوا تو ایک بار اخباروں میں اختر صاحب کے انتقال کی غلط خبر چھپ گئی مگر وہ راجستھان کے شہر ٹونک میں محفوظ تھے پھر وہ لاہور تشریف لائے۔میں نے اُن دنوں رسالہ'' نقوش'' جاری کر رکھا تھا۔اس کے لئے کلام بھی عنایت کیا مگر ستمبر ۱۹۴۸ء میں بے ہوشی کے عالم میں انتقال کر گئے۔اُن کے اہل وعیال لاڑکانہ میں تھے۔اُن کے انتظار میں اختر صاحب کی میت میوا اسپتال کے برف کدے میں منتقل کر دی گئی مگر جس روز اُن کو دفن ہونا تھا اسی دن قائداعظم محمد علی جناح کا انتقال ہو گیا اور سارا ملک لاہور سمیت سناٹے میں آ گیا۔یہی وجہ ہے کہ جب اختر کا جنازہ اُٹھا تو وہاں اُن کے سیکڑوں عقیدت مند موجود نہ تھے۔''

احمد ندیم قاسمی، ''مرغ زار'' لاہور۔بحوالہ فکر و تحقیق جلد ۷ر شمارہ ۴ر ۲۰۰۴ء

﴿۲﴾ **شخصیت**: کسی بھی علمی، ادبی، مذہبی یا سیاسی شخصیت پر اس کے معاشرے اور عصری حالات کا اثر ضرور پڑتا ہے۔اختر شیرانی کا زمانہ قومی اور بین الاقوامی دونوں سطحوں پر اُتھل پتھل کا زمانہ رہا۔ہندوستان میں برطانوی استبداد کے خلاف آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔خلافت تحریک، جلیاں والا باغ کا سانحہ، ترکِ موالات، سول نافرمانی کی تحریک، انڈیا ایکٹ، بھارت چھوڑو تحریک اور بالآخر تقسیمِ ملک کے ساتھ آزادی، ملکی سطح پر فسادات، سماجی نابرابری، سیاسی عدمِ استحکام اور معاشرتی ناہمواریوں جیسے ناگفتہ بہ حالات کا کسی بھی حسّاس ذہن رکھنے والے ادیب و شاعر پر اثر پڑنا لازمی ہے۔یہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر اختر شیرانی نے بچپن میں پہلی جنگِ عظیم اور جوانی میں دوسری جنگِ عظیم کی تباہ کاریوں کا مشاہدہ بھی کیا۔عالمی سطح پر کئی نظریات نے بھی اختر شیرانی کے خیالات و احساسات پر اثرات ڈالے۔ظاہر ہے کہ اِن حالات و واقعات نے اختر شیرانی کی شخصیت کو متاثر کیا ہوگا۔حالاں کہ اختر شیرانی کی شاعری کا زیادہ تر حصہ رومانی کیفیت کا حامل ہے لیکن اُن کی بعض نظمیں بالخصوص آخری ایّام کی نظمیں ملکی و بین الاقوامی واقعات و حالات کی آئینہ دار ہیں۔

اختر شیرانی بے حد سخی اور دریا دل شخصیت کے مالک تھے۔اُن کے پاس مختلف مقامات سے منی آرڈر آتے رہتے تھے۔ہر دوسرے تیسرے دن خود پوسٹ آفس جا کر منی آرڈر وصول کرتے اور راستے میں جو بھی حاجت مند ملتا اسے دے دیتے۔اختر شیرانی کے گھر میں تانگہ اور بگھی دونوں سواریاں تھیں جو گدے اور تکیے سے آراستہ تیں مگر وہ گھر سے یا تو پیدل نکل پڑتے یا کرائے کی بہلی لے لیتے۔اُنہوں نے اُن بہلیوں کا ذکر اپنی نظم ''او دیس کے آنے والے بتا'' میں کیا ہے۔اُن کے قریبی دوستوں کے مطابق اختر شیرانی نجہ خاں کے تانگے کو پسند کرتے تھے۔ہر تانگے والا اِس آس میں رہتا کہ اختر شیرانی میرے تانگے میں بیٹھیں کیوں کہ تانگہ چھوڑنے پر اختر کا سخی ہاتھ جیب میں جاتا اور دریا دِلی سے جو کچھ ہاتھ میں آتا وہ تانگے والے کو دے دیتے۔اختر شیرانی کی دریا دِلی پورے ٹونک میں مشہور تھی۔

اختر شیرانی اپنے اہل وعیال کی کفالت سے بری الذّمہ تھے کیوں کہ اُن کی یہ ذمہ داری اُن کے والدِ ماجد حافظ محمود خاں شیرانی کے سر تھی پھر بھی دریا دِلی کی وجہ سے اُن کا ہاتھ کبھی کبھی تنگ ہو جاتا اور وہ اپنے مخلص احباب سے بے تکلف شراب کی فرمائش کر دیتے۔ اختر شیرانی مَے کشی کے عادی تو تھے لیکن جو شخص اُن کا ہم مشرب نہ ہو خواہ وہ قریبی دوست ہی کیوں نہ ہو اس کا بڑا لحاظ رکھتے اور ایسی شخصیات کے آتے ہی جام و مینا کو ہٹا دیتے۔ کوئی نصیحت کرتا تو گردن نیچی کر لیا کرتے۔ والد کی ناراضی کے سبب کبھی کبھی پینا چھوڑ بھی دیتے۔ جن دنوں شراب نوشی نہیں کرتے اُن دنوں سگریٹ نوشی بے حد بڑھ جاتی۔ اختر شیرانی کی شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے گوپال متّل نے لکھا ہے:

''اختر شیرانی کی شخصیت کا، اُن کی عادتوں کا اور دوستوں سے اُن کے نباہ کا تذکرہ اُن کے بہت سے ہم عصر اُدَبا وشعرا نے کیا ہے۔ بسمل سعیدی کے حوالے سے لاڈلے میاں نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ دہلی کے کوئی مولوی صاحب شاعر تھے۔ اُنہیں اپنا مجموعہ چھپوانے کا خیال آیا تو اس پر پیش لفظ لکھوانے کے لئے اُنہوں نے جوشؔ ملیح آبادی سے رجوع کیا۔ جوشؔ کو شرارت سوجھی اور مولوی صاحب کو یہ مشورہ دیا کہ آپ کا رنگِ سخن اختر شیرانی سے ملتا جلتا ہے لہٰذا آپ اُنہی سے کچھ لکھوائیں۔ مولوی مذکور کو جوشؔ نے یہ تاکید بھی کی کہ ساتھ میں ایک بوتل بھی ضرور لے جائیں پھر وہ لکھنے سے انکار نہیں کریں گے''۔ لاڈلے میاں لکھتے ہیں:

> ''مولوی صاحب لاہور پہنچ گئے۔ اختر صاحب سے اپنا مدعا بیان کیا اور جوشؔ کا حوالہ دیتے ہوئے بوتل پیش کی۔ اختر نے بوتل اور مسودہ لے لیا اور کہا: مولوی اور شاعر؟ خیر جوشؔ نے بھیجا ہے تو میں تمہارا کلام ضرور دیکھوں گا۔ دوسرے روز مولوی صاحب علی الصبح دوسری بوتل لے کر جا دھمکے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ اختر سوتے پڑے ہیں اور مولوی صاحب کی بیاض کچھ کاغذات کے ساتھ تڑی مڑی سرہانے پڑی ہے۔ اپنی کاوش کا یہ حشر دیکھ کر بغیر اختر صاحب کو جگائے، خاموشی سے بیاض مع کاغذات اٹھائی اور سیدھے اسٹیشن کی راہ لی۔ جب ٹرین میں اُن پراگندہ کاغذوں کو پڑھا تو بڑا عالمانہ تبصرہ تھا اُن کے کلام پر۔ مولوی صاحب نے بڑا افسوس کیا کہ میں نے یہ کیا حرکت کی۔ شکریہ بھی ادا نہیں کیا۔ ایک ہی رات میں میرا پورا کلام پڑھ ڈالا اور ایسا عمدہ تبصرہ بھی لکھ دیا۔''

(ثروت خاں: اختر شیرانی۔ کچھ ذاتی حوالے، فکر وتحقیق، جلد ۷، شمارہ ۴، ص ۱۵۳، ۲۰۰۴ء)

اختر شیرانی کی شخصیت افلاطونی عشق اور جنسی محبت سے مزیّن ہے۔ وہ اپنی پوری عمر عورت کو ٹوٹ کر چاہنے کا ثبوت پیش کرتے رہے۔ اُن کی شاعری پر عورت اس قدر سوار ہے کہ اُن کی تمام تر شاعری کو نسوانی حُسن، تحسینِ حُسن اور جوشِ عشق سے تعبیر کیا جا سکتا ہے لیکن اُن کی شخصیت وشاعری دونوں میں تعمیری جمالیات پرستی کا پرتو دیکھا جا سکتا ہے جو ایک فن کار کو، اس کی شخصیت کو اور اس کی شاعری کو زندگی کی رعنائیوں سے مزیّن کر دیتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجئے:۔

﴿۱﴾ اختر شیرانی کا اصل نام کیا تھا؟

﴿۲﴾ اختر شیرانی کے والد کا نام کیا تھا؟

﴿۳﴾ اختر شیرانی کا انتقال کب ہوا؟

01.04 اختر شیرانی کی شاعری

یہ بتایا جا چکا ہے کہ اُدبا وشعرا کی تخلیقات پر اُن کے عہد ومعاشرے اور خاندانی جاہ وحشم کا عکس ضرور ملتا ہے۔ چناں چہ اختر شیرانی کی شاعری میں اُن کی عیش پرستی اور حُسن پرستی کے ادراک کے ساتھ ساتھ اس زمانے کے حالات وواقعات کی عکّاسی بھی ملتی ہے۔ اختر شیرانی کی شاعری کا سفر خارج سے باطن کی طرف ہے۔ بہت حد تک اُن کے یہاں موضوعات میں تنوّع کی جگہ یکسانیت نظر آتی ہے اور کبھی کبھی یہ یکسانیت قاری وسامع کی اُکتاہٹ کا سبب بنتی ہے۔ اختر شیرانی کی شاعری اردو ادب کو کوئی نیا زاویہ نگاہ تو نہ دے سکی لیکن اردو شاعری میں مغرب کے رومانی ادب کی طرح رومانی شاعری کا سبب ضرور بنی۔ اختر شیرانی کی شاعری اقبالؔ کے اس مصرعے کی عکّاسی کرتی ہے۔

ع ....وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

گویا اختر شیرانی کے نزدیک عذرا، سلمیٰ اور ریحانہ کی شکل میں کوئی نہ کوئی وجودِ زَن سایہ فگن رہتا ہے۔ شیرانی کی نظموں میں ''شربتی آنکھیں، کئی دن سے، بستی کی لڑکیوں میں، نالۂ مستانہ، لیلیٰ شب اور اے عشق! کہیں لے چل'، وجودِ زَن کی عکّاسی کرتی ہیں۔

اختر شیرانی نے اپنی شاعری میں معاشرے میں پنپ رہے مختلف شکل کے ناسوروں اور ناہم وَاریوں کا ذکر کیا ہے۔ خواہ وہ ناہم وَاریاں سیاسی سطح کی ہوں یا معاشی۔ اختر شیرانی کسی خاص ادبی، سیاسی تنظیم یا اقتصادی نظام سے وابستہ نہیں رہے۔ شاعری میں وہ اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے تھے۔ اختر شیرانی نے اپنے وطنِ عزیز کے تہذیبی وثقافتی ورثوں کا جا بجا ذکر کیا ہے۔ یہاں کے میلوں ٹھیلوں، پیڑوں، شاخوں، جھولوں، گلیوں، بازاروں، شہروں، دیہاتوں، شاموں، صبحوں اور اُن سے منسلک مختلف طرح کے اعمال وافعال کا خوب خوب ذکر کیا ہے۔ کچھ تہذیبی وتاریخی تلازمے بھی جن کا ہماری تہذیبی تاریخ سے گہرا رشتہ ہے، بار بار اُن کے اشعار اُن کی اہمیت کو دوبالا کرتے ہیں۔ اُن کی ایک طویل نظم ''اُو دیس سے آنے والے بتا'' سے اس کی درجنوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

کیا اب بھی مہکتے مندر سے ناقوس کی آواز آتی ہے
کیا اب بھی مقدس مسجد پر مستانی اذاں تھراتی ہے
اور شام کے رنگیں سایوں پر عظمت کی جھلک چھا جاتی ہے
اُو دیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی وہاں کے پنگھٹ پر پنہاریاں پانی بھرتی ہیں
انگڑائی کا نقشہ بن بن کر سب ماتھے پہ گاگر دھرتی ہیں
اور اپنے گھروں کو جاتے ہوئے ہنستی ہوئی چہلیں کرتی ہیں
اُو دیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی وہاں میلوں میں وہی برسات کا جوبن ہوتا ہے
پھیلے ہوئے بَڑ کی شاخوں میں جھولوں کا نشیمن ہوتا ہے
اُمڈے ہوئے بادل ہوتے ہیں چھایا ہوا ساون ہوتا ہے
اُو دیس سے آنے والے بتا

اختر شیرانی نے متعدّد قومی، ملّی اور اخلاقی نظمیں کہی ہیں جن میں تقسیمِ وطن، حادثات وفسادات، مشرقی تہذیبی وثقافتی رشتوں اور قومی وملّی اُمور کی شکست وریخت کا نقشہ کھینچا ہے نیز افغانی مجاہدوں کے لئے حُبُّ الوطنی اور امن پر مشتمل بھی نظمیں کہی ہیں۔ ''صبحِ بہار، فانی وباقی، علی گڑھ کے طلبا سے، دلیرانِ وطن کے نام اور نعم البدل'' جیسی نظموں کو اس زُمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔

اختر شیرانی نے اپنے گیتوں میں بھی ہندوستانی تہذیب وتمدّن اور اس کے پس منظر کا خوب خوب ذکر کیا ہے۔ مختلف طرح کے مناظر کی تصویرکشی میں اختر شیرانی کو مہارت حاصل ہے۔

اختر شیرانی کی اس خوبی کا ذکر کرتے ہوئے اختر اورینوی نے لکھا ہے:

> ''اختر کی بنائی ہوئی تصویروں میں بھی حرکت اور آواز ہے۔ اختر اُن تصویروں کی رنگینی میں اپنے دل کے خون کے چھینٹے بھی دے دیتا ہے۔ ہمیں اُن تصویروں کے لبوں پر پُر درد مسکراہٹ کھیلتی دکھائی دیتی ہے اور اُن کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی نظر آتی ہے۔ ''شگوفے کے کھلکھلانے'' اور ''چاند کے پیار سے آکر جھانکنے کا منظر'' پیش کرنا ایک تخلیقی فن کاری ہے۔'' (جدید نظم: حاؔلی سے میراجی تک....کوثر مظہری.ص ۲۱۷)

اختر شیرانی کو ایک رومانی نظم نگار کی حیثیت سے تو ہم سبھی جانتے ہیں لیکن عام شعرا کی طرح اُن کے شعری مجموعوں میں غزلوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ غزلوں کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے رباعیاں اور ماہیے بھی کہے ہیں۔ نظموں کے مقابلے میں اُن کی غزلیات خمریات اور سرمستی سے بھرپور ہیں۔ اُن کی غزلوں میں ساقی، مے، مے خانہ، وارفتگی اور اعجازِ مے کا اعتراف برملا ملتا ہے۔ مثلاً:

مے کدے میں اب بھی ذکر آتا ہے مے نوشی کے وقت　　کیا خبر تھی اختؔر اتنا پارسا ہوجائے گا
میں جانتا ہوں چھلکتا ہوا گناہ ہے یہ　　تو اِس گناہ کو بے احتساب پینے دے

﴿۱﴾ اختر شیرانی کی رومانیت: اختر شیرانی سے قبل بھی متعدّد شعرا کے یہاں جابجا رومانیت کا ذکر ملتا ہے لیکن شاید ہی اردو کا کوئی شاعر ہو جس نے رومانیت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہو۔ اختر کے ذہن پر رومان اس قدر سوار تھا کہ انہوں نے ''رومان'' نام کا ایک رسالہ بھی جاری کیا۔ اختر کی رومانیت سے اُن کے بعد کے شعرا کی نسل بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ چناں چہ اس کا اثر اُن کے ہم عصر اور قدرے بعد کے شعرا مثلاً فیض، مجاؔز، مخدوؔم اور جاں نثار اختر وغیرہ نے قبول کیا۔ اختر کے تمام مجموعہ ہائے کلام اُن کے رومانی اور جمالیاتی خیالات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اختر نے حُسن اور اس کی جمالیات کا اس باریکی سے مشاہدہ کیا ہے کہ پورا منظر سامنے آجاتا ہے۔ اختر شیرانی نے عورت کے حُسن کی تعریف خواتین کا نام لے کر بےباکانہ طور پر جس طرح کی ہے اور اپنے جذباتی اظہار کو اشعار کا جامہ پہنایا ہے وہ اُنہی کا طرّۂ امتیاز ہے۔ عورت کے حُسن اور جمالیات کا بیان اختر شیرانی کی کمزوری ہے۔ اختر شیرانی غالباً اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے عام روایت سے ہٹ کر محبوب کو صیغۂ تانیث سے خطاب کیا۔ اختر شیرانی غالباً گوئٹے کے اس قول کا نمونہ اپنے شعر میں پیش کرنا چاہتے ہیں کہ:

> ''محبت اور درد کا جذبہ کائنات کی ہر شے میں پایا جاتا ہے لیکن اس کا جیتا جاگتا نمونہ عورت کی ذات ہے۔''

عورت اور اس کے حُسن و جمال کے چند نمونے اختر شیرانی کی رومانیت پسندی کی گواہی دیتے ہیں مثلاً:

تم چاند سے بڑھ کر روشن ہو ، زہرہ کی قسم، تاروں کی قسم
تم پھول سے بڑھ کر رنگیں ہو ، فطرت کے چمن زاروں کی قسم
تم سب سے حسیں ہو دنیا کی ، دنیا کے نظّاروں کی قسم
دنیا سے بھی نفرت کرتا ہوں ، میں تم سے محبت کرتا ہوں

عذرا کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

دل و دماغ کو سرشار کر دیا تو نے
شباب و عشق کو بیدار کر دیا تو نے
مِری حسین، مِری ناز آفریں عذرا!

عورت کی اہمیت اور معاشرے میں اس کے مقام کو اختر شیرانی یوں پیش کرتے ہیں:

حجاب و عصمت و شرم و حیا کی کان ہے عورت جو دیکھو غور سے ہر مرد کا ایمان ہے عورت
وہ روتی ہے تو ساری کائنات آنسو بہاتی ہے وہ ہنستی ہے تو فطرت مست ہو کر گنگناتی ہے
وہ سوتی ہے تو بزمِ کہکشاں کو نیند آتی ہے وہ اُٹھتی ہے تو کُل خوابیدہ دنیا کو اُٹھاتی ہے
مغنّی کی صدا میں نغمہ بن کر جھلملاتی ہے نقابِ ساز میں آہنگ ہو کر تھرتھراتی ہے
نقوشِ آب و گِل میں اُس کی تصویریں پریشاں ہیں
صنم سازوں کے دل میں اُس کی تفسیریں پریشاں ہیں

﴿۲﴾ اختر شیرانی کے شعری مجموعے: اختر شیرانی کی مکمّل شاعری آٹھ مجموعوں پر مشتمل ہے۔ ''شعرستان'' ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے جب کہ اس کے بعد ''صُبحِ بہار، نغمۂ حرم، طیورِ آوارہ، اختر ستان، شہرود، لالۂ طور اور شہناز'' وغیرہ یکے بعد دیگرے شائع ہوئے۔ آٹھ شعری مجموعوں کے علاوہ خطوط کا ایک مجموعہ بھی اُن کی یادگار ہے۔ اختر شیرانی کی زندگی میں اور انتقال کے بعد بھی اُن کے شعری مجموعے اور کلیات شائع ہوتے رہے۔ ''اختر شیرانی اور اُن کی شاعری'' کے نام سے ایک کتاب م۔ع۔ سلام نے آئینۂ ادب، چوک مینار، انارکلی لاہور سے ۱۹۶۴ء میں شائع کی۔ نیشنل اکیڈمی دہلی نے اپریل ۱۹۶۷ء میں ''کلیاتِ اختر شیرانی'' شائع کی جس کے مرتب گوپال متّل تھے۔ کلاں محل دہلی کے مکتبے ''انوکھا جاسوس'' نے کلیاتِ شیرانی کو ''صبحِ بہار'' کے نام سے شائع کیا۔ پرکاش پنڈت نے ہندی میں اختر شیرانی ''جیون اور سنکلن'' کے نام سے کتاب شائع کی۔ ٹونک دربار ہائی اسکول میں فارسی کے استاد پنڈت رام نواس سنگھل کے بیٹے ہنومان سنگھل نے ''اختر شیرانی فن اور شخصیت'' کے نام سے ایک کتاب ہندی میں شائع کی۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجئے:۔

﴿۴﴾ ''اُو دیس سے آنے والے بتا'' کس شاعر کی نظم ہے؟

﴿۵﴾ رسالہ ''رومان'' کس شاعر نے جاری کیا؟

﴿۶﴾ اختر شیرانی کے پہلے شعری مجموعے کا نام کیا ہے؟

﴿۳﴾ اختر شیرانی کی غزلیں: عام طور سے اختر شیرانی کو رومانی نظموں کے لئے یاد کیا جاتا ہے تاہم ان کے شعری مجموعوں میں غزلوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ شیرانی کی غزلوں کے اشعار میں وہ پختگی نہیں ہے جو معروف غزل گو شعرا کے یہاں پائی جاتی ہے اور جو غزلیہ شاعری کا طُرّہ امتیاز ہے۔ بالخصوص اختر شیرانی کا شعری مجموعہ ''طیورِ آوارہ'' چند رباعیوں اور ماہیوں کو چھوڑ کر غزلوں پر مشتمل ہے۔ اُن کے مجموعۂ کلام ''شہناز اور شہرود'' میں بھی متعدّد غزلیں شامل ہیں۔ اختر شیرانی کی غزلوں میں غزل کے روایتی مضامین عام طور سے دکھائی دیتے ہیں۔ بعض ہم عصر شعرا کی طرح غزلوں اور نظموں کے مضامین و خیالات ایک دوسرے میں در آئے ہیں۔

شیرانی کی غزلیات میں شراب و شباب اور خمریات نمایاں ہیں۔ چند غزلیں تو شراب، اس کے متعلقات اور مختلف کیفیات کے بیان پر ہی مشتمل ہیں مثلاً یہ غزلیں ''مستانہ پیے جا یوں ہی مستانہ پیے جا، عید آئی، آ کہ ساقی عید کا ساماں کریں، پلائے جا پیے جا خوب ساقی، نہ چھیڑ زاہدِ ناداں! شراب پینے دے''۔ اختر شیرانی کی غزلوں کی خصوصیات میں شراب کا ذکر، عالمِ وارفتگی، طلبِ مَے، بے صبریِ جام، اعجازِ مَے کا اعتراف اور مَے نوشی کی مسرّتوں کا جا بجا بیان ملتا ہے۔

مثال کے لئے چند اشعار ملاحظہ کریں:

آج ہی آج کے دَم سے ہے بہارِ ہستی — فکرِ فردا نہ کر اندیشۂ انجام نہ کر
میں جانتا ہوں چھلکتا ہوا گناہ ہے یہ — تو اِس گناہ کو بے احتساب پینے دے
مِرے دماغ کی دنیا کا آفتاب ہے یہ — مِلا کے برف میں یہ آفتاب پینے دے
کچھ اُڑا لو مزا جوانی کا — کیا بھروسہ ہے زندگانی کا
مے کدے میں اب بھی ذکر آتا ہے مَے نوشی کے وقت — کیا خبر تھی اختؔر اتنا پارسا ہوجائے گا

اختر شیرانی کی غزلوں میں مختلف طرح کی کیفیات اور لذّتوں کی تڑپ بھی ہے۔ اُن کی غزلوں میں روحانی وارفتگی کے ساتھ ساتھ جسمانی لگاؤ بھی پایا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اختر شیرانی کی غزلیں عام رَوِش اور شگفتہ و مترنّم فضا سے بھی معمور ہیں۔ حالاں کہ نظموں کے مقابلے غزلوں میں حُسن و عشق، رندی، مَے کشی و مَے پرستی، معاملہ بندی، حُزن و ملال، مظاہرِ فطرت، حیات و کائنات کے مسائل، زندگی کی مختلف پیچیدگیاں اور اس سے پیدا ہونے والی یاس و افسردگی پائی جاتی ہے لیکن اس سے فن مجروح نہیں ہوتا ہے۔ چند اشعار:

شان میں مَے کی زاہد! اب اِس کے سوا میں کیا کہوں — میرے لئے حلال ہے، تیرے لئے حرام ہے
زاہد کو زندگی ہی میں کوثر چکھا دیا — رندوں سے آج یہ بھی کرامات ہوگئی
نہ وہ رنگِ باغِ جہاں رہا، نہ وہ کیفِ عمرِ جواں رہا — نہ وہ ذوقِ بزمِ مغاں رہا، نہ وہ شوقِ عشقِ بتاں رہا
نہ تمہارا حسنِ جواں رہا، نہ ہمارا عشقِ جواں رہا — نہ وہ تم رہے نہ وہ ہم رہے، جو رہا تو غم کا سماں رہا

ثروت خاں نے اختر شیرانی کی کچھ ذاتی یادوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ اُن کی کئی نعتیہ غزلیں بھی تھیں جن کے متعدّد اشعار ٹونک کے بعض لوگوں کو زبانی یاد تھے مثلاً:

بارِ عصیاں سے نہیں اُٹھتا قدم سیدنا — وقتِ امداد ہے، ہوجائے کرم سیدنا

یہی ارمان ہے اور دل کی یہی حسرت ہے — آپ کے قدموں میں نکلے مِرا دَم سیدنا

ناز قسمت پہ تجھے جتنا ہو کم ہے اخترؔ! — ناز بردار ہے جب شاہِ اُمَم سیدنا

اختر شیرانی کو وطن کی دوری بہت گراں گزری۔ٹونک میں منعقد ہونے والے ایک کل ہند طرحی مشاعرے کا انتخاب ''رومان'' میں شائع ہوا تھا جس میں اختر شیرانی کی غزل کے کئی اشعار وطن سے دوری اور حُزن وملال کی عکاسی کرتے ہیں۔

مجھے ذوقِ باغ وچمن نہیں، مجھے شوق مہہ وسمن نہیں — میں کروں تو کیا کروں ہم نشیں کہ نسیمِ صبحِ وطن نہیں

بجھا سا رہتا ہے دل جب سے ہے وطن چھوٹا — وہ سیرِ باغ نہیں، سیرِ ماہ تاب نہیں

﴿۴﴾اختر شیرانی کی نظمیہ شاعری: جیسا کہ آپ جان چکے ہیں کہ اختر شیرانی نے رومان وجمال کو اپنی شاعری کا اہم عنصر قرار دیا ہے۔اُن کی نظم نگاری ہیئت کے لحاظ سے پابند اور روایتی قسم کی ہے۔شیرانی نے اپنی نظموں میں رومان، جمالیات،عورت، جنسیات، مَے ومینا اور مناظرِ فطرت کو خاص طور سے جگہ دی ہے۔

اختر شیرانی کی بیش تر نظمیں جمالیاتی حُسن بیدار کرنے والی ہیں لیکن کچھ اہم اور نمائندہ نظمیں ایسی ہیں جن میں مذکورہ نظریے سے ہٹ کر معاشرتی وابستگی کی طرف رجوع کیا گیا ہے مثلاً ''جہاں ریحانہ رہتی ہے، نالۂ مستانہ، لیلیٰ شب، اُودیس سے آنے والے بتا، اے عشق! کہیں لے چل'' وغیرہ۔بعض جدید اور ترقی پسند شعرا کی طرح اختر شیرانی کو پس ماندہ اور مظلوم طبقات سے ہم دَردی اور اُن کے مسائل کا خیال ہے۔اختر شیرانی نے اپنی کئی نظموں میں سرمایہ دار طبقے کی مخالفت،مظلوم طبقے کی وکالت اور مجاہدین کی حمایت کی ہے۔حالاں کہ اختر کو سماج، تہذیب وتمدّن اور اقدار سے بہت زیادہ سروکار نہیں تھا لیکن اُن کی آخری دَور کی نظموں میں تہذیب وتمدن اور تاریخ سے وابستگی نظر آتی ہے جن میں ملاّحوں، چرواہوں، میلوں ٹھیلوں، دیہات، گلیوں،موسموں، باغوں، پپیہوں اور پرانے کھنڈرات کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔

اختر شیرانی کے جو آٹھ شعری مجموعے شائع ہوئے، ''صُبحِ بہار'' میں اُن تمام مجموعوں کو جمع کردیا گیا ہے لیکن اُن مجموعوں کی الگ شناخت بھی قائم ہے۔اپنی ایک نظم ''اُودیس سے آنے والے بتا'' میں اختر شیرانی نے اس ملک کی تہذیب وتمدن، تاریخ اور رسم ورواج کا بھرپور نقشہ کھینچا ہے۔اسی طرح ''نغمۂ سحر'' میں ایک دیہاتی لڑکی کا اپنے سسرال میں آٹا پیستے ہوئے گیت گانا، میکے کی خوب صورت یادوں کو تازہ کرنا اور خوش گوار موسم میں اس طرح غم زَدہ ہوجانا جیسے پھولوں پر افسردگی چھا گئی ہو۔اختر شیرانی نے نفسیاتی ومعاشرتی دونوں طرح کی منظر نگاری اور کیفیات کو بڑی چابک دستی سے پیش کیا ہے۔اختر شیرانی نے کچھ قومی وملّی، مذہبی واخلاقی،تاریخی وسماجی اور اصلاحی نظموں کے علاوہ کچھ قومی وسیاسی نیز عورتوں اور بچوں کے لئے بھی نظمیں لکھی ہیں۔

یہاں مثال کے طور پر اختر شیرانی کی نظم ''نغمۂ اَمن'' کے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں:

جان جائے کہ رہے ملک کی خاطر ہم دَم! دُشمنِ ملک کو تو بے سر و بے جاں کر دیں
نغمۂ حُبِّ وطن گائیں اِس انداز سے ہم کہ نوا کاریِ زُہرہ کو پریشاں کر دیں
جنگ کا ولولہ پیدا کریں اس صورت سے کہ فسوں سازیِ مرّیخ کو حیراں کر دیں
دُشمنِ ملک کے پرچم کو نگوں سَر کر کے علمِ فتح سرِ چرخ نمایاں کر دیں

مذہبی واخلاقی نظموں کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:۔

الٰہی مجھ کو ایسی نالہ سامانی عطا کردے جو بزمِ دہر میں ہنگامۂ محشر بپا کردے
اگر تیرے سوا بھی مدّعا ہوسکتا ہے کوئی تو میرے دل کو یکسر بے نیازِ مدّعا کردے
سوادِ عالمِ حسرت میں ہوں گمراہ مدت سے مِرے پائے طلب کو اب تو منزل آشنا کردے

اختر شیرانی نے ملکی سیاست اور قومی نظریے پر بھی کئی نظمیں لکھی ہیں مثلاً ''ایک جنگی ترانہ، وطن کے شہیدانِ جنگ، موسمِ بہار، نعم البدل، دلیرانِ وطن کے نام اور آزادی'' وغیرہ۔ یہ نظمیں اختر شیرانی کی دلی آرزو کی نمائندہ نظمیں ہیں اور حُبِّ وطن کے جذبے سے سرشار ہیں۔

نظم ''آزادی'' سے ایک بند ملاحظہ ہو:۔

پکارتی ہے ہمالہ کی رفعت آزاد کہ ہے ستاروں کا ہم سَر مقامِ آزادی
چلی نسیم ، اُٹھی نکہتیں ، اُڑے طائر چمن میں دیکھے کوئی اہتمامِ آزادی
سبق یہ ملتا ہے دریاؤں کی روانی سے جہاں میں کوئی نہ ہو تشنہ کامِ آزادی

غرض یہ کہ اختر شیرانی نظم نگاری کے میدان میں ایک درخشندہ آفتاب ہیں جس کی شعاؤں سے اردو ادب منوّر و تابندہ ہے۔

01.05 نظم ''اے عشق! کہیں لے چل''، متن

اے عشق! کہیں لے چل ، اِس پاپ کی بستی سے
نفرت گہِ عالَم سے ، لعنت گہِ ہستی سے
اِن نفس پرستوں سے ، اِس نفس پرستی سے
دُور اور کہیں لے چل!
اے عشق! کہیں لے چل!

ہم پریم پُجاری ہیں ، تُو پریم کنہیّا ہے
تُو پریم کنہیّا ہے ، یہ پریم کی نیّا ہے
یہ پریم کی نیّا ہے ، تُو اِس کا کھویّا ہے

کچھ فکر نہیں لے چل!
اے عشق! کہیں لے چل!

بے رحم زمانے کو اب چھوڑ رہے ہیں ہم
بے درد عزیزوں سے منہ موڑ رہے ہیں ہم
جو آس کہ تھی وہ بھی اب توڑ رہے ہیں ہم
بس تاب نہیں لے چل!
اے عشق! کہیں لے چل!

یہ جبرکدہ ، آزاد افکار کا دشمن ہے
ارمانوں کا قاتل ہے، اُمّیدوں کا رَہ زَن ہے
احساس کا مقتل ہے، جذبات کا مدفن ہے
چل یاں سے کہیں لے چل!
اے عشق! کہیں لے چل!

آپس میں چَھل اور دھوکے سنسار کی ریتیں ہیں
اِس پاپ کی نگری میں اُجڑی ہوئی پریتیں ہیں
یاں نِیائے کی ہارَیں ہیں ، اَنیائے کی جیتیں ہیں
سکھ چین نہیں لے چل!
اے عشق! کہیں لے چل!

اک مذبحِ جذبات و افکار ہے یہ دنیا
اک مسکنِ اشرار و آزار ہے یہ دنیا
اک مقتلِ احرار و ابرار ہے یہ دنیا
دُور اِس سے کہیں لے چل!
اے عشق! کہیں لے چل!

یہ درد بھری دنیا، بستی ہے گناہوں کی
دل چاک اُمیدوں کی ، سفّاک نگاہوں کی
ظلموں کی ، جفاؤں کی ، آہوں کی ، کراہوں کی
ہیں غم سے حزیں لے چل!
اے عشق! کہیں لے چل!

آنکھوں میں سمائی ہے ، اک خواب نُما دنیا
تاروں کی طرح روشن ، مہتاب نُما دنیا
جنت کی طرح رنگیں ، شاداب نُما دنیا
للہ وہیں لے چل!
اے عشق! کہیں لے چل!

وہ تیر ہو ساگر کی ، رُت چھائی ہو پھاگن کی
پھولوں سے مہکتی ہو ، پُروائی گھنے بَن کی
یا آٹھ پہر جس میں جھڑ بدلی ہو ساون کی
جی بس میں نہیں، لے چل!
اے عشق! کہیں لے چل!

قدرت ہو حمایت پر ، ہم دَرد ہو قسمت بھی
سلمیٰ بھی ہو پہلو میں ، سلمیٰ کی محبت بھی
ہر شَے سے فراغت ہو اور تیری عنایت بھی
اے طفلِ حسیں! لے چل!
اے عشق! کہیں لے چل!

اے عشق! ہمیں لے چل ، اک نور کی وادی میں
ایک خواب کی دنیا میں ، اک طُور کی وادی میں
حوروں کے خیالاتِ مسرور کی وادی میں
تا خلدِ بریں لے چل!
اے عشق! کہیں لے چل!

سنسار کے اُس پار اِک اس طرح کی بستی ہو
جو صدیوں سے انساں کی صورت کو ترستی ہو
اور جس کے نظاروں پر تنہائی برستی ہو
یوں ہو تو وہیں لے چل!
اے عشق! کہیں لے چل!

مغرب کی ہواؤں سے آواز سی آتی ہے
اور ہم کو سمندر کے اُس پار بلاتی ہے
شاید کوئی تنہائی کا دیس بتاتی ہے
چل اُس کے قریں لے چل!
اے عشق! کہیں لے چل!

اک ایسی فضا جس تک غم کی نہ رسائی ہو
دنیا کی ہوا جس میں صدیوں سے نہ آئی ہو
اے عشق ! جہاں تُو ہو اور تیری خدائی ہو
اے عشق! وہیں لے چل!
اے عشق! کہیں لے چل!

اک ایسی جگہ جس میں انسان نہ بستے ہوں
یہ مکر و جفا پیشہ حیوان نہ بستے ہوں
انساں کی قبا میں یہ شیطان نہ بستے ہوں
تو خوف نہیں لے چل!
اے عشق! کہیں لے چل!

برسات کی متوالی گھنگھور گھٹاؤں میں
کہسار کے دامن کی مستانہ ہواؤں میں
یا چاندنی راتوں کی شفاف فضاؤں میں
اے زہرہ! جبیں لے چل!
اے عشق! کہیں لے چل!

اِن چاند ستاروں کے بکھرے ہوئے شہروں میں
اِن نور کی کرنوں کی ٹھہری ہوئی نہروں میں
ٹھہری ہوئی نہروں میں، سوئی ہوئی لہروں میں
اے خضرِ حسیں! لے چل!
اے عشق! کہیں لے چل!

اک ایسی بہشت آئیں وادی میں پہنچ جائیں
جس میں کبھی دنیا کے غم دل کو نہ تڑپائیں
اور جس کی بہاروں میں جینے کے مزے آئیں
لے چل تو وہیں لے چل!
اے عشق! کہیں لے چل!

01.06 نظم ''اے عشق! کہیں لے چل'' تجزیہ

اُردو کی جدید نظم نگاری میں کئی شعرا نے طویل نظمیں لکھی ہیں۔ اُن لکھنے والوں میں اختر شیرانی کا نام بطورِ خاص لیا جا سکتا ہے۔ ''اے عشق! کہیں لے چل'' ہیئت کے لحاظ سے مثلث (مستزاد) کے ۱۸ ربندوں پر مشتمل ہے۔ یہ نظم اختر شیرانی کی رومانی نظموں میں سرِ فہرست ہے لیکن اُن کی عام نظموں کی طرح اس نظم میں صرف گرمیِ عشق، جمالیات کی نرمی اور شدتِ جذبات ہی نہیں ہے بلکہ ایک پُر سکون زندگی گذارنے کی تمنا بھی ہے۔ پوری نظم بے ساختہ جذبات اور دِلی احساسات سے اس قدر لبریز ہے کہ نظم کا ہر ایک لفظ اپنے اندر معنویت کی ایک دنیا سمیٹے ہوئے ہے اور تاثیر کا یہ عالَم ہے کہ قاری و سامع نظم کی قرأت و سماعت کے وقت کسی دوسری دنیا میں کھو جاتا ہے۔ حالاں کہ شاعر نظم کے لحاظ سے جس مقام پر یا جن لوگوں کے ساتھ رہنا اور جیسی زندگی گذارنا چاہتا ہے اس کا وجود صرف خیالی ہے لیکن پھر بھی اس پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔

شاعر اس مکر و فریب کی دنیا، ہوس پرستی کی جگہ اور پاپ کی بستی سے کہیں دُور جانا چاہتا ہے۔ دُور جانے کی وجہ خالص محبت ہے خواہ وہ انسان سے ہو، خدا سے ہو یا خدا کی تخلیق سے۔ شاعر غموں، بے رحم سماج اور ظالم رشتے داروں سے دُور جانا چاہتا ہے کیوں کہ اس کے مطابق یہ سماج آزاد افکار کا دشمن ہے۔ نیک ارمانوں اور اُمیدوں کا قاتل ہے۔ یہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہر لمحہ احساس و جذبات کا قتل ہوتا ہے۔ یہاں بسنے والے آپس میں ایک دوسرے کو دھوکہ دیتے ہیں، بناوٹی محبت کرتے ہیں۔ یہاں ہمیشہ انصاف کا خون ہوتا ہے اور جبر و تشدّد جیت جاتا ہے۔

گویا شاعر کے مطابق یہ دنیا شریفوں کے رہنے کی جگہ نہیں بلکہ ایک مقتل ہے جو شر کرنے والے، دھوکہ دینے والے، آزار پہنچانے والے سفّاک اور ظالموں کی بستی ہے۔ شاعر ایسی دنیا سے کسی دوسری دنیا یا کسی ایسے مقام پر جا کر رہنا چاہتا ہے جہاں مذکورہ ظلم و ستم نہ ہوں بلکہ قدرت کی فراخ دِلی اور اس کے بہترین نقش و نگار سے وہ مقام بھرا پڑا ہو۔ شاعر کی تمنا ایک ایسی وادی کی ہے جس میں پھول مہکتے ہوں، پُروائیاں چلتی ہوں، ساون کی جھڑیاں لگی ہوں۔ ایسے میں قدرت حمایت کرے، قسمت ہم دَرد ہو جائے، اس کا محبوب بھی پہلو میں ہو اور اس کی محبت بھی نصیب ہو۔ گویا شاعر ہر شر اور تکلیف سے، ناانصافی اور جبر و تشدّد سے تنگ آ کر فراغت اور قدرت کی عنایت چاہتا ہے۔ وہ ایسی وادی میں جا کر رہنا چاہتا ہے جہاں خوشی ہو، محبت کی روشنی اور دیوی بھی۔ جہاں کبھی انسانوں نے قدم نہ رکھا ہو اور جس جگہ کے نظاروں پر سکون ہی سکون اور سکوت ہی سکوت چھایا ہوا ہو۔ اس کی تمنا ایسی ہی وادی اور باغ کی ہے جس سے بہشت کی مثال دی جا سکے۔ جس طرح جنت میں دنیاوی غم اور انسان کو دُکھ پہنچانے والا کوئی عمل نہیں ہوتا ہے۔ اسی طرح کی جگہ پہ شاعر جا کر رہنا چاہتا ہے اور اس کی بہاروں میں زندگی کے مزے لوٹنا چاہتا ہے۔

نظم ''اے عشق! کہیں لے چل'' اتنی مترنّم اور غنائیت سے بھرپور ہے کہ پڑھنے والا خود بھی شاعر کے خیال کے ساتھ اسی رومانی وخیالی دنیا کا تصوّر کرنے لگتا ہے جہاں کسی طرح کے آفات وبلیّات اور رنج وغم نہ ہوں بلکہ خوشی ہی خوشی ہو، شر نہیں بلکہ خیر ہی خیر ہو۔نظم میں ایسے سبک اور مترنّم الفاظ استعمال کیے گئے ہیں کہ پوری نظم میں نغمگی کا احساس پایا جاتا ہے۔ہم قافیہ الفاظ کی بھرمار ہے مثلاً بستی، ہستی، ترستی، رسائی، پارسائی، خدائی وغیرہ۔ ہندی اور بھاشا کے ایسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو عام طور سے گاؤں اور قصبوں کے گیتوں میں استعمال کیے جاتے ہیں مثلاً نگاہوں، ہواؤں، گھٹاؤں، فضاؤں، کراہوں، جفاؤں، نہروں، لہروں وغیرہ۔مترنّم الفاظ اور جمالیاتی حِس پیدا کرنے والے الفاظ کے استعمال سے نظم کی معنویت اور اس کی صوتی خصوصیات میں کئی گُنا اضافہ ہوگیا ہے۔یہی نہیں بلکہ مصرعے کے آدھے حصے کو اختر شیرانی نے ٹیپ کے مصرعے کے طور پر استعمال کرکے نظم میں گیت کا آہنگ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ہیئتی، جمالیاتی اور لسانی امتیازات کے لحاظ سے یہ نظم اردو میں شاہ کار کا درجہ رکھتی ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:-

﴿۷﴾ ''طیورِ آوارہ'' کس شاعر کا شعری مجموعہ ہے؟

﴿۸﴾ ''احساسات'' کا واحد کیا ہے؟

﴿۹﴾ ''خوشی'' کا متضاد لفظ کیا ہے؟

01.07 خلاصہ

اس اکائی میں آپ نے اردو نظمیہ شاعری کے منفرد شاعر اختر شیرانی کی حیات اور اُن کی شاعرانہ خصوصیات کے ساتھ ساتھ اُن کی ایک معروف نظم ''اے عشق! کہیں لے چل'' کا مطالعہ کیا۔اختر شیرانی اپنی رومانی نظموں کے لئے معروف ہیں۔اختر شیرانی کی شاعری پر اُن کے عصری حالات اور ہم عصر شعرا کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں لیکن وہ کسی تحریک یا نظریے کے دُم چھلّے نہیں بنے بلکہ انہوں نے اپنی الگ شناخت قائم کی۔ چناں چہ جدید نظم نگاری میں اختر شیرانی کو اہم مقام حاصل ہے۔اختر شیرانی کا تعلق پٹھانوں کے مشہور قبیلے شیرانی سے تھا۔ اُن کے والدِ ماجد حافظ محمود شیرانی ایک جید عالم اور معروف ماہرِ لسانیات تھے۔اختر شیرانی کی پیدائش ۴؍ مئی ۱۹۰۵ء میں ریاستِ ٹونک میں ہوئی۔اُن کا بچپن ٹونک میں گذرا۔اختر شیرانی نے اورینٹل کالج لاہور سے میٹرک، منشی فاضل اور ادیب فاضل کی تعلیم حاصل کی۔ اُنہیں انگریزی زبان پر دست رَس حاصل تھی۔اُن کا گھریلو ماحول بے حد مذہبی تھا لیکن اختر شیرانی کا مزاج حُسن پرستانہ تھا۔اختر شیرانی کو جوانی میں مَے نوشی کی عادت پڑ گئی جس کا برا اثر اُن کی صحت پر پڑا اور وہ صرف ۴۳ رسال کی عمر میں ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کو انتقال کر گئے۔

اختر شیرانی بے حد حسّاس اور سخی طبیعت واقع ہوئے تھے۔اُن کی سخاوت کا چرچا ٹونک میں اب بھی کیا جاتا ہے۔اختر شیرانی کی شاعری میں رومانیت کے ساتھ ساتھ عیش پرستی اور حُسن کا ادراک شعوری طور پر ملتا ہے۔اُن کی شاعری کے موضوعات میں زیادہ تنوّع نہیں ہے۔اُنہیں ''وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ'' کا خوب خوب احساس تھا۔اُنہوں نے عورت، جنسیات، غربت و افلاس، آزادی، وطن سے محبت، ہندوستان کی تہذیب وثقافت کی عکّاسی اور خمریات وسرمستی کو اپنی شاعری میں بہتر ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ اختر شیرانی نے نظموں کے علاوہ نعتیں اور غزلیں بھی کہیں ہیں۔اُن کی غزلوں اور نظموں کے موضوعات میں بہت زیادہ تنوّع نہیں پایا جاتا ہے۔اُن کی شاعری کے آخری دَور میں اسلامی تہذیب وثقافت اور مسلمانوں کی گذشتہ عظمت کی عکّاسی ملتی ہے۔

آپ نے اس اکائی میں اُن کی مشہور نظم ''اے عشق! کہیں لے چل'' کا خصوصی مطالعہ کیا جس میں شاعر اِس کھوکھلی دنیا سے (جس میں جبر و تشدّد، ظلم و ستم، بے ایمانی، دھوکہ اور رنج و غم ہے) کسی اور خیالی دنیا میں جانے کی تمنا کرتا ہے۔ جہاں مکر و فریب نہ ہو، جور و ستم نہ ہو، خیر ہی خیر ہو، محبت ہی محبت ہو اور اُس کے مناظر جنت نشاں ہوں۔

01.08 فرہنگ

ادراک	:	سمجھ، بوجھ	کہسار	:	چھوٹی پہاڑیاں
دست رَس	:	پہنچ، قدرت	مثلّث	:	تین، تین مصرعوں والی
رسائی	:	پہنچ	مدفن	:	دفن کرنے کی جگہ، قبرستان
شناخت	:	پہچان	مسکن	:	ٹھہرنے کی جگہ
قبا	:	لباس، پوشاک	مہتاب	:	چاند
قرأت	:	پڑھنا	نیّا	:	ناؤ، کشتی

01.09 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر ۱ : اختر شیرانی کی غزل گوئی پر مختصر نوٹ لکھیے۔

سوال نمبر ۲ : اختر شیرانی کی نظم نگاری کے بارے میں اختصار سے لکھیے۔

سوال نمبر ۳ : اختر شیرانی کی رومانی نظموں کی انفرادیت مختصراً بیان کیجیے۔

تفصیلی سوالات

سوال نمبر ۴ : اختر شیرانی کے حالاتِ زندگی تفصیل سے بیان کیجیے۔

سوال نمبر ۵ : :اختر شیرانی کی غزل گوئی پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

سوال نمبر ۶ : اختر شیرانی کی نظم نگاری کے بارے میں تفصیل سے لکھیے۔

01.10 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو میں نظمِ معرا اور آزاد نظم ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک — از — حنیف کیفی

۲۔ جدید نظم: حالؔی سے میرا جی تک — از — کوثر مظہری

۳۔ مکتوباتِ اختر شیرانی — از — ڈاکٹر یوسف حسنی

اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ اختر شیرانی کا اصل نام ''محمد داؤد خاں شیرانی'' تھا۔

﴿۲﴾ اختر شیرانی کے والد کا نام ''حافظ محمود خاں شیرانی'' تھا۔

﴿۳﴾ اختر شیرانی کا انتقال ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء میں ہوا۔

﴿۴﴾ ''اُودیس سے آنے والے بتا'' اختر شیرانی کی نظم ہے۔

﴿۵﴾ رسالہ ''رومان'' اختر شیرانی نے جاری کیا۔

﴿۶﴾ اختر شیرانی کے پہلے شعری مجموعے کا نام ''شعرستان'' ہے۔

﴿۷﴾ ''طیورِآوارہ'' اختر شیرانی کا شعری مجموعہ ہے۔

﴿۸﴾ ''احساسات'' کا واحد ''احساس'' ہے۔

﴿۹﴾ ''خوشی'' کا متضاد لفظ ''غم'' ہے۔

اکائی 02 : مخدوم محی الدین ''چاندتاروں کا بن، چارہ گر''

ساخت :

02.01 : اغراض ومقاصد
02.02 : تمہید
02.03 : مخدوم محی الدین کے حالاتِ زندگی
02.04 : مخدوم محی الدین کی شاعری
02.05 : نظم ''چاندتاروں کا بن'' متن
02.06 : نظم ''چاندتاروں کا بن'' کا تجزیہ
02.07 : نظم ''چارہ گر'' متن
02.08 : نظم ''چارہ گر'' کا تجزیہ
02.09 : خلاصہ
02.10 : فرہنگ
02.11 : سوالات
02.12 : حوالہ جاتی کتب

02.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ مخدوم محی الدین کے حالاتِ زندگی سے واقف ہوسکیں گے۔اُن کے عہد کی مختلف ادبی تحریکات اور رجحانات کے متعلق معلومات حاصل کرسکیں گے۔اُن کی علمی وادبی خدمات کا جائزہ لےسکیں گے۔اُن کی شاعری کی امتیازی خصوصیات کا مطالعہ کرسکیں گے۔اُن کی نظم نگاری پر خصوصی طور پر گفتگو کی جائے گی۔اُن کی دونظموں ''چاندتاروں کا بن اور چارہ گر'' کی خصوصیات اور فنی امتیازات پر بحث کرسکیں گے۔آخر میں اکائی کا خلاصہ،فرہنگ،سوالات اور حوالہ جاتی کتب کی فہرست دی جائے گی۔

02.02 تمہید

۱۸۵۷ء کے بعد اردو نظم ونثر دونوں میں فکری وہیئتی سطح پر نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔اردو شاعری میں شعرا اس وقت تک گل و بلبل، شیریں وفرہاد، عاشق ومعشوق سے اگر آگے نکلتے تھے تو صوفیانہ اور منطقی اشعار کہتے تھے۔نثری سطح پر اب تک اُدبا داستانوی عہد میں جی رہے تھے اور خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔۱۸۵۷ء کے انقلاب نے نثری وشعری ادب دونوں کو متاثر کیا۔بیسویں صدی کے آغاز میں یہ تبدیلی روزِ روشن کی طرح عام قاری کے سامنے نمودار ہوگئی۔

اس صدی کے رُبع اوّل میں عالمی سطح پر پہلی جنگِ عظیم اور ملکی سطح پر جد وجہدِ آزادی نے اُدبا وشعرا کو نئی سمت میں سوچنے پر مجبور کیا۔ ۱۹۵۰ء تک کئی ادبی تحریکیں وجود میں آچکی تھیں۔ اِن تحریکوں نے نثری صنف میں ناول اور افسانے کو اور شعری اصناف میں نظم کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ نظم میں نہ صرف فکری سطح پر تبدیلی آئی بلکہ نظم کی ہیئت میں بھی نمایاں تبدیلی دیکھنے کو ملی اور جس جدید نظم کی بنیاد مولانا محمد حسین آزادؔ، الطاف حسین حالیؔ اور اسماعیلؔ میرٹھی وغیرہ نے ڈالی تھی اسے اقبالؔ، جوشؔ، فراقؔ، فیضؔ، حفیظؔ جالندھری، اخترؔ شیرانی اور اختر الایمان وغیرہ نے آگے بڑھایا۔ مخدومؔ محی الدین اسی زمرے کے نمائندہ ترقی پسند شعرا میں سے ایک ہیں۔ جدید نظم نگاری میں اُن کا مقام کافی بلند ہے۔ مخدومؔ نے فکری سطح پر نظمِ جدید کو کئی معروف نظمیں عطا کیں۔ اس اکائی میں ہم اُن کی دو مشہور نظموں ’’چاندتاروں کا بن‘ اور ’چارہ گر‘ کے مطالعے کے علاوہ اُن کے حالاتِ زندگی اور کارناموں کی بھی جان کاری حاصل کریں گے۔

02.03 مخدومؔ محی الدین کے حالاتِ زندگی

مخدومؔ محی الدین کا پورا نام ابوسعید محمد مخدومؔ محی الدین خدری تھا۔ وہ ریاستِ حیدرآباد کے ضلع میدک کے اندول قصبہ میں ۴ر فروری ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ مخدومؔ کی والدہ کے مطابق اُن کی پیدائش کے سال موسیٰ ندی میں بہت بھیانک سیلاب آیا تھا۔ گویا سیلاب ستمبر ۱۹۰۸ء میں آیا تھا۔ اس وقت مخدومؔ کی عمر کم وبیش آٹھ مہینے کی ہوگی۔ مخدومؔ کے آبا واجداد شہنشاہ اورنگ زیب کی فوج کے ساتھ اعظم گڑھ سے نقل مکانی کر کے حیدرآباد آ گئے تھے۔ اُن کے بزرگوں میں رشید الدین نے حیدرآباد میں سکونت اختیار کی۔ مخدومؔ کے پردادا مخدومؔ الدین حیدرآباد کی مکہ مسجد میں معروف قاری تھے۔ مخدومؔ کے نانا سید ظفر علی ۱۸۵۷ء کی جنگ کے دوران دِلّی سے نقل مکانی کر کے دکن آئے اور ضلع میدک میں سکونت اختیار کی۔

مخدومؔ کی عمر ابھی چار برس کی رہی ہوگی کہ اُن کے والد کا انتقال ہوگیا۔ وہ اندول میں تحصیل کے اہل کار تھے۔ مخدومؔ کی پرورش اُن کے چچا بشیر الدین نے کی۔ چچا نے مخدومؔ سے یہ بات مخفی رکھی کہ اُن کی ماں نے دوسری شادی کر لی ہے۔ مخدومؔ کو اپنی ماں کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ جب مخدومؔ حیدرآباد آئے تو اُنھیں ماں کے زندہ ہونے اور اپنی ایک بہن کا بھی پتہ چلا۔ مخدومؔ والدہ کو گھر لے آئے اور وہیں والدہ کا انتقال ہوا۔ مخدومؔ کے چچا بشیر الدین نہایت نیک اور دین دار انسان تھے۔ چناں چہ اُن کی ابتدائی تعلیم وتربیت مذہبی ماحول میں ہوئی۔

﴿۱﴾ **تعلیم وتربیت:** مخدومؔ محی الدین نے اپنی ابتدائی تعلیم اندول کے اسکول اور دھرم ونت اسکول حیدرآباد سے پوری کی۔ اس کے بعد ۱۹۲۹ء میں اُنھوں نے سنگاریڈی ہائی اسکول سے میٹرک اور اسی سال چیلا پور کے شبینہ اسکول سے منشی کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ مخدومؔ نے اپنے چچا کی خواہش کے برعکس عثمانیہ یونی ورسٹی کے انٹرمیڈیٹ کالج میں داخلہ لیا۔ حاضری کی کمی کی وجہ سے ایک سال نقصان کر کے ۱۹۳۶ء میں انٹرمیڈیٹ کی تکمیل کی۔ مخدومؔ نے عثمانیہ یونی ورسٹی سے بی۔اے اور ایم۔اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اپنی مالی مشکلات کو دور کرنے کے لئے اُنھوں نے دفترِ دیوانی میں Third-grade کلرک کی حیثیت سے پیشہ وَرانہ زندگی کی شروعات کی۔

﴿۲﴾ **ملازمت:** طالبِ علمی کے زمانے میں اپنے رشتے داروں پر تعلیمی اخراجات نہ ڈالتے ہوئے مخدومؔ نے ٹیوشن پڑھایا، اخبار بیچے اور مشہور اداکاروں کی تصویریں بیچ کر اپنا گزارا کیا۔ مخدومؔ عام طور سے رات مسجد میں گذارتے تھے۔ ایم۔اے کرنے کے بعد کلرک کی نوکری کی۔ مخدومؔ کی تعلیمی لیاقت جب رنگ لائی تو ۱۹۳۹ء میں مخدومؔ کا تقرر سٹی کالج میں بحیثیتِ استاد ہوگیا۔

۱۹۴۰ء میں مخدوم کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ ۱۹۴۱ء میں سٹی کالج سے استعفیٰ دے دیا۔ ۱۹۴۳ء میں مخدوم محی الدین کی رہ نمائی میں انجمن ترقی پسند تحریک کی تشکیل ہوئی۔ چوں کہ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء تک کا عہد ریاستِ حیدرآباد کے لئے اُتھل پتھل کا دور تھا۔ مخدوم نے اپنے آپ کو انقلابی اورٹریڈ یونین کی سرگرمیوں کے لئے وقف کردیا۔ اُن دنوں راج بہادر گوڑ، کے ایل مہندرا، حیدر حسین، جواد رضوی اور غلام حیدر وغیرہ اُن کے ساتھ تھے۔ حیدرآباد میں ٹریڈ یونین کے قیام اور اس کی سرگرمیوں کی وجہ سے مخدوم کو گرفتار کرنے کا حکم دیا گیا۔ ملک کے پہلے عام انتخاب ۱۹۵۲ء میں مخدوم کو شکست ہوئی۔ ۱۹۵۶ء میں وہ قانون ساز کونسل کے امیدوار بنائے اور چنے گئے۔ بعد ازاں آندھرا پردیش مجلسِ قانون ساز میں حزبِ اختلاف کے لیڈر منتخب ہوئے۔ مخدوم نے چین، سویت یونین، مشرقی یورپ اور کئی افریقی ملکوں کا دورہ کیا۔ اس دوران تاشقند، سمرقند اور بخارا بھی گئے۔

﴿۳﴾ **مخدوم کی شخصیت اور کارنامے:** مخدوم محی الدین کالج کے زمانے سے ہی ترقی پسند اور انقلابی سرگرمیوں میں شامل رہے۔ اُنہی سرگرمیوں کی وجہ سے سٹی کالج سے استعفیٰ دینا پڑا۔ اُنہوں نے حیدرآباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین قائم کی۔ مخدوم محی الدین کے حلقے میں نوجوان ادیبوں کا ایک بڑا گروہ شامل ہوا جن میں سے کچھ خالص ادیب تھے اور کچھ مخدوم کی طرح ادیب اور انقلابی۔ مخدوم محی الدین کے سروجنی نائیڈو سے گہرے مراسم تھے۔ جن ادیبوں نے مخدوم کے کامریڈ ایسوسیشن میں شمولیت اختیار کی اُن میں سبطِ حسن، اختر حسین رائے پوری، جے وی نرسنگ راؤ، عالم خندمیری، مانک لال گپتا، اونکار پرساد، جواد رضوی اور سروجنی نائیڈو کے فرزند سوریہ بطورِ خاص شامل تھے۔ تلنگانہ کی بغاوت میں مخدوم ایک انقلابی ہیرو کی طرح اُبھر کر سامنے آئے۔

گرفتاری کے خطرے سے بچنے کے لئے اُنہیں کئی مہینوں تک رُوپوش ہونا پڑا پھر بھی ۱۹۵۱ء میں مخدوم اپنے کئی ساتھیوں کے ساتھ گرفتار کیے گئے۔ جنوری ۱۹۵۲ء میں اُنہیں رہائی ملی اور انتخاب میں حصہ لیا۔ انتخاب میں شکست کے بعد ضمنی انتخاب میں وہ مجلسِ قانون ساز کے لئے منتخب کیے گئے۔ ۱۹۵۳ء میں اُنہیں عالمی ٹریڈ یونین فیڈریشن میں وِیانا بھیجا گیا۔ وِیانا میں اُنہوں نے معروف سماجی و سیاسی رہ نماؤں، ادیبوں اور اسکالروں سے ملاقات کی۔ ۱۹۵۴ء میں آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کلکتہ میں ہونے والے اجلاس میں شرکت کرنے کے لئے ہندوستان واپس آئے جہاں اُنہیں کل ہند ٹریڈ یونین کا سکریٹری منتخب کیا گیا۔ مخدوم محی الدین پوری زندگی کمزور طبقات کے حقوق کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔ وہ اپنے انتقال تک کمیونسٹ ارکانِ اسمبلی کے قائد اور حزبِ اختلاف کے لیڈر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ دہلی میں ۲۴/اگست ۱۹۶۹ء کو اچانک اُن کی طبیعت خراب ہوئی۔ ۲۵/اگست ۱۹۶۹ء کو مخدوم محی الدین کا انتقال ہوا۔ اُن کی میّت دہلی سے حیدرآباد لائی گئی اور وہیں ۲۶/اگست کو اُن کی تدفین عمل میں آئی۔

02.04 مخدوم محی الدین کی شاعری

آپ جان چکے ہیں کہ مخدوم کالج کے زمانے سے ہی شاعری کرنے لگے تھے۔ حالاں کہ اُن کی شاعری کا آغاز اُن کی نظم ''پیلا دوشالہ'' سے ہوتا ہے۔ یہ نظم مخدوم نے کھیل کھیل میں ہی لکھی تھی۔ مخدوم محی الدین ترقی پسند تحریک کے نظم نگار شعرا کی پہلی صف کے شاعر مانے جاتے ہیں۔ اُن کا پہلا شعری مجموعہ جو ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا تھا، جس نے جدید نظم نگاری میں دھوم مچادی تھی۔ یہ مجموعہ جس کا نام ''سرخ سویرا'' تھا صرف نظموں کا مجموعہ تھا۔ ابتدا میں مخدوم کی شاعری پر رومانی اور انقلابی اثرات نمایاں رہے۔

اس زمانے میں ترقی پسند اور جدید نظم گو شعرا کے یہاں رومان کی چاشنی عام طور سے دکھائی دیتی ہے۔اختر شیرانی جیسے شاعر نے تو تقریباً پوری عمر رومانیت کو ہی اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔ظاہر ہے کہ اس کا اثر اُن کے ہم عصروں پر تو نظر آنا ہی تھا۔عمر و تجربات کے بالیدہ ہونے پر مخدوم کا شعور بھی بالیدہ نظر آنے لگتا ہے لیکن آخری دَم تک اُن کے شعری اُسلوب میں شیرینی اور گھلاوٹ پیدا نہیں ہو سکی۔مخدوم کی متعدد نظموں میں ترقی پسند تحریک کے انقلابی خیالات کی عکاسی ملتی ہے لیکن کھوکھلی نعرے بازی اور سستی اشتہار بازی نہیں۔مخدوم کی بعض نظموں میں مشرقی محبت کی پاکیزگی اور غنائیت کی آمیزش نے اثر آفرینی کی شدّت پیدا کر دی ہے۔

خلیل الرّحمٰن اعظمی نے اُن کی نظموں پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مخدوم کے مزاج میں غنائیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس نے عملی زندگی میں انقلابی سپاہی ہوتے ہوئے اپنی نظموں کو واعظانہ انداز اور خشکی و کرختگی سے بچا لیا۔''

(جدید نظم۔حالؔی سے میرا جی تک ص/۲۶۶)

مخدوم محی الدین کی غنائی نظموں میں ''وہ جوانی، ٹوٹے ہوئے تارے، آسمانی لوریاں، پچھلے پہر چاند سے، یاد ہے، زلفِ چلیپا اور چارہ گر'' میں تو اس قدر غنائیت ہے کہ اسے فلم میں شامل کیا گیا۔مخدوم کی رومانی شاعری میں جوشِ محبت کے ساتھ ساتھ واقعات کے پس منظر کی تصویر کشی بھی ہے۔کرداروں کی داخلی و خارجی کش مکش بھی ہے اور تبسّم کی مٹھاس، موسیقی کی تانیں اور بدن کو جلانے والی آگ بھی۔

مخدوم اپنی آخری دَور کی رومانی نظموں میں افسردگی کا شکار ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔اُنہیں روحانی اکیلے پن کی شکایت، ایک دوسرے کو نہ سمجھ پانے کا گلہ اور محبت کی شدّت کا احساس ہے۔اس کی مثال اُن کی نظم ''فریاد اور لختِ جگر'' سے دی جا سکتی ہے۔وہ شاعر جو اپنی ابتدائی رومانی نظموں میں اعتماد و وفا اور یقینِ محبت کی ترجمانی کرتا ہے اب وہ استفہامیہ لب و لہجے میں شکوک وشبہات کا اظہار کرنے لگتا ہے۔وہ اپنے مسائل کو رجائی انداز میں سلجھانا چاہتا ہے۔اس کی فکر میں اب اضطراب و بے چینی ہے۔تاہم اس اضطراب و بے چینی میں بھی ضبط کا دامن نہیں چھوڑتا۔مخدوم نے اپنی شاعری میں سماجی و انقلابی فکر کو بھی خاطر خواہ جگہ دی ہے۔دوسری عالمی جنگ، حبشہ کی عوامی جدّ و جہد، فسطائیت کے ہاتھوں تباہی و بربادی، انقلابِ روس، محنت کشوں اور مزدوروں کی آرزو نے اُنہیں عالم گیر انسانیت کا علم بردار بنا دیا۔مخدوم کی نظمیں ''دھواں، اندھیرا، جنگِ آزادی، جنگ اور سپاہی'' وغیرہ اُن کے مذکورہ خیالات واحساسات کی ترجمانی کرتی ہیں۔

(۱) مخدوم کے شعری مجموعے: آپ یہ جان چکے ہیں کہ مخدوم محی الدین نے اپنی پہلی نظم ''پیلا دوشالہ'' کے عنوان سے لکھی تھی۔ مخدوم کا پہلا شعری مجموعہ ۱۹۴۴ء میں ''سرخ سویرا'' کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔اس مجموعے کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں کوئی غزل شامل نہیں تھی۔''سرخ سویرا'' کی نظموں پر رومانی اثر بھی ہے اور انقلاب کا عکس بھی۔''تلنگن، انتظار، ساگر کے کنارے، لمحۂ رخصت، جوانی، وہ، آتش کدہ، پشیمانی، ٹوٹے ہوئے تارے، برسات اور پچھلے پہر چاند سے'' وغیرہ سرخ سویرا کی معروف نظمیں ہیں۔مخدوم کا دوسرا مجموعہ ''گلِ تر'' کے نام سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔گلِ تر میں مخدوم کی ذہنی پختگی، دانش وَری، تخلیق کائنات اور زندگی کے رموز وحقائق کا عکس جا بجا ملنے لگتا ہے۔اسی مجموعے میں مخدوم کی محبت ہمہ گیر و عالم گیر بن کر سامنے آتی ہے۔مخدوم کی نظم ''چارہ گر'' جس کا مطالعہ آپ اس اکائی میں کریں گے، اسی مجموعے میں شامل ہے۔''گلِ تر'' میں ۱۶/غزلیں بھی شامل ہیں۔اس مجموعے کی معروف نظموں میں ''چارہ گر، آج کی رات نہ جا، رقص، احساس کی رات، سناٹا، جانِ غزل اور خواہشیں'' کے علاوہ مخدوم کی ترجمہ کی ہوئی دو نظمیں ''فاصلے اور ہم دونوں'' کافی اہم ہیں۔

مخدومؔ کا تیسرا مجموعہ ۱۹۶۶ء میں ''بساطِ رقص'' کے نام سے شائع ہوا۔اس کے پہلے ایڈیشن میں کوئی غزل شامل نہیں ہے جب کہ مخدومؔ کے انتقال کے بعد جب اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا تو اس میں دو غزلیں بھی شامل تھیں۔اس مجموعے میں شامل نظم ''بساطِ رقص'' سویت یونین کے خلاباز یوری گیگرین کے خلائی سفر سے متاثر ہوکر لکھی گئی ہے۔اس مجموعے میں مخدومؔ کا شعور بالیدہ اور راسخ ہو گیا ہے۔ ''بساطِ رقص'' کی آخری دو نظموں ''واسوخت اور رُت'' مایوسی کے لہجے میں ڈوبی ہوئی نظمیں ہیں۔ان مجموعوں کے علاوہ مخدومؔ کے کلام کے انتخابات مختلف مقامات سے شائع ہوتے رہے۔اُن کا کلام ادارۂ ادبیات حیدرآباد نے انتخابِ کلامِ مخدومؔ کے نام سے ۱۹۳۹ء میں شائع کیا۔ انجمن ترقّی اردو ہند،علی گڑھ نے ۱۹۵۲ء میں انتخابِ کلامِ مخدومؔ شائع کیا۔''مخدومؔ اور کلامِ مخدومؔ'' کے نام سے کتب پرنٹرس و پبلشرز کراچی نے ۱۹۷۲ء میں شائع کیا۔ان کے علاوہ جشنِ مخدومؔ کمیٹی حیدرآباد نے اُن کے مجموعوں کی نظموں اور کچھ نئی نظموں کو ایک ساتھ شائع کیا ہے۔

﴿۲﴾ مخدومؔ محی الدین کی رومانیت: یہ بتایا جا چکا ہے کہ متعدّد ترقی پسند شعرا اور جدید نظم گو شعرا رومان و جمال سے بہت حد تک متاثر تھے۔اس سے قبل آپ نے شاعرِ رومان اختر شیرانی کا مطالعہ کیا ہے۔مخدومؔ اُن کے ہم عصر شاعر ہیں۔لہٰذا ترقی پسند تحریک سے جڑے ہونے اور انقلاب کے تصوّر کی پاس داری کرنے کے باوجود مخدومؔ بھی بہت حد تک رومانیت اور جمالیات سے متاثر نظر آتے ہیں۔مخدومؔ کے تینوں شعری مجموعوں سے ایسی متعدّد نظموں کا انتخاب کیا جا سکتا ہے جو رومانیت سے لبریز ہیں۔مخدومؔ نے اختر شیرانی کی طرح عورتوں کی حیا اور خلوص و پاس داری کو معاشرے کی اعلیٰ تہذیبی اقدار کا درجہ دِیا ہے۔

مخدومؔ کی ایک معروف نظم ''تلنگن'' اُن کے اِس نظریے کی تصدیق کرتی ہے:

پھرنے والی کھیت کی مینڈوں پہ بل کھاتی ہوئی
نرم و شیریں قہقہوں کے پھول برساتی ہوئی
کنگنوں سے کھیلتی اوروں سے شرماتی ہوئی
دخترِ پاکیزگی، نا آشنائے سیم وزَر
دشت کی خودرَو کلی، تہذیبِ نَو سے بے خبر
تیری خس کی جھونپڑی پر جھک پڑے سب بام ودَر
اجنبی کو دیکھ کر خاموش مت ہو، گائے جا
ہاں تلنگن گائے جا، بانکی تلنگن گائے جا

مخدومؔ کی نظموں میں فیضؔ، ساحرؔ اور مجازؔ وغیرہ کی نظموں کی طرح رنگِ تغزّل بھی دیکھا جا سکتا ہے مثلاً:

وہ خَمِ گردن، وہ دستِ ناز، وہ اُن کا سلام
ابرؤوں کا وہ تکلم، وہ نگاہوں کا پیام
بولتی آنکھوں کا رَس، گل رنگ عارض کا جمال
مسکراتا سا تصور، گنگناتا سا خیال

مخدومؔ کے یہاں پاک جذبوں کا احترام خیالی نہیں بلکہ ارضی ہے۔ اسے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مخدومؔ کا محبوب جنسی رغبت سے پاک اور فطری تقاضے سے مطابقت رکھتا ہے۔ اُن کی رومانیت میں بے اعتدالی نہیں بلکہ صبر وتحمل اور ضبط ہے۔ اس کی مثال ''لمحۂ رخصت اور آتش کدہ'' نظم سے دی جا سکتی ہے۔ مخدومؔ کی رومانی نظموں میں ''چارہ گر'' بھی ہے اور آج کی رات نہ جا'' بھی۔ ''آج کی رات نہ جا'' سے ایک بند ملاحظہ ہو:

زندگی لطف بھی ہے، زندگی آزار بھی ہے
ساز و آہنگ بھی، زنجیر کی جھنکار بھی ہے
زندگی دید بھی ہے، حسرتِ دیدار بھی ہے
زہر بھی، آبِ حیاتِ لب و رخسار بھی ہے
آج کی رات نہ جا

مخدومؔ کی رومانی نظموں میں ''احساس کی رات، سناٹا، جانِ غزل، خواہشیں اور وصال'' وغیرہ درد محبت سے بھرپور ہیں۔ نظم ''احساس کی رات'' میں شاعر کو محبت سے محروم ہوجانے کا ڈر ستاتا ہے۔ زمانے کے خوف، ہوس کی یلغار، زیست کی کش مکش سے محبوب کی پیشانی کا رنگ پھیکا پڑ جانے اور جبیں کا رنگ اُڑ جانے کا خوف ہے۔ اسی خوف نے اس نظم کی فضا کو افسردہ کر دیا ہے:

میرے دل! اور دھڑک
شاخِ گل!
اور مہک اور مہک اور مہک

اور پھر یہ احساس کہ:

مجھے ڈر ہے کہ کہیں سرد نہ ہوجائے یہ احساس کی رات

مخدومؔ پر تشکیک اور افسردگی کا غلام ہوجانے کا الزام بھی عائد کیا گیا کہ وہ اپنی آخری دَور کی رومانی نظموں میں روحانی اکیلے پن کے خوف سے دوچار نظر آتے ہیں۔ اُنہیں ایک دوسرے کو نہ سمجھ پانے کا گلہ ہے اور اپنی مضبوط محبت پر قائم و دائم رہنے کا یقین بھی۔

﴿۳﴾ مخدومؔ کی انقلابی وسماجی شاعری: دیگر ترقی پسند شعرا کی طرح ہی مخدومؔ نے تہذیبی، تاریخی، سیاسی اور انقلابی پس منظر میں نظمیں لکھیں۔ مخدومؔ کے یہاں سرمایہ داری اور شاہی خاندان کے تسلط، اس کے عروج وزوال، ماضی کے شکستہ نقوش اور تاریخی پس منظر کے علاوہ عصری حسّیت کا عکس اُن کے تینوں مجموعوں کے درجنوں نظموں میں دکھائی دیتا ہے۔ انقلابی فکر ترقی پسند تحریک کا نظریۂ حیات تھا۔ اس لئے انقلابی نظمیں مخدومؔ کے یہاں تو ہیں ہی، اشتراکی نظریات بھی بعض نظموں میں دکھائی دیتے ہیں لیکن مخدومؔ نے خود کو ترقی پسند تحریک کی سستی اشتہار بازی سے بہت حد تک بچائے رکھا۔ اشتراکی اور روسی انقلاب کے ہیرو اسٹالن پر جو نظم لکھی ہے اس میں فاشزم کو خنزیر سے اور اسٹالن کو شاہین سے تشبیہ دی ہے۔ سماجی وانقلابی نظموں میں ''جنگ، دھواں، اندھیرا اور سپاہی'' وغیرہ مخدومؔ کی فکر کو صفحۂ قرطاس پر لا کھڑا کرتی ہیں۔ مخدومؔ کی شاعری میں زوال آمادہ معاشرے، غیر منصفانہ نظامِ عدل اور مظلوم انسانوں پر مسلط کردہ جنگ سے نفرت کا رجحان پایا جاتا

ہے۔اس کی مثال ''حویلی،مشرق،باغی اور تلنگانہ'' سے دی جاسکتی ہے۔مالا بار کے چار کمیونسٹوں کو اپریل ۱۹۴۳ء میں ظالم وجابر حکومت نے پھانسی دے دی تھی۔

''ارضِ بنگال کا قحط،ہندوستانی معاشرے میں انتشار،زلفِ چلیپا،بھوکا ہے بنگال وغیرہ اُن کے مذکورہ بالانظریے کی ترجمانی کرتی ہیں۔

چندمثالیں ملاحظہ فرمایئے۔نظم ''بھوکا ہے بنگال'':

وہ درِ ہندوستاں، وہ سحر و نغمہ کا دیار   دیدنی ہے آج اُس کی ناتوانی کی بہار
بھوک کا ، بیماریوں کا ، بم کے گولوں کا شکار   پیٹھ میں جاپان کا خنجر تو سر پر سود خوار
اُمّتِ مرحوم ہو یا ملّتِ زنّار دار   اُن کے فاقوں کی نہ گنتی ہے نہ لاشوں کا شمار
مرد و زَن ، شیخ و برہمن سب قطار اندر قطار   آہ سوکھی چھاتیوں کی چیخ ، بچوں کی پکار

نظم ''اندھیرا'':

رات کے ہاتھ میں اک کاسۂ دریوزہ گری
یہ چمکتے ہوئے تارے یہ دمکتا ہوا چاند
بھیک کے نور میں مانگے کے اُجالے میں مگن
یہی ملبوسِ عروسی ہے، یہی ان کا کفن
اِس اندھیرے میں وہ مرتے ہوئے جسموں کی کراہ
وہ عزازیل کے کتوں کی کمیں گاہ
وہ تہذیب کے زخم

مخدومؔ نے اندھیرے کو استعارہ بنا کر تہذیب وتمدّن کے کھوکھلے پن کو سیاہ رات کے پردے میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ تہذیب وتمدّن کے کھوکھلے پن کو اور داخلی وخارجی انتشار کو اپنے پہلے مجموعے ''سرخ سویرا'' کی آخری نظم ''تلنگانہ'' میں بھی پیش کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

سیاہ رات جرائم پناہ،ظلم بدوش
سیاہ رات میں بدکار مست اور مدہوش
سیاہ رات میں مقتول عصمتوں کا خروش
سیاہ رات میں باغی عوام برق بدوش

۱۹۵۱ء میں مخدومؔ سینٹرل جیل میں قید تھے۔قید خانے کی صعوبتوں کو اُنھوں نے بڑے قرینے سے نظم ''قید'' کے پیکر میں ڈھالا ہے جس میں رات کی خاموشی وتنہائی،شاعر کا شبستانِ خیال،گزرے ہوئے لمحات،جورِ شاہی اور جبرِ سیاست کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔مخدومؔ محی

الدین کا تیسرا مجموعہ ’’بساطِ رقص‘‘ جو دسمبر ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔اس مجموعے کے شائع ہونے کے بعد سے اپنے انتقال تک اُنہوں نے چند معروف نظمیں لکھیں جن میں ’’درّۂ موت، مارٹن لوتھر کنگ، چپ نہ رہو اور ملاقات‘‘ قابلِ ذکر ہیں۔مخدوم نے اپنی انقلابی وسماجی شاعری میں مختلف طرح کی قدیم وجدید تراکیب، استعارات، تشبیہات اور تلمیحات کو بڑی ہی چابک دستی سے استعمال کیا ہے اور اس سے بڑے کام لیے ہیں۔

مخدوم نے جن تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کا استعمال کیا ہے اُن میں ’’سناٹا، رات، اندھیرا، خیمۂ شب، مسیح وخضر، تہمتِ آدم، بھیک، دریوزہ گری، رہزنی، کوڑھ، موت، برق، آگ، زنجیر، شرر، خرمن، کھیت، پانی، خون، انسان، مزدور، کسان، چاندنی، جنگل اور نور‘‘ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔مخدوم نے ہندوستان کی قدیم روایات اور تہذیب کے اساطیری عوامل وعناصر سے بھی خاطر خواہ فائدہ اُٹھایا ہے۔چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے: نظم ’’رقص‘‘:

وہ روپ رنگ راگ کا پیام لے کے آ گیا وہ کام دیو کی کمان ، جام لے کے آ گیا

نظم ’’زلفِ چلیپا‘‘:

رام وچھمن کی زمیں، وہ کرشن، گوتم کی زمیں وہ محمد کی زمیں، وہ ابنِ مریم کی زمیں

یہ بھی دیکھتے چلیے:

دھنک ٹوٹ کر سیج بنی، جھومر چمکا
سناٹے چونکے، آدھی رات کی آنکھ کھلی
برہ کی آنچ کی نیلی لو
نَے بنتی ہے، لَے بنتی ہے
گونگے سناٹے بول اُٹھے
گھونگھٹ، مکھڑے، جھومر، پائل
چمک، دمک، جھنکار اَمر ہے
پیار اَمر ہے، پیار اَمر ہے

02.05 نظم ’’چاندتاروں کا بن‘‘ متن

(آزادی سے پہلے، بعد اور آگے)

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمع صبحِ وطن
رات بھر جگمگاتا رہا چاندتاروں کا بن
تشنگی تھی مگر

تشنگی میں بھی سرشار تھے
پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لیے
منتظر مرد وزَن
مستیاں ختم، مدہوشیاں ختم تھیں، ختم تھا بانکپن
رات کے جگمگاتے، دہکتے بدن
صبح دَم ایک دیوارِ غم بن گئے
خارزارِ اَلم بن گئے
رات کی شہ رگوں کا اُچھلتا لہو
جُوئے خوں بن گیا
کچھ اِمامانِ صدمکروفن
اُن کی سانسوں میں اَفعی کی پھنکار تھی
اُن کے سینے میں نفرت کا کالا دھواں
اک کمیں گاہ سے
پھینک کر اپنی نوکِ زباں
خونِ نورِ سحر پی گئے
رات کی تل چھٹیں ہیں، اندھیرا بھی ہے
صبح کا کچھ اُجالا، اُجالا بھی ہے
ہمدمو!
ہاتھ میں ہاتھ دو!
سُوئے منزل چلو!
منزلیں پیار کی
منزلیں دار کی
کُوئے دل دار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اُٹھائے چلو!

02.06 نظم ''چاند تاروں کا بن'' تجزیہ

''چاند تاروں کا بن'' (آزادی سے پہلے، بعد اور آگے) مخدوم محی الدین کی معروف نظموں میں سے ایک ہے۔ یہ نظم ترقی پسند اور جدید نظم گو شعرا کی منجملہ علامتی نظموں میں اپنی مثال آپ ہے۔ مخدوم نے اس نظم کو ۱۹۵۸ء میں لکھا تھا۔ ''چاند تاروں کا بن'' یوں تو ایک آزاد نظم ہے لیکن مصرعوں میں صوتی آہنگ بھر پور ہے۔ نظم کا لہجہ انقلابی اور پُر جوش ہوتے ہوئے روایتی نعرے بازی سے قدرے الگ ہے۔ نظم کا موضوع انوکھا اور اچھوتا نہیں کیوں کہ اِس عنوان اور اِس موضوع پر بہت سے شعرا نے نظمیں لکھی ہیں تا ہم اِس نظم کا راست اندازِ بیان قابلِ توجہ ہے۔ نظم وطنِ عزیز کی جدوجہدِ آزادی اور حصولِ آزادی کے فوراً بعد کے المیے کو پیش کرتی ہے تا ہم شاعر روشن مستقبل کی اُمید بھی رکھتا ہے۔ پوری نظم مختلف استعاروں کے باہمی ارتباط کا بہترین نمونہ ہے۔

نظم کا آغاز شہیدانِ وطن کے جسموں کو موم کی طرح دھیرے دھیرے جلنے اور پگھلنے کے ساتھ صبحِ آزادی کی بشارت اور تشنگی، مشکلات اور پیاس میں بھی ایک اُمید آنکھوں میں سجانے کی اور ملک کی آزادی کے انتظار میں اپنے پلکیں بچھانے کی بات شاعر منفرد اور انوکھے انداز میں پیش کرتا ہے۔ یہ بند ملاحظہ کیجیے:

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمعِ صبحِ وطن
رات بھر جگمگا تا رہا چاند تاروں کا بن
تشنگی تھی مگر
تشنگی میں بھی سر شار تھے

نظم کے پہلے حصے میں خود فراموشی کی کیفیت کو شاعر اس طرح بیان کرتا ہے کہ آزادی کی لگن اور پکے ارادے نے دیگر چھوٹے مسائل سے بے خبر کر دیا ہے۔ یہ وہ صورتِ حال ہے جو کسی سماج کے مقصد یا Ideal کو پورے معاشرے کی زندگی کی حرکات و سکنات کو کنٹرول کرتا ہے اور سماج کا ہر فرد کسی بڑی کامیابی اور اعلیٰ مقاصد کے لئے اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشوں اور اختلافات کو بھول جاتا ہے۔ نظم کا پہلا حصہ غلامی، ظلمت اور آزادی کی جدوجہد میں روشنی کی کرن سے عبارت ہے اور پورا حصہ اندھیرے اور اُجالے کی کش مکش کو ظاہر کرتا ہے۔ حالاں کہ پہلے مصرعے میں ''موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن'' اور اس کے آگے شمعِ صبحِ وطن اردو کی مانوس روایتوں سے لی گئی ہیں لیکن اس کے آگے کے مصرعوں میں شامل استعارے، تشنگی، پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے وغیرہ مخدوم کی انفرادیت کو بیان کرتے ہیں۔

تن، وطن، بن، مردو زَن، بانکپن، مکر وفن جیسے قوافی میں حرفِ نون کی متواتر گونج سے نظم میں موسیقیت پیدا ہوگئی ہے۔ امامانِ صد مکر وفن کی ترکیب ابہام سے پُر ہے جو نظم کی Image کو وسیع کرتی ہے۔ چوں کہ سانپ انسان کا اَزَلی دشمن ہے جس کو شاعر نے استعاراتی پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس کے دوسرے حصے میں صبحِ آزادی کے لئے شہیدانِ وطن کے بدن دہکتے رہے اور جگمگاتے رہے اور آزادی حاصل ہوتے ہی، آزادی کی صبح ہوتے ہی دیوارِ غم بن گئے۔ یہاں مخدوم کا اشارہ تقسیمِ ملک کے بعد قیامت خیز فسادات کی طرف ہے۔ دیوارِ غم تقسیم کے المیے کی علامت ہے۔ خار زارِ الم بھی اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ خون جورات کی شہ رگوں میں اُچھل رہا تھا یعنی لوگوں میں جو جوش و

خروش تھا وہ غلط سمت میں مُڑ گیا اور کچھ مکر وفریب پھیلانے والے رہ نما جن کی سانسوں میں زہریلے سانپ کی پھنکار تھی، جن کے سینوں میں مکروفریب کا لاوا تھا، اپنی نوکِ زبان سے، اپنی زہریلی باتوں سے سحر کے نور کا خون پی گئے یعنی حصولِ آزادی کا جو مقصد اور جو خواب تھا وہ چکنا چور ہو گیا۔ اس نظم کا آخری حصہ ترقی پسند شعرا کا مقبول اندازِ بیان ہے جو دیگر شعرا سے الگ نہیں۔ اس میں شاعر ماضی سے حال کی طرف لوٹتا ہے اور اندھیرے کے بعد آنے والے اُجالے کی تمنا کرتا ہے۔ یہاں مختلف پیرایۂ بیان سے مخدؔوم نے دنیا میں پھیلی ظلمتوں کو اشتراکیت، افریقہ وایشیا اور لاطینی امریکہ کے متعدّد ملکوں کی آزادی کو صرف سمجھتے ہی نہیں بلکہ یہاں کی عوام کو جدّ وجہد کے لئے اور آگے بڑھنے کے لئے اپنی اپنی صلیبیں اُٹھا کر سفرِ مسلسل کی ترغیب بھی دیتے ہیں۔ یہاں انفرادی جدوجہد کو اجتماعی جدوجہد میں بدلنے کی سعی کی طرف اشارہ ہے۔

مخدؔوم کی اس نظم کا سارا حُسن اس کی رمزیت میں مخفی ہے۔ نظم کے عنوان کے بعد اگر قوسین میں آزادی سے پہلے، بعد اور آگے نہ لکھا گیا ہوتا تو اس نظم کو سیاسی نظم سمجھنا بھی دشوار ہو جاتا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مخدؔوم کی یہ نظم کم وبیش اتنی ہی استعاراتی ہے جتنی کہ فیضؔ کی نظم 'صبحِ آزادی' ہے۔ نظم کا عنوان اپنے قاری کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ جس طرح رات کی سیاہی میں چاند، تاروں کے جھرمٹ میں روشنی پھیلانے کی جدّ وجہد کرتا ہے اسی طرح انسان کو اپنی چھوٹی چھوٹی حیثیت کو مجتمع کر کے ظلم وجبر اور ظلمت سے برسرِ پیکار ہونا چاہیے۔

نظم میں علامتوں کا خوب صورت استعمال مثلاً پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے، جُوے خوں، اَفعی کی پھنکار، نفرت کا کالا دھواں، نورِ سحر، رات کی تل چھٹیں اور صبح کا اُجالا ایسی اچھوتی ترکیبیں ہیں جو نظم کی معنویت میں اضافہ کرتی ہیں۔ اِس نظم کا اختتام ''دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اُٹھائے چلو' انسان کے لئے حرکت وعمل اور جدّ وجہد کی ترغیب ہے۔

02.07 نظم ''چارہ گر'' متن

اک چنبیلی کے منڈوے تلے
مے کدے سے ذرا دُور اُس موڑ پر

دو بدن
پیار کی آگ میں جل گئے
پیار حرفِ وفا
پیار اُن کا خدا
پیار اُن کی چتا

دو بدن
اُوس میں بھیگتے، چاندنی میں نہاتے ہوئے
جیسے دو تازہ رَو، تازہ دم پھول پچھلے پہر
ٹھنڈی ٹھنڈی سبک رَو چمن کی ہوا
صرفِ ماتم ہوئی

کالی کالی لٹوں سے لپٹ گرم رُخسار پر
ایک پل کے لئے رُک گئی
ہم نے دیکھا اُنہیں
دن میں اور رات میں
نور و ظلمات میں
مسجدوں کے مناروں نے دیکھا اُنہیں
مندروں کے کواڑوں نے دیکھا اُنہیں
مَے کدے کی دراڑوں نے دیکھا اُنہیں
اَز اَزَل تا اَبد
یہ بتا چارہ گر!
تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے؟
کچھ علاج و مداوائے اُلفت بھی ہے؟
اک چنبیلی کے منڈوے تلے
مے کدے سے ذرا دُور اُس موڑ پر
دو بدن
چارہ گر!

02.08 نظم ''چارہ گر'' تجزیہ

جب کسی شاعر کا ذہن و تجربہ پختہ ہو جاتا ہے تو اس کے قلم سے نکلے ہوئے اشعار میں معنویت اور افکار میں بلندی آجاتی ہے۔ مخدوؔم کے دوسرے مجموعۂ کلام ''گُلِ تر'' کی نظموں میں وہی معنویت اور افکار کی بلندی پائی جاتی ہے۔ اس مجموعے کی نظموں میں اُن کی ذہنی پختگی اور دانش مندی تخلیقِ کائنات اور رُموزِ کائنات کو سمجھنے میں مدد کرتی ہے مگر مخدوؔم نے یہاں بھی محبت کا دامن نہیں چھوڑا ہے بلکہ مذکورہ پختگی سے اُن کی محبت میں ہمہ گیریت آگئی ہے۔ یہاں ایک رومانی شاعر کا رومان اعلیٰ اقدار کا حامل ہو جاتا ہے۔ اب وہ محبت کے جذبے کو دو جسموں کا ملاپ یا انفرادی تلذّذ حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں سمجھتا بلکہ اُس کی محبت آفاقی اور ہمہ گیر ہو جاتی ہے۔

یہی جذبہ مخدوؔم محی الدین کی زیرِ مطالعہ نظم ''چارہ گر'' میں موج زَن ہے۔ نظم چارہ گر میں ایک مشرقی تمدّن کا رچاؤ، رکھ رکھاؤ اور پاکیزگی ہے۔ ایسی پاکیزہ محبت دو دلوں میں متوازن محبت کی موج پیدا کرتی ہے۔ چارہ گر میں مخدوؔم کے سماجی شعور کی پختگی اس منزل پر پہنچ گئی ہے جہاں سے اَزَلی محبت، رموزِ زندگی اور کائنات کے مشاہدے سے خیالات کے لعل و گہر چُن کر لا سکتے ہیں۔ اس نظم کا موضوع ہی اَزَلی

واَبدی محبت ہے جو انسانی تہذیب کے ہر دَور، ہر نظام اور ہر معاشرے میں موجود رہا ہے۔ پاک محبت کرنے والے، محبت کا اصلی جذبہ رکھنے والے ہمیشہ سے پیار کی آگ میں جلتے رہے ہیں۔ پیار اُن کے لئے حرفِ وفا ہے۔ پیار ہی اُن کا خدا ہے اور پیار میں ہی ہر چاہنے والے کی موت واقع ہوتی ہے۔

پیار حرفِ وفا
پیار اُن کا خدا
پیار اُن کی چِتا

گویا حقیقی محبت کرنے والوں کے لئے پیار ہی سب کچھ ہے۔ دنیا کا کوئی بھی سماج اور معاشرہ پیار سے خالی نہیں ہے لیکن اس کے تقدّس اور سچائی کو کوئی نہ جان سکا۔ کوئی ایسا چارہ گر، مددگار اور دَم ساز پیدا نہ ہوا جو اِس روگ کو اچھا کر سکے۔ کسی کیمیا گر، دوا ساز اور طبیب نے اب تک ایسا نسخہ ایجاد نہیں کیا جس نسخے میں علاجِ محبت اور مداوائے اُلفت ہو۔ لہذا شاعر پورے معاشرے اور پوری دنیا کو مخاطب کر کے چیلنج کرتا ہے۔

یہ بتا چارہ گر!
تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے؟
کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے؟

محبت کی یہی ہمہ گیری، جاں نثاری اور بے لوث جذبہ اسے اَزَلی وابدی بناتا ہے۔ 'چارہ گر' یوں تو آزاد نظم ہے لیکن اپنی بے پناہ نغمگی کی وجہ سے فلم میں بھی شامل کی گئی ہے۔ اس میں اس قدر روانی اور غنائیت ہے کہ قاری اور سامع کو نظم کے خاتمے تک بندھے رہنا پڑتا ہے اور قرأت کی تکمیل کے بعد قاری کے ذہن میں بہت دیر تک تلاطم برپا رہتا ہے۔ کُل ملا کر اردو شاعری میں ہیئت کے لحاظ سے جتنی آزاد نظمیں لکھی گئی ہیں اُن کی پہلی صف میں 'چارہ گر' کو شمار کیا جا سکتا ہے۔

02.09 خلاصہ

اس اکائی میں آپ نے مخدوم محی الدین کے حالاتِ زندگی، ادبی خدمات اور فکری رجحانات سے واقفیت حاصل کی۔ ساتھ ہی ساتھ اُن کی دو معروف نظموں ''چاند تاروں کا بن اور چارہ گر'' کا خصوصی مطالعہ بھی کیا۔ مخدوم محی الدین کا اصل نام ابو سعید محمد مخدوم محی الدین خدری تھا۔ وہ ۴؍ فروری ۱۹۰۸ء میں ریاستِ حیدرآباد کے ضلع میدک میں پیدا ہوئے۔ اُن کے آبا و اجداد کا تعلق اعظم گڑھ یو پی سے تھا۔ بچپن میں والد کے انتقال کے بعد اُن کی پرورش اُن کے چچا بشیر الدین نے کی۔ مخدوم نے ۱۹۲۹ء میں میٹرک پھر منشی کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۶ء میں عثمانیہ یونی ورسٹی سے انٹرمیڈیٹ اور پھر اسی یونی ورسٹی سے بی۔ اے اور ایم۔ اے کی تعلیم حاصل کی۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد کلرک کی نوکری کی۔ ۱۹۳۹ء میں سٹی کالج میں بحیثیتِ استاد تقرر ہوا۔ ۱۹۴۰ء میں کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ ۱۹۴۱ء میں کالج کی نوکری سے استعفیٰ دیا۔

مخدوم محی الدین کی رہ نمائی میں ۱۹۴۳ء میں انجمن ترقی پسند تحریک کی تشکیل ہوئی۔وہ انقلابی اور ٹریڈ یونین کی سرگرمیوں میں شامل رہے۔۱۹۵۲ء میں عام انتخابات میں حصہ لیا۔۱۹۵۶ء میں قانون ساز کونسل کے اُمیدوار چُنے گئے اور حزبِ اختلاف کے لیڈر منتخب ہوئے۔ مخدوم نے سوویت یونین، چین، سمرقند، بخارا اور تاشقند کا دورہ کیا۔کئی بار گرفتار اور رہا ہوئے۔اُنہیں ۱۹۵۳ء میں عالمی ٹریڈ یونین فیڈ ریشن میں شامل ہونے کے لئے وِیانا بھیجا گیا۔وہ کل ہند ٹریڈ یونین کے سکریٹری بنائے گئے۔آخری عمر تک اسمبلی میں کمیونسٹ پارٹی کے قائد اور حزبِ اختلاف کے لیڈر رہے۔پوری زندگی مخدوم نے غریبوں اور کمزور طبقات کے حقوق کے لئے وقف کر دی۔۲۵/اگست ۱۹۶۹ء کو اُن کا انتقال دہلی میں ہوا۔

مخدوم کی ادبی زندگی کا آغاز اُن کی نظم ''پیلا دوشالہ'' سے ہوتا ہے۔وہ ترقّی پسند تحریک کے شعرا کی پہلی صف کے شاعر مانے جاتے ہیں ۱۹۴۴ء میں اُن کا پہلا شعری مجموعہ ''سرخ سویرا'' کے نام سے شائع ہوا۔مخدوم کا دوسرا مجموعہ ''گُلِ تر'' کے نام سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۶۶ء میں تیسرا شعری مجموعہ ''بساطِ رقص'' کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔مخدوم محی الدین نے اپنے ہم عصر جدید شعرا ہی کی طرح اپنی شاعری کا آغاز رومانی نظموں سے کیا۔اُنہوں نے متعدد رومانی نظموں کے علاوہ انقلابی، تاریخی اور سماجی پس منظر میں بھی نظمیں لکھی ہیں۔

رومانی نظموں میں ''جانِ غزل، احساس کی رات اور سناٹا'' خاص نظمیں ہیں جب کہ سیاسی، انقلابی، تاریخی اور تہذیبی نظموں میں ''جنگ، دھواں، اندھیرا، سپاہی، زلفِ چلیپا، بھوکا ہے بنگال، مارٹن لوتھر کنگ، بساطِ رقص، چپ نہ رہو، اور ملاقات'' قابلِ ذکر ہیں۔آپ نے اس اکائی میں اُن کی دو نظموں ''چاند تاروں کا بن اور چارہ گر'' کا مطالعہ کیا۔''چاند تاروں کا بن'' ۱۹۵۸ء میں لکھی ہوئی نظم ہے۔اس نظم میں وطنِ عزیز کی جدّ و جہد اور حصولِ آزادی کے فوراً بعد کا المیہ پیش کیا گیا ہے۔نظم میں مکّار سیاست دانوں اور ظلم و جبر پھیلانے والوں کے خلاف جدّ و جہد کرنے اور حرکت و عمل کی تجدید کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔''چارہ گر'' میں مخدوم کے افکار کی بلندی اور ہمہ گیریت کو آفاقی پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس نظم میں مشرقی تمدّن کی پاکیزگی، رَکھ رَکھاؤ، اَزَلی محبت، رُموزِ زندگی اور کائنات کے مشاہدے کی طرف ذہن کو مبذول کیا گیا ہے۔اس نظم میں بے پناہ غنائیت ہے جو قاری و سامع کو نظم کے خاتمے تک باندھے رکھتی ہے۔

02.10 فرہنگ

آتش کدہ	:	وہ عمارت جہاں آگ کی پُوجا ہوتی ہے	شبستانِ خیال	:	خیال کا مسکن (دماغ)
اَفعی	:	ناگ، ایک قسم کا زہریلا سانپ	عارض	:	رُخسار، گال
بالیدہ	:	خوش، بڑھا ہوا	عزازیل	:	ابلیس، شیطان
برسرِ پیکار	:	تیار، لڑنے کے لئے تیار	عصری حسیّت	:	زمانے کی پہچان
بساط	:	بستر، بچھونا، فرش	غنائیت	:	نغمے کی کیفیت، موسیقیت
پاس داری	:	لحاظ، خیال، ادب	قوسین	:	بریکیٹ [ ] ( )
پشیمانی	:	شرمندگی، افسوس	کمین گاہ	:	وہ جگہ جہاں چھپ کر شکار یا دشمن کو ماریں
تشکیک	:	شک میں ڈالنا	مخفی	:	چھپا ہوا، پوشیدہ، خفیہ

تلاطم	:	لہریں اُٹھنا، پانی کا موجیں مارنا	مداوا	:	دوا، علاج، تدبیر
حزبِ اختلاب	:	مخالف پارٹی، مخالف جماعت	ملبوسِ عروسی	:	دلہن کا جوڑا
خرمن	:	کھلیان، انبار	منطقی	:	علمِ منطق جاننے والا، حجّتی، جھگڑالو
خودرَو	:	اپنے آپ اُگا ہوا	نسخۂ کیمیا	:	بیماری کے علاج کا نسخہ
زنبیل	:	جھولی، تھیلی	ہمہ گیری	:	مکمل طور پر، پوری طرح
زنّاردار	:	پنڈت	یلغار	:	حملہ، چڑھائی

02.11 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ : مخدومؔ کی رومانی شاعری کا تجزیہ کیجیے۔

سوال نمبر۲ : مخدومؔ کی نظم ''چاندتاروں کا بن'' کا پس منظر بیان کیجیے۔

سوال نمبر۳ : مخدومؔ کا ذہن اشتراکیت کی طرف کیوں مائل ہوا؟

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ : مخدومؔ کی خالص ترقی پسند نظموں کا جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۲ : مخدومؔ کی نظم ''چارہ گر'' کی تشریح کیجیے۔

سوال نمبر۳ : مخدومؔ کے حالاتِ زندگی کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

02.12 حوالہ جاتی کتب

۱۔ انتخاب کلامِ مخدومؔ از دعبدالغفّار

۲۔ جدید نظم: حالؔی سے میراجی تک از کوثر مظہری

۳۔ مخدومؔ اور کلامِ مخدومؔ از آلِ احمد سرور

۴۔ مخدومؔ محی الدین حیات و کارنامے از شاذ تمکنت

✵

اکائی 03 : ن.م.راشد ''دریچے کے قریب''

ساخت :

03.01 : اغراض ومقاصد

03.02 : تمہید

03.03 : ن.م.راشد کے حالاتِ زندگی

03.04 : ن.م.راشد کی نظم نگاری

03.05 : نظم ''دریچے کے قریب'' متن

03.06 : نظم ''دریچے کے قریب'' تجزیہ

03.07 : خلاصہ

03.08 : فرہنگ

03.09 : سوالات

03.10 : حوالہ جاتی کتب

03.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں ن.م.راشد کے حالاتِ زندگی ،اُن کی شاعری میں متنوّع کیفیات، امتیازی خصوصیات اور عصری رجحانات پر سیر حاصل گفتگو کی جائے گی۔خصوصاً اُن کی نظم نگاری میں انفرادیت،ادبی و جمالیاتی معنویت پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔اِس اکائی میں آپ اُن کی نظموں کا خصوصی مطالعہ کریں گے اور اُن کی ایک مشہور نظم ''دریچے کے قریب'' کا خصوصی طور پر جائزہ لیں گے۔آخر میں اکائی کا خلاصہ،فرہنگ،سوالات اور حوالہ جاتی کتب کی فہرست دی جائے گی۔

03.02 تمہید

اردو کی اکثر اصناف فارسی اصنافِ ادب کے زیرِ اثر پروان چڑھیں۔چناں چہ اردو شاعری کا آغاز وارتقا بھی فارسی شاعری کے زیرِ سایہ ہوا۔ظاہر ہے کہ ابتدا میں اردو شاعری کے مختلف پہلوؤں پر فارسی شاعری کی روایات کا خاص اثر رہا۔خاص طور سے مابعدالطبعیاتی روایات، اخلاقیات اور صدق و جمال کے حوالے سے لیکن ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے بعد ادب میں نئے حالات پیدا ہوئے اور خاص طور سے ادبی اصناف نے عقلی رویّوں اور زمانے کے تقاضوں کو اپنے اندر سمونا شروع کیا۔حالاں کہ اردو میں عوامی شاعری کے گہرے نقوش قلی قطب شاہ اور نظیرؔ اکبرآبادی کی شاعری میں دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد عوامی اور جدید تقاضوں کو اردو شاعری نے اپنے اندر جگہ دینا شروع کردیا جس کی مثال مولانا محمد حسین آزادؔ، الطاف حسین حالیؔ اور اسماعیل میرٹھی وغیرہ کی نظموں سے دی جاسکتی ہے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں جدید نظم نگاروں کی ایک طویل فہرست سامنے آتی ہے اور جدید نظم نگاری زندگی کے مختلف شعبے کو متاثر کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جدید نظم نگاروں میں اقبالؔ، فیضؔ، جوشؔ، اخترؔ الایمان، حفیظؔ جالندھری اور اختر شیرانی وغیرہ سامنے آتے ہیں۔ اس زمانے میں کئی ادبی تحریکیں شیریں و تلخ صداقتوں کا جھنڈا لیے میدان میں اُترتی ہیں جن میں ''ترقی پسند تحریک'' اور ''حلقۂ اربابِ ذوق'' خاص ہیں۔ ان تحریکوں نے شاعری کی ہیئت میں نت نئے تجربات کیے۔ مختلف شعرا کو اپنے زیرِ اثر پروان چڑھایا لیکن کچھ شعرا نے ان سبھی تحریکوں کو دیکھا، پرکھا اور سمجھا مگر کسی تحریک کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا اور نہ اس کے دُم چھلّے کی طرح کام کیا۔ اُنھی شعرا میں سے ن۔م۔راشد نے ایک نیا راستہ اپنے لئے تجویز کیا اور پچھلی ساری روایات سے انحراف کرتے ہوئے ایک نئی روایت کی بنیاد ڈالی۔ نظمِ جدید میں ن۔م۔راشد کا ایک اہم مقام ہے۔

03.03 ن۔م۔راشد کے حالاتِ زندگی

ن۔م۔راشد کا اصل نام نذر محمد راشد تھا۔ اُن کے آبا و اجداد پہلے کوٹ بھوبنداس اور بعد میں علی پور چٹھہ ضلع گوجرانوالہ کے ایک قصبے اکال گڑھ میں آباد ہوئے۔ جہاں ن۔م۔راشد یکم اگست ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ قصبہ اکال گڑھ جواب علی پور چٹھہ کے نام سے موسوم ہے، دریائے چناب کے جنوب میں چند میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ن۔م۔راشد کے سلسلۂ نسب میں مولوی محمد فاضل ضلع گوجرانوالہ میں سب سے پہلے سکونت اختیار کی۔ اس لئے اُنہیں ضلع گوجرانوالہ کے راج پُوت جنجوہوں کا جدِّ امجد تصوّر کیا جاتا ہے۔

مولوی محمد فاضل کے خاندان میں غلام رسول کے بیٹے راجا فضلِ الٰہی کے گھر میں نذر محمد راشد کی ولادت ہوئی جو آگے چل کر ن.م.راشد کے نام سے مشہور ہوئے۔ راشد کے والدِ ماجد راجا فضلِ الٰہی چشتی فارسی اور اردو شاعری سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ کبھی کبھار خود بھی شعر کہتے تھے۔ راشد کے دادا ڈاکٹر غلام رسول جو غلامیؔ تخلص رکھتے تھے، عربی فارسی اور اردو کے اچھے شاعر تھے۔ راشد کو اپنے طالب علمی کے ابتدائی زمانے میں ہی شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ اُنہوں نے اپنی پہلی نظم ''انسپکٹر اور مکھیاں'' کے عنوان سے صرف آٹھ برس کی عمر میں کہی۔ یہ نظم راشد کے اسکول کا معائنہ کرنے آئے ایک اسکول انسپکٹر پر طنز تھی جس کے سر پر لگا تار مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔

﴿۱﴾ **تعلیم و تربیت:** ن۔م۔راشد نے ابتدائی تعلیم اپنے قصبے سے ہی حاصل کی اور ۱۹۲۶ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ راشد نے گورنمنٹ کالج لائل پور موجودہ فیصل آباد، پاکستان میں اسی سال ایف۔اے میں داخلہ لیا۔ ایف۔اے میں انگریزی، تاریخ، فلسفہ، فارسی اور اردو مضامین کا انتخاب کیا۔ ۱۹۲۸ء میں ایف۔اے پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ بی.اے. میں راشد نے انگریزی، اقتصادیات اور فارسی مضامین اختیار کیے۔ کچھ دن انگریزی آنرس کے کورس میں شامل رہے لیکن بی۔اے آنرس کا امتحان فارسی مضمون کے ساتھ پاس کیا اور پوری یونی ورسٹی میں دوم رہے۔ اس کے بعد انہوں نے ایم۔اے اقتصادیات میں داخلہ لیا اور اسی دوران آئی۔سی۔ایس اور پی۔سی۔ایس کے مسابقتی امتحان میں شریک ہوئے لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔

۱۹۳۲ء میں راشد نے اقتصادیات سے ایم۔اے پاس کیا۔ راشد ہائی اسکول کے زمانے سے ہی ادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ چناں چہ اسکول کے زمانے میں چند حمد، نعتیں اور غزلیں کہیں۔ اُن کی نگارشات ''تفریح''، بجنور اور ''کائنات'' پانی پت میں شائع ہوتی رہیں۔ انہوں نے رسالہ زمین دار گزٹ میں دیہات سدھار پر متعدّد نظمیں کہیں۔ کالج کے مشاعروں میں حصہ لیا۔ انہیں ''تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لئے'' پر انعام دیا گیا۔ کالج کے رسالہ ''راوی'' کے اردو ایڈیٹر رہے۔

کالج کے بزمِ سخن کے سکریٹری بھی رہے۔ن۔م۔راشد نے کالج کی رسمی ڈگریوں کے ساتھ ساتھ فرانسیسی زبان سیکھی اور منشی فاضل کا کورس بھی کیا۔فیضؔ اور آغا عبدالحمید کالج کے زمانے کے اچھے دوست اور احمد شاہ پطرس بخاری جیسے اچھے استاد ملے۔

﴿۲﴾ **ملازمت:** تعلیم کی تکمیل کے بعد ن۔م۔راشد نے ذریعۂ معاش کے حصول کے لئے طویل تگ ودَو کی جو بہ یک وقت ادبی بھی اور معاشی بھی ہے۔۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۴ء تک راشد نے ملتان کے ایک نیم ادبی رسالے نخلستان کی بغیر معاوضہ ادارت کی۔یہیں پر ان کی ملاقات فارسی شاعر پروفیسر محمد اکبر منیف اور اردو شاعر اور انگریزی کے استاد تاج محمد خیالؔ اور عبداللطیف تپشؔ سے ہوئی۔۱۹۳۴ء میں ن.م.راشد نے مولانا تاج وَر نجیب آبادی کے اصرار پر اُن کے رسالے ''شاہ کار'' کی ادارت کی مگر مولانا کی بدمعاملگی کی وجہ سے اسے ترک کر دیا۔ملتان میں کمشنر کے دفتر میں کلرک رہے۔مئی ۱۹۳۹ء میں انہیں کلرکی سے نجات ملی اور ان کا تقرّر آل انڈیا ریڈیو میں نیوز ایڈیٹر اور پروگرام اسسٹنٹ کے طور پر ہوا۔

۱۹۴۳ء میں راشد نے آل انڈیا ریڈیو کو خیر آباد کہا اور فوج میں عارضی کمیشن حاصل کر کے بیرونِ ملک چلے گئے۔بیرونِ ممالک چھ ماہ عراق، ڈیڑھ سال ایران اور پھر چھ ماہ مصر میں گزارے۔۱۹۴۷ء میں فوجی ملازمت ترک کر کے دوبارہ آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہو گئے۔تقسیمِ ملک کے بعد انہوں نے پشاور ریڈیو اسٹیشن پر اپنی خدمات انجام دیں اور ۱۹۴۹ء میں ریڈیو پاکستان، کراچی کے ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز کے علاوہ پشاور ریڈیو اسٹیشن پر ریجنل ڈائریکٹر رہے۔۱۹۵۲ء میں وہ اقوامِ متحدہ سے منسلک ہوئے اور نیویارک، جکارتا اور کراچی میں اپنی خدمات انجام دیں۔بعدازاں راشد تہران میں اقوامِ متحدہ کے مرکزِ اطلاعات کے ڈائریکٹر مقرّر رہوئے۔۱۹۷۴ء میں ن۔م۔راشد ایران میں اپنے عہدے سے سبک دوش ہوئے اور پنشن لے کر لندن میں مستقل طور پر مقیم ہو گئے۔یہیں اُن کا ۹/اکتوبر ۱۹۷۵ء کو انتقال ہوا۔

03.04 ن۔م۔راشد کی نظم نگاری

ن.م.راشد کی نظمیں کالج کے زمانے سے ہی اہلِ علم کو متاثر کرنے لگی تھیں۔کلرکی کا زمانہ راشد کی شاعری کی پہچان کا زمانہ تھا۔انہوں نے اس زمانے میں بہت اچھی اچھی نظمیں تحریر کیں۔۱۹۳۵ء میں ''ادبی دنیا'' لاہور کے سال نامے میں شائع ہونے والی نظم ''اتفاقات'' سبھی کو چونکانے والی ثابت ہوئی۔ن۔م۔راشد نے ''خاک سار تحریک'' میں دل چسپی لی۔اس تحریک کا نظم وضبط اُنہیں پسند تھا لیکن آمریت اُنہیں گوارا نہیں تھی۔راشد نے اس زمانے میں عسرت وتنگی دستی کا سامنا کیا۔اُنہوں نے کئی تنقیدی مضامین کے علاوہ ایک روسی ناول ''یاما'' کا ترجمہ کیا جس کا معاوضہ اُنہیں نہ ملا اور نہ ہی کتاب پر بحیثیتِ مترجم اُن کا نام شائع ہوا۔

ان حالات وواقعات نے اُن کی شاعری کے لئے بنیاد فراہم کی۔ن۔م۔راشد پر کچھ مغربی ومشرقی مفکرین شعرا نے بطورِ خاص اثر ڈالا۔جن مغربی مفکرین وشعرا نے خاص طور سے راشد کو متاثر کیا اُن میں ای۔ایم فاسٹر، ڈی۔ایچ۔لارنس، جیمس جوائس، آسکر وائلڈ، میلسن ٹالسٹائی، دوستو وسکی اور ٹی۔ایس۔ایلیٹ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔چوں کہ راشد کو فارسی شعر وادب سے گہری دل چسپی اور فارسی زبان پر دست رَس تھی اس لئے وہ رومیؔ اور حافظؔ سے بہت حد تک متاثر نظر آتے ہیں۔مذکورہ حالات، واقعات اور مطالعہ وشخصیات نے ن.م.راشد کی شاعری کے لئے بہتر زمین فراہم کی۔ملک وبیرونِ ملک کے حالات، متعدّد تحریکیں، جاپان کی روس پر فتح، مغرب کی غلامی کی آزادی سے جدوجہد، ہندوستان کی جدّ وجہدِ آزادی، پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے نتیجے میں اقتصادی بحران، کساد بازاری اور سیاسی خلفشار وغیرہ نے راشد کے احساس کو جلا بخشی۔

سماجی سطح پر ہورہی تبدیلیوں اور ٹوٹ پھوٹ مثلاً خاندانوں کا بکھرنا، دیہی علاقوں سے شہر میں آبادی کا منتقل ہونا، مغربی طرزِ تعلیم، جدید طرزِ فکر، فرد کی ذاتی آزادی اور مختلف نظریۂ حیات نے بھی راشد کو کئی سطحوں پر متاثر کیا اور اُن کی ذہنی سوچ میں خلفشار اور تلاطم پیدا ہوا جس کی وجہ سے اُن کی شاعری ایک انفرادی ڈگر پر چل پڑی۔ یہی وجہ ہے کہ راشد نے اپنے ہم عصر شعرا سے الگ ہٹ کر اپنی راہ بنائی۔

ن۔م۔راشد کی نظموں کا پہلا مجموعہ ''ماورا'' کے نام سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا جس میں بقولِ راشد اُن کے گزشتہ دس سال کے کلام کو تاریخی اعتبار سے انتخاب و ترتیب دیا گیا ہے۔ اس ترتیب سے ن۔م۔راشد کے ذہنی ارتقا کا اندازہ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔ ''ماورا'' کی ابتدائی نظموں کے مطالعے سے اس بات کا احساس ہونے لگتا ہے کہ ایک خاص فکر سے ان نظموں کو ڈھالا گیا ہے۔ حالاں کہ ان میں جذباتی موضوعات زیادہ اُبھر کر سامنے آئے ہیں لیکن فکر کی ہلکی سی چادر کو بھی ان نظموں نے اوڑھ رکھا ہے۔

ن.م.راشد کی نظموں کا دوسرا مجموعہ ''ایران میں اجنبی'' ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔ راشد کا تیسرا مجموعہ ''لا انسان'' کے نام سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ ان کا چوتھا مجموعہ ''گمان کا ممکن'' ان کی وفات کے بعد ۱۹۷۶ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ ن۔م۔راشد کی ایک کتاب ''جدید فارسی شاعری'' کے نام سے مجلسِ ترقی ادب لاہور نے شائع کی ہے۔ اس میں ۱۹/فارسی شعرا کے حالاتِ زندگی اور ان کی نظموں کے تراجم موجود ہیں۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ فارسی میں جدید نظم کے بانی نیما یوشیج سے لے کر حال کے نئے لکھنے والوں تک کا تذکرہ ہے۔

یہ کتاب جدید فارسی نظموں کے تراجم کے ساتھ ساتھ ایرانی ثقافت و تہذیب سے راشد کی شناسائی کا مظہر ہے اور وہاں اردو میں جدید فارسی شاعری کا بہترین تعارف بھی۔ ن۔م۔راشد ''شہرِ وجود اور مزار'' کے نام سے اپنا پانچواں مجموعۂ کلام ترتیب دے رہے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ فارسی مستعملات کے نام سے جدید فارسی الفاظ و تراکیب کی ایک گلوزری (Glossary) اردو میں لکھنا چاہتے تھے لیکن دریں اثنا ۹/اکتوبر ۱۹۷۵ء کو لندن میں اِس دارِفانی سے کوچ کر گئے۔

﴿۱﴾ ن۔م۔راشد کی انفرادیت: ن۔م۔راشد کو شاعروں کا شاعر کہا جاتا ہے۔ یہ عجیب سی بات لگتی ہے کہ کوئی شاعر اس لقب سے کیوں کر یاد کیا جائے۔ شاید اس لئے کہ معنوی و صوری دونوں لحاظ سے راشد کی شاعری میں روایتی اسالیب سے انحراف پایا جاتا ہے۔ انحراف ہی کیوں؟ بہت حد تک اپنے عصری اسالیب سے بغاوت بھی۔ حالاں کہ یہ بغاوت کہیں روشن ہے تو کہیں مدھم لیکن یہ دراصل ان کی شاعری کا اہم ترین عنصر ہے۔ کسی نے راشد کو سیاسی شاعروں میں شمار کیا ہے تو کسی نے انہیں جنسیات کا شاعر کہا ہے۔ حالاں کہ راشد کو ان میں سے کسی ایک کھونٹے سے نہیں باندھا جاسکتا۔ راشد کی شاعری کو سمجھنے کے لئے ان دونوں نکتوں کو ذہن نشین کرنا بہت ضروری ہے۔ راشد کے نزدیک زندگی ایک وحدت کی حیثیت رکھتی ہے اور اس وحدت کے کسی عنصر کو جدا کرنا ممکن نہیں۔ ان کے نزدیک تغذیہ اور تولید دو بنیادی عناصر ہیں جن سے نسلِ انسانی کا وجود قائم ہے۔ تغذیہ کو تخلیقِ خون کا سرچشمہ تصوّر کیا جاتا ہے اور خون میں محبت کی خو ہوتی ہے۔ اسی سے جمالِ یار، رنگ و بو اور نغمہ و سرور کی پرورش ہوتی ہے۔ راشد کے نزدیک وہی خون خطوطِ جسم کو نکھارتا ہے اور وہی قہقہوں میں ترنگ اور ہونٹوں میں رَس بھرتا ہے۔ چناں چہ ن۔م۔راشد نے اس نقطۂ نظر کو انسانی بقا اور اتصال اور روح کی بالیدگی اور حُزن و عشق کے افسانے کا ذریعہ مانا ہے۔

ن.م.راشد کے نزدیک روح کی دنیا جسم سے ماورا نہیں، روح کا اظہار جسم کی چہکار ہے۔ روح کا پھول جسم کی شاخ پر ہی کھلتا ہے اور اسی سے نور حاصل کرتا ہے یعنی تکمیلِ انفرادیت، شخصیت، تخلیقِ حُسن اور اکتسابی قوت اسی کے مختلف رنگ، روپ ہیں۔ راشد اپنی شاعری کے

ابتدائی دَور میں اِسی اندھیرے اُجالے سے گزرے ہیں۔ جہاں راشد نے روح وجسم کا اندر سے تجزیہ و تجربہ کیا وہیں سیاست کا مشاہدہ صرف دریچے سے کیا۔ جس طرح کھوٹے سونے کو بھٹی میں تپا کر خالص بنانے کی سعی کی جاتی ہے اسی طرح راشد نے ان جذبات و کیفیات کو محبت کی بھٹّی میں تپا کر خالص بنانے کی کوششیں کیں۔ ان کے نزدیک محبت صرف ایک شخص کے تکمیلِ نفس کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ دو شخصوں کی روح کی آزادحرکت ہے۔ ان کے نزدیک محبت میں صرف دو شخصیتوں کا اتّصال ہی نہیں بلکہ افتراق بھی ہوتا ہے۔ محبت کرنے والے اپنے اتّصال سے اپنی انفرادیت کو ختم نہیں کرتے بلکہ دوسرے کی قوت سے انجذاب حاصل کر کے اپنی اپنی انفرادیت اور شخصیت کو مزید مستحکم کرتے ہیں۔ راشد کے نزدیک دولت، رنگ ونسل، مذہب وملت اور غربت وامارت تمام قسم کی معذوریت اور امتیازات سے محبت کو آزاد ہونا چاہیے۔

بقول ڈی۔ ایچ۔ لارنس:

''محبت کسی قسم کی نسلی، مذہبی، قومی اور طبقاتی تقسیم نہیں کرتی اور نہ یہ ایسی شَے ہے جسے روپے پیسے سے خریدا جا سکے۔ جسم کے خرید وفروخت سے حصولِ محبت کو علاقہ نہیں۔''

ن.م. راشد کے نزدیک ایسے سماج میں جہاں استحصالِ محبت ہو، جہاں انسان کی محبت اپنی آزاد تخلیقی محبت ہونے کے بجائے کسی دوسرے کے فائدے یا اقتدار و سرمایہ کے تابع ہو، آزاد محبت یا آزاد شخصیت کا ارتقا ممکن نہیں۔ ایسے سماج میں جہاں شخصیت کے اُبھرنے نکھرنے اور پروان چڑھنے کے مساوی مواقع نہ ہوں، محبت کا رشتہ اس سوسائٹی میں کبھی فروغ نہیں پا سکتا۔ محبت سے مراد انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی۔ ان کے نزدیک زندگی کی سب سے بڑی دولت اور رعنائی انسان کی محبت ہے جس نے ساری زندگی کی رعنائیاں پیدا کی ہیں۔ گویا ن.م. راشد کے نزدیک محبت انسانی بقا اور نشوونُما کے لئے کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ ن۔م۔ راشد کی سیاسی، جنسیاتی یا عالمی شاعری اور ان کی شاعری کی روح پر تبصرہ کرتے ہوئے پطرس بخاری نے ان کے مجموعۂ کلام ''ایران میں اجنبی'' کے دیباچے میں لکھا ہے:

''آپ کا سیاسی شاعروں میں شمار کرنا کورذَوقی معلوم ہوتا ہے۔ کسی نازک مزاج کی تشفّی اس سے ہرگز نہ ہوگی کیوں کہ اکثر مقام ایسے ہیں جہاں ہر چند کہ آپ سیاست کے نَردبان پر کھڑے دکھائی دیتے ہیں لیکن آپ کی نظر اور بلندیوں پر پڑ رہی ہے اور روح کی بعض گہرائیاں آپ کو ایسی نظر آتی ہیں جو سیاست کی تہ سے عمیق تر ہیں۔ مثال کے طور پر ''کیمیا گر'' کو لیجیے۔ اس نظم کو سیاسی نظم کہہ کر ٹال دینا محض کسلِ مذاق ہے۔ یہ تو ایک مرثیہ ہے جو آپ نے خود پسند انسانوں پر لکھا ہے جو خود ہی اپنے زندانی ہو جاتے ہیں۔''

(دیباچہ: ایران میں اجنبی)

اس میں کوئی شک نہیں کہ راشد کئی لحاظ سے ایک جدید شاعر ہیں کیوں کہ ان کے سوچنے کا ڈھنگ اور اندازِ گفتگو نیا ہے۔ ان کے فکر و احساس میں ندرت اور انوکھا پن ہے اور پیش کش میں جدّت وانفرادیت۔ بعض نقّادوں نے اسی جدّت وانفرادیت کو بغاوت کا نام دے دیا ہے جو صحیح نہیں۔ یہ سچ ہے کہ راشد نے اردو شاعری کی روایات سے حسبِ ضرورت انحراف کیا لیکن یہ انحراف نہ تو فکر وفن کے اعتبار سے اور نہ موضوع واُسلوب کے لحاظ سے اتنا زیادہ ہے کہ اسے بغاوت کہا جا سکے۔ بغاوت تو کسی موجود نظام کو یکسر بدل دینے کی کوشش کا نام ہے۔

راشد کی شاعری دراصل جدید اردو شاعری کی بتدریج فکری وفنّی ارتقا کی منفرد منزل ہے جو نہ تو اردو شاعری کے موجودہ نظام کو یکسر تبدیل کرتی ہے اور نہ کوئی نیا نظام قائم کرتی ہے بلکہ راشد کے یہاں مروّجہ شاعری کے تمام آداب واطوار اور دل کشی ورعنائی ہے جو ایک نئے انداز میں ان کی نظموں میں عیاں ہوتی ہے۔ بقول، وقارعظیم:

''راشد کی شاعری پرانے طرز سے بغاوت نہیں بلکہ نئے اور پرانے طرز میں ایک خوش گوار سمجھوتہ ہے۔''

وقارعظیم مزید لکھتے ہیں:

''ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ہیئت اور فکر دونوں لحاظ سے انہوں نے قدیم راہوں سے انحراف کیا ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے صرف ایک چیز ہے جس کی طرف راشد کی شاعری پڑھ کر ذہن منتقل ہوتا ہے۔ شاعری کے پرانے قالب کو چھوڑ کر ایک نئے قالب کی جستجو۔ یہ قالب انہوں نے آزاد نظم میں حاصل کیا اور اسی کو اپنا لیا۔ لیکن اس نئے قالب اور نئی ہیئت کو اپنانے میں بھی راشد نے کہیں اردو شاعری کے روایتی ترنّم اور اس کی موسیقی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ راشد کی اس شاعری کے علاوہ بھی جوان کی شاعری کے ابتدائی دَور کی پیداوار ہے اور جس میں اردو کی قدیم روایتی ہیئت کی پابندی ہے ہمیں کسی نظم میں اس ترنّم کی کمی محسوس نہیں ہوتی جس کے لئے ہم اپنی پرانی شاعری کی طرف دیکھتے ہیں۔''

(اُردو میں نظم معرا اور آزاد نظم ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک، ص ۴۵۳، ۲۰۰۳ء)

ہیئت وآہنگ کے اعتبار سے بھی راشد کی آزاد نظموں پر پابندی کا نمایاں اثر نظر آتا ہے۔ چناں چہ ساخت کے اعتبار سے راشد کی نظمیں پابند ومعرا نظموں سے زیادہ مختلف نہیں۔ عام طور سے ان کی نظمیں تین چار رکنی مصرعوں کے التزام کے تحت مروجہ مثمّن ومسدّس بحروں کے تحت لکھی گئی ہیں۔ راشد مصرعوں کی تکرار اور قافیوں کے التزام سے کئی کام لیتے ہیں۔ مصرعوں کی تکرار کا انداز ''ماورا'' کی متعدد نظموں میں پایا جاتا ہے۔ ن۔م۔راشد کے کلام میں ایک مخصوص اُسلوب اور انفرادیت نظر آتی ہے اور یہ ان کے مزاج کی کارفرمائی اور شخصیت کی جلوہ گری معلوم ہوتی ہے۔ اپنے زبان وبیان اور نظموں کی تعمیر وتشکیل کے متعلق انہوں نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت امریکی یونی ورسٹیوں کے اردو طلبا کے ساتھ ایک انٹرویو میں ان الفاظ میں کی ہے:

''ہر شاعر کا اُسلوبِ بیان اس کی اپنی شخصیت کا پرتو ہوتا ہے۔ اس کی تعلیم وتربیت کا، اس کے ابتدائی ماحول کا، اس کی زندگی کے نشیب وفراز کا، غرض کہ اس کی کامل شخصیت کی پیداوار ہوتا ہے اور اس کی زبان بھی اس شخصیت کا ایک پہلو ہوتی ہے، میری نظموں میں فارسی الفاظ کی بھرمار شاید اس تعلیم وتربیت کا نتیجہ ہو جو بزرگوں کی غلطی سے مجھے حاصل ہوئی اور مروّجہ اصنافِ سخن سے میرا انحراف یا میرے خیالات وافکار ان اثرات کا نتیجہ جو میں نے اپنے استادوں اور اپنے احباب سے حاصل کیے۔ مجھے اس سے کوئی مفر نہیں، یہ سب میری شخصیت کا جزو ہیں۔''

راشد نے جدید اردو شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ''نئی شاعری نئے نفسی ماحول کی پیداوار ہے''۔ ظاہر ہے کہ راشد کی شاعری نئے نفسی ماحول کا تجزیہ پیش کرتی ہے۔ راشد نے نفسی ماحول کو اور اس ماحول سے پیدا ہونے والے رجحانات کو مختلف علامتوں کے ذریعے پیش کیا ہے۔

راشد کے یہاں جہاں شعری علامتیں تاریخ، تہذیب اور بیش تر اساطیری دَور کی مثالیں پیش کرتی ہیں، وہیں جدید دَور کی مختلف تہذیبی و تمدّنی علامتیں قاری کے ذہن کو سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ راشد کی شاعری میں سبا و سلیمان، نمرود اور سومنات کا تعلق تاریخ سے ہے تو دیو، آئینہ اور سمندر اساطیری علامتیں ہیں جب کہ آگ، صحرا اور ریت کا تعلق تہذیب سے ہے۔ انھوں نے ''حسن کوزہ گر، اندھا کباڑی، پیرزن، اجنبی عورت، کیمیا گر، درویش'' وغیرہ علامتوں کو استعمال کر کے اردو شاعری کو نئی فکر سے روشناس کرایا ہے۔ ن۔م۔ راشد نے اپنی کئی نظموں میں لرزشیں، بحرِ بے کراں اور سکون جیسی علامتوں کا استعمال کر کے نظم میں خارجی و داخلی مشاہدے کی دعوت دی ہے۔ ''اجنبی عورت'' میں دیوارِ ظلم اور دیوارِ رنگ، مشرق و مغرب کی تہذیبی، تمدنی اور سیاسی افتراق کے تصوّر کی علامتیں ہیں۔ ''ماورا'' کی آخری نظم ''خودکشی'' میں دیوار، تیرگی، ساتویں منزل اور دریچے انسان کی خارجی و داخلی اور حال و مستقبل کی کش مکش کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

﴿۲﴾ ''ماورا'' کی نظمیں: ''ماورا'' ن.م. راشد کی شاعری کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کے شائع ہوتے ہی ادبی دنیا میں تعریف و تنقیص اور تحقیق کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کسی نے اسے ہیئت سے انحراف کہا تو کسی نے اسے قدیم اسالیب سے بغاوت کا نام دیا۔ کچھ مفکّرینِ ادب نے اس کی خامیوں کی طرف اشارہ کیا تو کچھ نے اس کی خوبیوں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی۔ ماورا کی اشاعت ۱۹۴۱ء میں ہوئی۔ اس میں کل ۳۷ نظمیں شامل ہیں۔ اس مجموعے کی ابتدائی نظموں میں رومانیت کا رنگ غالب ہے۔ اس کی ایک وجہ اختر شیرانی کی رومانی نظموں کے اثرات بھی ہیں۔ اس مجموعے کی نظموں کے مطالعے سے ایسا لگتا ہے کہ شاعر ایک رومانی دنیا بسانے میں مصروف ہے۔

ماورا کی نظمیں رومانیت کے ساتھ ساتھ شاعر کے اُداس و غمگین ہونے کی بھی غمازی کرتی ہیں۔ ماورا کی پہلی نظم ''میں اسے واقفِ اُلفت نہ کروں'' رومانی انداز سے شروع ہوتی ہے۔ اس مجموعے کی ابتدائی نظمیں ''خواب کی بستی، لارنس باغ میں، بادل اور ستارے'' پوری طرح رومانیت کا احساس لیے ہوئے ہیں لیکن ''مکافات، اتفاقات اور آسمان'' میں راشد رومانی اور خیالی دنیا سے باہر نکلنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ ''حُزنِ انسان، گناہ، طلسمِ جاوداں، ہونٹوں کا لمس، ایک رات اور اظہار'' ایسی نظمیں ہیں جن میں جنسیت غالب نظر آتی ہیں۔ غالباً اسی کی وجہ سے راشد پر بعض نقادوں نے فحاشی کا الزام لگایا اور راشد نے ان کے جوابات بھی دیے۔

''رُخصت، خواب کی بستی، گناہ اور محبت، ستارے'' ماورا کی وہ نظمیں ہیں جو عنفوانِ شباب، تخیلی تحریکات اور روایاتی عشق کی کش مکش کے ساتھ ساتھ پاکیزہ دُنیا کا تصوّر بھی پیش کرتی ہیں۔ ''خودکشی'' ماورا میں ن۔م۔ راشد کی شاعری کے مذکورہ رجحانات کی انتہائی کڑی کہی جا سکتی ہے۔ گو کہ راشد پر روایت سے انحراف اور دوسرے متعدد طرح کے الزامات لگائے جاتے رہے لیکن ''ماورا'' کے دیباچے میں ن.م. راشد نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں کس قدر روایت کی اہمیت کا احساس ہے۔ حالاں کہ قدیم اسالیب سے قدرے بغاوت کرنے کے باوجود ان کے ذہن کی استقامت اور شعور کی صحت کی دلیل دیباچے کی ان سطور سے ظاہر ہے۔ کہتے ہیں:

''لامحالہ ادبیات میں نئے اصنافِ سخن کا رائج کرنا بہ نفسہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں اور کبھی کسی ادیب کو یہ اُمید بھی نہیں رکھنی چاہیے کہ اس کو صرف اس وجہ سے ادبیات میں کوئی پائندہ حیثیت نصیب ہوگی کہ اس نے

نئے اصنافِ سخن کی تلاش کی یا ان کی ترویج میں کسی جدّت کا مظاہرہ کیا۔ قافیوں کو قدما کے اصول کے خلاف ترتیب دینا۔ مصرعوں کے ارکان میں کمی وبیشی کرنا یا بندوں کی ترکیب میں کسی اصول شکنی سے کام لینا یقیناً ایک سطحی حرکت ہے کیوں کہ قابلِ فخر بات تو صرف یہ ہے کہ اولاً خیالات وافکار میں اجتہاد ہو پھر یہ نئے خیالات اور افکار اُسلوبِ بیان کے ساتھ اس قدر مکمل طور پر ہم آہنگ ہوں کہ اس ہم آہنگی سے ادیب کی انفرادیت آشکارا ہو سکے۔ اصنافِ سخن یا ہیئتِ شعری میں جدّت ادبیات کے دریائے بے کراں کی ادنیٰ معاون ہو سکتی ہے لیکن دریا کو اس کے بغیر بھی بہنا آتا ہے.... میری رائے میں جہاں تکنیک کی قیود کی متعصّبانہ حمایت ایک فرسودہ قدامت پرستی کی دلیل ہے وہاں اس کے خلاف مجنونانہ احتجاج بہت بڑی حد تک بے راہ روی کے مترادف ہے۔''

(دیباچہ ماورا، ص ۲۷، بحوالہ حنیف کیفی، اردو میں نظمِ معرا اور آزاد نظم ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک ۲۰۰۳ء)

راشد کے اس خلاصے کے بعد اب کوئی سنجیدہ نقّاد انہیں پوری طرح باغی یا انحراف پسند نہیں کہے گا۔ جن لوگوں نے راشد کے ابتدائی کلام میں انفعالیت اور دیگر منفی خیالات کا اظہار کیا ہے انہیں راشد کے خیال سے صرف ایک کسری نقطے یا (Minus Point) کی حیثیت حاصل ہے۔ اولاً تو سنجیدہ ادیب اور ادب کے سنجیدہ طلبا کو ''ماورا'' کی کچّی نظموں کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔ بقولِ حمید نسیم اسے راشد کا زمانۂ مشق قرار دے کے عجائب گھر میں رکھ دینا چاہیے جہاں پرانی تہذیب کے آثار (جو مٹ چکی ہے صرف دید کی خاطر رکھ دیے جاتے ہیں مگر انہیں ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں ہوتی) رکھے جاتے ہیں۔ کل ملا کر راشد کا پہلا شعری مجموعہ ''ماورا'' باوجود کچھ خامیوں کے جدید شاعری کی منزل تک پہنچنے کے لئے ایک شاہ راہ بنانے کی دانستہ کوشش ہے۔

03.05 نظم ''دریچے کے قریب'' متن

جاگ اے شمعِ شبستانِ وصال!
محفلِ خواب کے اِس فرشِ طرب ناک سے جاگ!
لذّتِ شب سے ترا جسم ابھی چُور سہی
آ مری جان! مرے پاس دریچے کے قریب
دیکھ کس پیار سے انوارِ سحر چومتے ہیں
مسجدِ شہر کے میناروں کو
جن کی رفعت سے مجھے
اپنی برسوں کی تمنّا کا خیال آتا ہے!
سیمگوں ہاتھوں سے اے جان! ذرا
کھول مے رنگ، جُنوں خیز آنکھیں!

اسی مینار کو دیکھ
صبح کے نور سے شاداب سہی
اسی مینار کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے
اپنے بےکار خدا کے مانند
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہوا مُلاّ ے حزیں
ایک عفریت............اُداس
تین سو سال کی ذِلّت کا نشان
ایسی ذِلّت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی!
دیکھ بازار میں لوگوں کا ہجوم
بے پنہ سَیل کے مانند رواں!
جیسے جِنّات بیابانوں میں
مشعلیں لے کے سرِ شام نکل آتے ہیں!
ان میں ہر شخص کے سینے کے کسی گوشے میں
ایک دلہن سی بنی بیٹھی ہے
ٹمٹماتی ہوئی ننھی سی خودی کی قندیل
لیکن اتنی بھی توانائی نہیں
بڑھ کے ان میں سے کوئی شعلۂ جوّالہ بنے!
ان میں مفلس بھی ہیں، بیمار بھی ہیں
زیرِ افلاک مگر ظلم سہے جاتے ہیں
ایک بوڑھا سا، تھکا ماندہ سا رہ وَار ہوں میں!
بھوک کا شاہ سوار
سخت گیر اور تنومند بھی ہے
میں بھی اس شہر کے لوگوں کی طرح
ہر شبِ عیش گزر جانے پر
بہرِ جمعِ خس و خاشاک نکل جاتا ہوں

چرخِ گرداں ہے جہاں
شام کو پھر اسی کاشانے میں لوٹ آتا ہوں
بے بسی میری ذرا دیکھ کہ میں
مسجدِ شہر کے میناروں کو
اس دریچے میں سے پھر جھانکتا ہوں
جب اِنہیں عالمِ رخصت میں شفق چومتی ہے!

03.06 نظم ''دریچے کے قریب'' کا تجزیہ

آپ نے ن.م.راشد کے حالات، رجحانات اور انفرادیت کے متعلق مطالعہ کیا۔ آپ یہ بھی جان چکے ہیں کہ ن.م.راشد کے چار شعری مجموعے''ماورا، ایران میں اجنبی، لاانسان اور گمان کا ممکن'' شائع ہو چکے ہیں۔ چاروں مجموعوں میں متعدّد ایسی نظمیں ہیں جن پہ مختلف نقطۂ نظر سے نقد و تبصرے اور تجزیے مختلف تناظر میں کیے جاتے رہے ہیں۔ یہاں ان کے پہلے شعری مجموعے''ماورا'' کی ایک نظم''دریچے کے قریب'' زیرِ بحث ہے۔

''دریچے کے قریب'' ن.م.راشد کی اُن معروف نظموں میں سے ایک ہے جن کا تانا بانا علامتی ہے۔ اردو کی بعض ایسی نظمیں ہیں جن میں گہرے علامت کا تصوّر پایا جاتا ہے اُن میں سے ایک''دریچے کے قریب'' بھی ہے جس میں فکری گہرائی، صوتی دل کشی، تاریخی و تہذیبی انحطاط اور حُزنیہ آہنگ کی آمیزش ہے۔''دریچے کے قریب'' کے متعلق ۱۹۴۱ء میں کسی موقعے پر فیض احمد فیضؔ نے اسے اس دَور کی بڑی نظم کہا تھا۔ نظم میں شاعر کے شعور اور وجدان میں وہی حتمیت نظر آتی ہے جو بعد کے شعری مجموعوں کی معروف نظموں میں ملتی ہے۔

ابتدائی طور پر اس نظم میں آزادی سے قبل کے شہر کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس نظم میں جس شہر کی منظر کشی کی گئی ہے وہ شدید بے بسی اور بے حسی کی تصویر ہے۔ واضح رہے کہ آزادی سے قبل جنوبی ایشیا کے اکثر شہروں کا یہی حال تھا۔ گویا شہر بے بسی کا شکار اور اس کا شہری یا ناظر (شاعر) خود بھی بے کسی اور بے حسی سے نڈھال ہے۔ اس شہر کا ہر دن لا حاصلی کا نہ ختم ہونے والا ایسا چکّر ویوہ ہے جس سے نکلنا مشکل ہے۔

اس نظم میں راشد نے اقبالؔ کی تلمیحات سے استفادہ کیا ہے۔ لگتا ہے کہ راشد نے اپنے ہم عصر ترقی پسند شعرا مثلاً جوشؔ اور احسانؔ دانش وغیرہ کی طرح آزادی سے قبل غلام قوم کی اچھوتے انداز سے تصویر پیش کی ہے۔ اس زمانے کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی زوال کی مثال ''دریچے کے قریب'' کا شہر ایک زندۂ جاوید مثال ہے۔ یہ شہر استعماری اور استبدادی گرفت کی وجہ سے بے یقینی، بے سمتی اور حال و مستقل کی روشنی کے بغیر زندہ ہے۔ اس شہر کے لوگوں کے جسموں میں جان تو ہے، ان میں خودی بھی ہے اور مستقبل سے شکایت بھی مگر اتنی ہمت نہیں، اتنی توانائی نہیں کہ وہ اپنے دل کی روشنی سے کوئی شعلۂ جوّالہ بنا سکیں۔ شاعر اس کی منظر کشی کرتے ہوئے اشارہ کرتا ہے:

دیکھ بازار میں لوگوں کا ہجوم
بے پناہ سیل کے مانند رواں
جیسے جنات بیابانوں میں

مشعلیں لے کے سرِ شام نکل آتے ہیں
ان میں ہر شخص کے سینے کے کسی گوشے میں
ایک دلہن سی بنی بیٹھی ہے
ٹمٹماتی ہوئی ننھی سی خودی کی قندیل
لیکن اتنی بھی توانائی نہیں
بڑھ کے اُن میں سے کوئی شعلۂ جوالہ بنے!

گویا شہر کے لوگ اس قدر اذیت کے عادی ہو چکے ہیں کہ پستی سے نجات پانے کے لئے ان کے اندر نہ کوئی خواہش ہے نہ کوئی تمنّا اور نہ کوئی خیال، صرف ان میں زندہ رہنے کا سطحی جذبہ ہے اور وہ بھی محدود۔ بہتر تبدیلی اور روشن مستقبل کا کوئی نشان نہیں۔ اس نظم کا ناظر یہ سب کچھ سمجھنے کے باوجود حرکت وعمل سے عاجز ہے۔ اسے اپنی بے بسی اور بے چارگی پر رحم آتا ہے۔ وہ حرکتِ نفسی اور حرکتِ طبعی دونوں سے محروم ہے لیکن اس کے دل میں کبھی کبھی تبدیلی لانے والی فکر کی لہریں موج زَن ہوتی ہیں مگر وہ اس فکر کو مجتمع کر کے پھیلانے کا اور اس سے کام لینے کا ہنر نہیں جانتا۔ نظم کی ساخت پر بھی اگر ہم غور کریں تو ظاہر ہوتا ہے کہ ناظر (شاعر) بوقتِ صبح انوارِ سحر میں اور بوقتِ شام شفق میں ڈوبے ہوئے ان میناروں کو دیکھتا ہے۔ بظاہر اس کی کوئی معنویت نہیں کوئی، حرکت نہیں، جمود ہی جمود ہے لیکن پھر بھی دن کے آغاز اور انجام پر وہ مینار کو ضرور دیکھتا ہے اور دل ہی دل میں اپنی بے بسی پر ملامت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں پھر سے یہ مینار دیکھ رہا ہوں۔ نظم میں شاعر کو تہذیبی لا شعور اور کوئی غیبی مدد یا طاقت اسے اس جانب دیکھنے کو کہتی ہے۔

نظم ''دریچے کے قریب'' میں مینار تمثیل اور علامت دونوں کے طور پر استعمال ہے۔ ایک طرف اس سے بے حس و حرکت شے مراد ہے تو دوسری طرف یادِ ماضی۔ اسی لئے شاعر جو میناروں کو نہیں دیکھنا چاہتا مگر اس کی بے بسی اسے دیکھنے پر مجبور کرتی ہے، اگر چہ یہ مینار اس کے لئے کوئی زندۂ جاوید شے نہیں بلکہ محض یادگارِ ماضی ہے۔ اُنہی میناروں کے نیچے ''مُلّائے حزیں'' بھی سکونت پذیر ہے جسے مجہولیت، لاعینیت اور ذلّت کی علامت کہا گیا ہے۔ گویا خارجی طور پر تو میناروں پر روشنی ہے مگر باطنی طور پر اُن کے نیچے ''مُلّائے حزیں'' اندھیرا پھیلا رہا ہے۔ اُسے زندگی، حرکت اور روشنی سے کوئی مطلب نہیں ہے۔

شاعر نے مسجد کے میناروں کو ایک فرسودہ روایت کی اہم علامت کے طور پر استعمال کیا ہے جس کی تین سوسال کی ذلت کا نشان اس مسجد کے کسی تاریک حجرے میں رہتا ہے۔ تین سوسال اور خودی دونوں تمثال تاریخی تناظر پیش کرتے ہیں۔ یہاں راشد کی صناعی قابلِ تعریف ہے۔ کلاسیکی ادبی سرمائے سے حوالے لینے کا ایسا ہنر راشد سے پہلے کسی شاعر نے استعمال نہیں کیا تھا۔ اگر اپنی کلاسیکی روایت سے اُسلوبی اور فکری دونوں سطح پر پوری واقفیت ہو تو یہ حوالے شعری جمالیات میں اضافہ کرتے ہیں۔ راشد نے ایسے اُسلوب کو روا رکھ کر روایات کو احتساب کی نظر سے دیکھا ہے۔ اگر چہ راشد کے یہاں علامتوں کا تعلق موجودہ معاشرتی زندگی سے ہے لیکن بعض علامتیں اتنی وسیع ہیں کہ وہ کسی خاص ماحول کی نمائندگی کرتے ہوئے یا کسی خاص خطے کے تاریخی تعلق کو بتانے کے بجائے عالم گیر حیثیت کی حامل ہو جاتی ہیں۔

03.07 خلاصہ

اس اکائی میں آپ نے اردو کے مشہور شاعر اور جدید نظم کے بانیوں میں سے ایک ن۔م۔راشد (نذر محمد راشد) کی نظم نگاری کی انفرادیت، حالاتِ زندگی اور اُن کی شاعری پر اثر انداز ہونے والے عناصر کے ساتھ ساتھ اُن کی معروف نظم ''دریچے کے قریب'' کا مطالعہ کیا۔ اردو میں اصنافِ نظم میں باضابطہ جدید رجحانات کا آغاز ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد ہوا۔ بعدازاں شعرا نے عصری مسائل اور مختلف عنوانات کے تحت نظمیں لکھنی شروع کیں۔

بیسویں صدی کے اوائل میں کئی ادبی تحریکوں نے جنم لیا۔ خاص طور سے اردو اصنافِ ادب کو دو تحریکوں نے بہت زیادہ متاثر کیا جن میں ایک ''ترقّی پسند تحریک'' ہے اور دوسری کو ''حلقۂ اربابِ ذوق'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ن۔م۔راشد کے بعض ہم عصران دونوں میں سے کسی نہ کسی تحریک سے وابستہ رہے لیکن باوجود ان کے اثرات قبول کرنے کے ن.م.راشد نے کسی تحریک کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا۔

ن۔م۔راشد کا اصل نام نذر محمد تھا جو ان کی تاریخِ پیدائش سے نکالا گیا تھا لیکن بعد میں وہ نذر محمد راشد (ن.م.راشد) سے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کا آبائی وطن ضلع گوجرانوالہ کا ایک قصبہ اکال گڑھ ہے جہاں وہ یکم اگست ۱۹۱۰ء کو پیدا ہوئے۔ راشد کے والد ماجد کا نام راجا فضلِ الٰہی چشتی تھا اور دادا ڈاکٹر غلام رسول تھے جو عربی فارسی اور اردو کے اچھے شاعر تھے اور غلامی تخلص رکھتے تھے۔ راشد نے ۱۹۲۶ء میں میٹرک، ۱۹۲۸ء میں ایف۔اے اور ۱۹۳۲ء میں ایم۔اے پاس کیا۔ راشد اسکول اور کالج کے زمانے سے ہی ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ ان کی نگارشات میں نظمیں اور غزلیں دونوں شامل تھیں ''تفریح''، بجنور اور ''کائنات''، پانی پت میں شائع ہوتی رہیں۔ کالج کی بزمِ سخن کے سکریٹری رہے۔ رسمی اسناد کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے فرانسیسی زبان سیکھی اور منشی، فاضل بھی کیا۔

ن.م.راشد حصولِ معاش کے لئے ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۴ء تک سرگرداں رہے۔ اس درمیان کئی رسالوں کی ادارت کی۔ ملتان میں کمشنر کے دفتر میں کلرک رہے اور پھر آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء تک کئی ممالک میں عارضی طور پر بحیثیتِ فوجی آفیسر خدمات انجام دیں۔ ۱۹۴۹ء میں ریڈیو پاکستان، کراچی کے ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز بنائے گئے۔ ن۔م۔راشد ۱۹۵۲ء سے ۱۹۷۴ء تک اقوامِ متحدہ سے منسلک رہے۔ اس دوران نیویارک، جکارتا اور تہران میں اپنی خدمات انجام دیں۔ سبک دوش ہونے کے بعد لندن میں مستقل طور پر مقیم ہو گئے اور وہیں ۹/اکتوبر ۱۹۷۵ء کو انتقال ہوا۔

ن.م.راشد کی شاعری میں مغربی و مشرقی مکتبِ فکر کے فلسفیوں کا اثر نمایاں ہیں۔ ان کی شاعری پر ملک، بیرونِ ملک اور عالمی سطح کے مختلف واقعات و تحریکات نے بھی اثر ڈالا۔ ن.م.راشد کا پہلا مجموعہ ''ماورا'' کے نام سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔ اُن کا دوسرا مجموعہ ''ایران میں اجنبی'' ۱۹۵۵ء میں، تیسرا مجموعہ ''لا انسان'' ۱۹۶۷ء میں اور چوتھا مجموعہ ''گمان کا ممکن'' ۱۹۷۶ء میں اُن کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ ن.م.راشد نے جدید فارسی شعرا کے حالاتِ زندگی اور نظموں پر جدید فارسی کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ ن.م.راشد کی شاعری کا آغاز رومانی شاعری کے طور پر ہوا لیکن بہت جلد اُنہوں نے جدید نظم میں اپنی انفرادیت قائم کر لی۔ نظمِ جدید میں ن.م.راشد نے ہیئت اور اسلوب دونوں حیثیت سے نئے تجربات کیے اور اردو کو بہت نادر و نایاب نظمیں عطا کیں۔

ن.م.راشد نے نئی شاعری کو نئے نفسی ماحول کی پیداوار کہا ہے۔ان کے یہاں بہت سی شعری علامتیں ایسی ملتی ہیں جن کی جڑیں تاریخ اور تہذیب کے ساتھ ساتھ اساطیری دَور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ایسی نظمیں قاری کو خارجی وداخلی مشاہدے کی دعوت دیتی ہیں۔ان کے پہلے مجموعے'' ماورا'' سے ماخوذ ایک نظم ' دریچے کے قریب'' کا آپ نے مطالعہ کیا۔'' دریچے کے قریب'' راشد کی معروف علامتی نظموں میں سے ایک ہے جس میں فکری گہرائی،صوتی دل کشی،تاریخی وتہذیبی انحطاط اور حُزنیہ آہنگ کی آمیزش ہے۔فیض احمد فیضؔ نے' دریچے کے قریب' نظم کو اردو کی معروف اور بڑی نظموں میں شمار کیا ہے۔'' دریچے کے قریب''نظم میں انحطاط پذیر شہر اور اذیت کے عادی شہریوں کی علامتی انداز سے پیش کش کی گئی ہے۔ان کے اندر نہ کوئی خواہش ہے نہ کوئی تمنّا اور نہ مستقبل کا خیال بس سطحی طور پر زندہ رہنے کا ایک جذبہ ہے۔

نظم میں صبح وشام میناروں کو دیکھ کر شاعر کے اندر جمود کا احساس ہوتا ہے لیکن باوجود جمود اور بے حسی کے نشانی کے طور پر شاعر تہذیبی لا شعور کی سطح پر اسے دیکھتا ہے۔کل ملا کر یہ نظم راشد کی بہترین نظموں میں سے ایک نظم کہی جا سکتی ہے جس میں بعض ایسی علامتیں استعمال کی گئی ہیں جو کسی خاص خطے کی ہوتے ہوئے بھی عالم گیر حیثیت کی حامل ہیں۔

03.08 فرہنگ

آمریت	:	آمر یا ڈکٹیٹر کا عہدہ، کلی اختیار	رجحانات	:	رجحان کی جمع، میلان، توجہ
اتصال	:	میل ملاپ، قرب، نزدیکی، جڑا ہونا	صناعی	:	کاری گری، ہنرمندی
اجتہاد	:	جدوجہد، کوشش کرنا، ٹھیک راہ ڈھونڈنا، غوروخوض سے کسی مسئلے کا حل نکالنا	عمیق	:	گہرا
			فرسودہ	:	گھسا ہوا، پھٹا ہوا، پرانا، خستہ حال
اساطیر	:	اسطارہ اور اسطورہ کی جمع، قصے کہانیاں	کساد بازاری	:	بازار میں خرید وفروخت کا نہ ہونا، مندا ہونا
اسالیب	:	اسلوب کی جمع، انداز، ڈھنگ	کسلِ مذاق	:	میلان یا رجحان یا سلیقے کی کمزوری
اِفتراق	:	جدائی پیدا کر دینا، جدائی، اختلاف	لاعینیت	:	بے حقیقت، جو اصل حقیقت نہ ہو
انحراف	:	پھر جانا، انکار، مخالفت، نافرمانی	مابعدالطبیعات	:	الٰہیات، فوق الفطرت
بحران	:	تعطل، بیماری کے زور کا دن	متعدّد	:	کئی، بہت سے
تغذیہ	:	غذا دینا، پرورش کرنا، خوراک، غذا	متنوّع	:	قسم قسم کا، کئی طرح کا
تولید	:	پیدا کرنا، جننا، پیداوار	مثمّن	:	وہ نظم جس کے ہر بند میں چھ مصرعے ہوں
جہات	:	جہت کی جمع، سمتیں، طرفین	مثبت		درست، ٹھیک، اچھی
حزن	:	رنج، ملال، غم	مجہولیت	:	سستی، کاہلی، نکمّا پن، نامعقولیت
حزنیہ	:	دردناک واقعہ، المیہ، ایسی نظم یا ڈراما جس کا انجام ہولناک ہو	مستعملات	:	عمل میں لایا ہوا، کام میں لایا ہوا
			مسدّس	:	وہ نظم جس کے ہر بند میں چھ مصرعے ہوں
خس وخاشاک	:	کوڑا کرکٹ، گھاس پات، برا بھلا	مظہر	:	ظاہر ہونے کی جگہ، جائے ظہور
خلفشار	:	گڑبڑ، اتھل پتھل	مکافات	:	عوض، بدلہ، تاوان، پاداش، سزا، انتقام

03.09 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ : ن.م.راشد کی رومانیت پر تبصرہ کیجیے۔

سوال نمبر۲ : ن.م.راشد کی ملازمت پر ایک مضمون لکھیے ۔

سوال نمبر۳ : ن.م.راشد کی تعلیم وتربیت پر اظہارِ خیال کیجیے۔

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ : ن.م.راشد کی سوانحِ حیات تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۲ : ن.م.راشد کی شاعری کے اہم نکات بیان کیجیے۔

سوال نمبر۳ : نظم ''دریچے کے قریب'' کا تجزیہ اپنے الفاظ میں کیجیے۔

03.10 حوالہ جاتی کتب

۱۔ کلیاتِ راشد	از	ن۔م۔راشد
۲۔ پانچ جدید شاعر	از	حمید نسیم
۳۔ اردو میں نظمِ معرا اور آزاد نظم ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک	از	حنیف کیفی
۴۔ ادب اور شعور	از	ممتاز حسین
۵۔ جدید نظم: حالؔی سے میراجی تک	از	کوثر مظہری
۶۔ تاریخ ادبِ اردو ''جلد چہارم''	از	سیّدہ جعفر
۷۔ ن م راشد ایک تجزیاتی مطالعہ	از	عنبر بن منیر
۸۔ نظمِ جدید کی کروٹیں	از	وزیر آغا
۹۔ لاانسان، ن.م.راشد	از	تبسم کاشمیری

✵

اکائی 04 : فیضؔ احمد فیضؔ ''یاد، تنہائی''

ساخت :

04.01 : اغراض و مقاصد
04.02 : تمہید
04.03 : فیضؔ احمد فیضؔ کے حالاتِ زندگی
04.04 : فیضؔ احمد فیضؔ کی نظم نگاری
04.05 : نظم ''یاد'' متن
04.06 : نظم ''یاد'' تجزیہ
04.07 : نظم ''تنہائی'' متن
04.08 : نظم ''تنہائی'' تجزیہ
04.09 : خلاصہ
04.10 : فرہنگ
04.11 : سوالات
04.12 : حوالہ جاتی کتب

04.01 اغراض و مقاصد

اِس اکائی میں آپ فیضؔ احمد فیضؔ کی حیات، تعلیم و تربیت، شخصیت، ملازمت، ادبی کارناموں، نظم نگاری، اُس کی خصوصیات اور اُن کی شاملِ نصاب دو نظموں ''یاد'' اور ''تنہائی'' کا مطالعہ کریں گے ساتھ ہی ساتھ اُن نظموں کا تجزیہ بھی پڑھیں گے۔ اِس اکائی کے مطالعے سے فیضؔ کی شاعری کے پس منظر کا بھی علم ہو سکے گا اور اردو شاعری میں خصوصاً اردو نظم گاری میں اُن کی اہم اور نمایاں شاعرانہ خدمات، حیثیت، مقام و مرتبے اور فنّی خصوصیات سے متعلق معلومات حاصل کر سکیں گے۔

04.02 تمہید

بیسویں صدی میں ترقی پسند تحریک سے متعلق جتنے بھی شعرا ہوئے ہیں اُن میں ایک ممتاز نام فیضؔ احمد فیضؔ کا ہے۔ فیضؔ کو سب سے زیادہ قبولیتِ عام اور شہرتِ دوام کا درجہ حاصل رہا ہے۔ اقبالؔ کے بعد فیضؔ ہماری زبان کے دوسرے شاعر ہیں جنھوں نے غزل اور نظم دونوں کی طرف توجہ دی اور دونوں میں امتیاز حاصل کیا لیکن اقبالؔ ہی کی طرح فیضؔ بھی پیامی شاعر ہیں۔ غزل فلسفہ و پیغام کی پوری طرح متحمل نہیں ہو سکتی اسی لئے اکثر شعرا کو چاروناچار نظم کا سہارا لینا پڑا۔ فیضؔ نے بھی اِس تبدیلی پر لبیک کہا۔

ایسے دَور میں فیضؔ نے اُس نئے احساس کو اپنی شاعری میں ادا کرنے کی کوشش کی جو نئی نسل کو زندگی کے بدلتے ہوئے تجربات سے حاصل ہو رہا تھا۔ اُن کے اِس طرزِ احساس میں بہت کچھ منفرد و مختلف اور بہت کچھ نیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سے نظم کا دامن وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑنے کے بعد سے نظم میں سیاسی، سماجی، معاشی اور دیگر خیالات بھی جگہ پانے میں کامیاب ہو رہے تھے۔ چوں کہ فیضؔ بھی اُسی تحریک سے وابستہ تھے اِس لئے فیضؔ کے یہاں بھی یہ سارے مضامین نظم میں دَر آئے ہیں۔ فیضؔ ترقی پسند تحریک کے نمائندہ شاعر ہیں۔

04.03 فیض احمد فیضؔ کے حالاتِ زندگی

فیض احمد فیضؔ کا نام فیض احمد خاں تھا۔ پردادا کا نام سربلند خاں اور دادا کا نام صاحب زادہ خاں تھا۔ فیض احمد فیضؔ کی بہن بی بی گُل کا کہنا ہے کہ کسی زمانے میں ایک راج پوت راجا ہوا کرتا تھا۔ اُس کا نام سین پال تھا۔ اُس کا تعلق سہارن پور سے تھا۔ اُس کی اولاد میں سے ایک نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اُن کے والد کا تعلق اُسی شاخ سے ہے۔ فیضؔ کے والد کا نام سلطان بخش تھا لیکن اُنھوں نے خود اپنا نام بدل کر سلطان محمد خاں کر لیا اور اُسی نام سے مشہور ہوئے۔ سلطان محمد خاں نے افغانستان میں ۱۳؍ برس ملازمت کی اور امیر عبدالرحمٰن کی بھتیجی اور سردار محمد رفیع خاں کی بیٹی سائرہ خاں سے شادی کی لیکن شادی کے دو سال بعد اُن کا انتقال ہو گیا۔ سلطان محمد خاں شان دار شخصیت کے مالک تھے۔ ملکہ وکٹوریہ کی بھاذاتی ڈاکٹر مس ہیملٹن نے اپنے ایک ناول میں اُن کا ذکر کیا ہے۔

افغانستان سے آنے کے بعد سلطان محمد خاں نے لندن سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور سیال کوٹ کے مشہور بیرسٹر بن گئے۔ علامہ اقبالؔ، سر عبدالقادر، ڈاکٹر ضیاء الدین، سید سلیمان ندوی اور دیگر ادبی لوگوں کی صحبت نے اُن کے ادبی ذوق کو نکھارا۔ وہ علی گڑھ یونی ورسٹی کے کورٹ ممبر، انجمنِ اسلامیہ سیال کوٹ کے صدر اور انجمن حمایت الاسلام کی انتظامیہ کے سرگرم رکن تھے۔ اُنھوں نے افغانستان کے دستوری قوانین اور امیر عبدالرحمٰن کی سوانحِ عمری انگریزی میں لکھی تھی۔ اپنی بیوی کے انتقال کے بعد اُنھوں نے عدالت خاں کی صاحب زادی سلطان فاطمہ سے دوسری شادی کی۔ سلطان فاطمہ سے ہی فیضؔ پیدا ہوئے۔

اپنی تاریخ پیدائش کے بارے میں فیضؔ خود کہتے ہیں:

''تاریخِ پیدائش اسکول کے کاغذات میں ۷؍ جنوری ۱۹۱۱ء اور کہیں ۷؍ جنوری ۱۹۱۲ء درج ہے۔ سیال کوٹ کے دفترِ بلدیہ کے ریکارڈ میں ۱۳؍ فروری ۱۹۱۱ء تاریخِ پیدائش درج ہے۔''

فیض احمد فیضؔ قصبہ قادر ضلع سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ اپنے والدِ محترم کے زمانے میں فیض نے بڑی خوش حال زندگی گزاری۔ فیضؔ نے اپنی تعلیم کا آغاز ۱۹۱۵ء میں چار سال کی عمر میں قرآنِ پاک کے حفظ سے کیا۔ (صرف تین پارے حفظ کر سکے۔ آنکھیں دُکھنے لگیں تو حفظ کرنا چھوڑ دیا)۔ ۱۹۱۶ء میں مولوی ابراہیم سیال کوٹی کے مکتب میں بٹھا دیے گئے جہاں فیضؔ نے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۱ء میں لاہور کے ایک مشن ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ ۱۹۲۷ء میں میٹرک فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا۔ ۱۹۲۹ء میں مرے کالج آف سیال کوٹ سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان بھی درجہ اول سے پاس کیا۔ ۱۹۳۱ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔اے اور عربی میں بی۔اے آنرز کیا۔ اس کے بعد ۱۹۳۳ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی میں ایم.اے اور ۱۹۳۴ء میں اورینٹل کالج لاہور سے عربی میں ایم.اے فرسٹ ڈویژن کی ڈگری حاصل کی۔

اِس طرح فیضؔ کی پوری تعلیمی زندگی درجہ اوّل پر منحصر ہے۔ والدِ محترم کے کہنے پر آئی۔سی۔ایس کے امتحان کی تیاری کرنے لگے۔ امتحان سے پہلے اُنہیں ہیضہ ہوگیا۔ اِس لئے امتحان نہ دے سکے۔ ۱۹۳۴ء میں تعلیم کا سلسلہ ختم ہوا۔ ۱۹۳۵ء میں امرِت سَر کے مسلم اینگلو اورینٹل کالج (ایم۔اے۔او) میں اُن کا تقرّر بحیثیتِ لیکچرار رہا۔ ۱۹۴۰ء میں لاہور کے ہیلی کالج میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے۔ فیضؔ اپنی قابلیت، نرم مزاجی اور شیریں گفتگو کی وجہ سے اپنے دوستوں میں بہت مشہور تھے۔ اُن کی قابلیت کی وجہ بچپن سے گہرا مطالعہ ہے۔ شخصیت، مزاج اور کردار کو تاب ناک بنانے میں اُن کے گھر والوں کا ہاتھ تھا۔ فیض احمد فیضؔ نے ایک انگریز خاتون مس ایلس جارج سے باقاعدہ اسلامی طریقے سے شادی کی۔ ایلس جارج، کرسٹنا بیل کی چھوٹی بہن تھیں۔ کرسٹنا بیل ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی بیوی تھیں جو ایم.اے.او کالج کے پرنسپل تھے۔ شیخ عبداللہ نے مہاراجا کشمیر کے محل میں اُن کا نکاح پڑھوایا۔

فیضؔ کی شادی عجیب ڈھنگ سے کشمیر میں ہوئی۔ بارات میں صرف دو آدمی فیضؔ کے بڑے بھائی طفیل احمد خاں اور ایک اہم دوست نعیم تھے۔ نکاح کے بعد بیگم و شیخ عبداللہ نے دولہا اور دلہن کی دعوت کی۔ دعوت کے بعد مشاعرہ ہوا جس میں جوشؔ اور مجازؔ نے شرکت کی۔ تین دن قیام کے بعد فیضؔ اور اُن کی بیگم لاہور آ گئے۔ فیضؔ کے والد نے ایلس کو باضابطہ دلہن بنایا اور اُن کا نام کلثوم رکھا۔ فیضؔ کی اولاد میں دو لڑکیاں ہیں۔ پہلی بیٹی سلیمہ ۱۹۴۲ء میں اور چھوٹی بہن منیزہ ۱۹۴۵ء میں پیدا ہوئیں۔ فیضؔ نے ۱۹۴۲ء میں درس وتدریس کے پیشے کو خیر آباد کہا اور فوج کی ملازمت اختیار کی۔ کیپٹن کے عہدے پر اُن کا تقرر ہوا تو وہ لاہور سے دہلی آ گئے۔ اُن کا تعلق فوج کے شعبۂ تعلقاتِ عامہ سے تھا۔ ۱۹۴۳ء میں میجر اور ۱۹۴۴ء میں کرنل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں فوج سے استعفیٰ دے کر لاہور چلے گئے جہاں انگلش روزنامہ ''پاکستان ٹائمز'' سے وابستہ ہوگئے۔ اُس کے بعد روزنامہ ''اِمروز'' کے ایڈیٹر اور ہفت روزہ ''لیل ونہار'' کے چیف ایڈیٹر بھی رہے۔ قیامِ پاکستان کے تقریباً تین برس بعد ۱۹۵۱ء میں لیاقت علی خاں کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی سازش میں گرفتار کر لیے گئے۔ اُن کے ساتھ دوسرے فوجی افسر اور ترقی پسند تحریک کی اہم شخصیت سجاد ظہیر بھی گرفتار ہو گئے۔ یہ کیس ''راوَل پنڈی سازش مقدمہ'' کے نام سے مشہور ہوا۔ فیضؔ نے چار سال، ایک ماہ، گیارہ دن قید کی صعوبتیں اُٹھائیں۔ تقریباً تین مہینے ''قیدِ تنہائی'' کی سزا ہوئی۔ فیضؔ کی بیش تر نظمیں اُن کے زمانۂ قید کی یادگار ہیں۔ ''دستِ صبا'' کا زیادہ تر کلام قید کے زمانے میں لکھا گیا ہے اِسی لئے اُن کی شاعری پر زنداں کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ وہ قطعہ جو فیضؔ نے قید کے دَوران لکھا وہ اُن کے بلند حوصلے کا غماز ہے۔ جہاں ماتم نہیں بلکہ لوگوں کو بیدار کرنے کا جذبہ ہے:

متاعِ لوح وقلم چھن گئی تو کیا غم ہے؟   کہ خونِ دل میں ڈبولی ہیں اُنگلیاں میں نے
زباں پہ مُہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے   ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

۲۰/اپریل ۱۹۵۵ء کو قید سے رہا ہوئے۔ دوسری بار ۱۹۵۸ء میں سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار ہوئے اور یکم اپریل ۱۹۵۹ء میں رہائی نصیب ہوئی۔ ۱۹۵۹ء میں ہی فیضؔ پاکستان آرٹ کونسل لاہور کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ اِس خدمت پر وہ جون ۱۹۶۲ء تک فائز رہے۔ اِسی درمیان فیضؔ کو لینن اَمن پرائز ۱۹۶۱ء میں ماسکو میں دیا گیا۔ فیضؔ یہ انعام حاصل کرنے والے پہلے ایشیائی شاعر ہیں۔ اِس کے بعد وہ لندن چلے گئے۔ ۱۹۶۴ء میں فیضؔ، سرعبداللہ ہارون کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ستمبر ۱۹۶۸ء میں کراچی میں ادارہ ''یادگارِ غالب'' قائم کیا اور علامہ اقبالؔ پر فلم بنائی۔ ۱۹۷۲ء میں فیضؔ پاکستانی قومی ادبی اکادمی کے صدر مقرر ہوئے۔

۱۹۷۹ء میں بیروت کے انگریزی رسالے ''لوٹس'' کے ایڈیٹر بنے۔ ۱۹۸۱ء میں ہندوستان کے مختلف مقامات پر جشنِ فیض منایا گیا۔ ۱۹۸۴ء میں لندن میں فیض سیمینار ہوا جس میں فیض بذاتِ خود شریک تھے۔ ۱۹ر نومبر ۱۹۸۴ء کو اُن پر دمہ کا شدید دورہ پڑا۔ اُنہیں لاہور کے ماؤ ہاسپٹل میں داخل کیا گیا جہاں ایسٹ میڈیکل وارڈ میں ۲۰ر نومبر ۱۹۸۴ء بروز منگل بوقتِ دوپہر ار بجکر ۱۵ر منٹ پر اس دارِ فانی سے فیض کوچ کر گئے۔ اُن کی بے چین روح کو ابدی سکون مل گیا۔ لاہور کے ماڈل ٹاؤن قبرستان میں حفیظ جالندھری کے مزار کے قریب اُن کو دفن کیا گیا۔ فیض کی تقریباً ۱۵ر شعری و نثری تخلیقات شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں۔

شعری مجموعے

(۱) نقشِ فریادی ۱۹۴۱ء (۲) دستِ صبا ۱۹۵۲ء (۳) زنداں نامہ ۱۹۵۶ء

(۴) دستِ تہِ سنگ ۱۹۶۵ء (۵) سرِ وادیٔ سینا ۱۹۷۱ء (۶) شامِ شہرِ یاراں ۱۹۷۸ء

(۷) میرے دل میرے مسافر ۱۹۸۱ء (۸) کلامِ فیض ۱۹۸۲ء

(۹) سارے سخن ہمارے (فیض کا تمام کلام ''کلیات'' کی صورت میں لندن سے شائع ہوا ۱۹۸۴ء)

(۱۰) نسخہ ہائے وفا (سارے سخن ہمارے کا پاکستانی ایڈیشن شائع ہوا ۱۹۸۴ء)

یہ تمام فیض احمد فیض کے شعری مجموعے ہیں۔ اب اُن کے نثری مجموعوں کی طرف رُخ کرتے ہیں۔

نثری مجموعے

(۱) میزان (تنقیدی مضامین) ۱۹۶۲ء (۲) صلیبیں میرے دریچے میں (خطوط) ۱۹۷۱ء (۳) متاعِ لوح و قلم ۱۹۷۳ء

(۴) ہماری قومی ثقافت ۱۹۷۶ء (۵) مہ و سالِ آشنائی ۱۹۸۰ء (۶) سفرنامۂ کیوبا ۱۹۷۴ء

اب ہم فیض کے کارہائے نمایاں کی طرف آتے ہیں۔ فیض نے جب اپنی تعلیم مکمل کر لی تو اُس کے بعد امرتسر آئے۔ یہاں اُن کی ملاقات پطرس بخاری، رشید جہاں، ہاجرہ بیگم، ڈاکٹر محمود الظفر اور دوسرے کمیونسٹ رہ نماؤں سے ہوئی۔ فیض اپنے پہلے عشق میں ناکام ہونے سے بہت دل برداشتہ تھے۔ رشید جہاں نے اِسے محسوس کیا اور کہا کہ یہ حادثہ تمہاری ذاتِ واحد کا بہت بڑا حادثہ ہو سکتا ہے مگر یہ اتنا بڑا نہیں ہو سکتا کہ زندگی بے معنی ہو جائے۔ اُنہوں نے فیض کو پڑھنے کے لئے ایک کتاب دی جو کارل مارکس کی تھی۔ بقولِ فیض اُنہوں نے اُس کتاب کو پڑھا اور اُن پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اشتراکی ادب کے مطالعے نے اُنہیں شوشلزم کی طرف مائل کیا۔ فیض نے اِن لوگوں کے ساتھ مل کر ریلوے اور ڈاک وتار کے مزدوروں کو منظّم کرنے میں نمایاں رول ادا کیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد فیض ٹریڈ یونین کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ سجاد ظہیر کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام میں حصہ لیا۔ فیض نے جنیوا اور سان فرانسسکو میں منعقدہ آئی۔ ایل۔ او کے اجلاس میں شرکت کی۔ فیض نے اپنے ملکی مسائل کے علاوہ فلسطینی مہاجرین اور افریقی عوام کو آزادی کی تحریک میں حصہ لینے پر مجبور کیا۔ فیض کا تعلق فلموں سے بھی رہا۔ دو فلموں کے لئے گانے اور مکالمے بھی لکھے۔ ایک فلم ''جاگو ہوا سویرا'' جو ۱۹۵۹ء میں نمائش کے لئے پیش ہوئی۔ اِس فلم کو بین الاقوامی اعزاز بھی مل چکا ہے۔ فیض نے ایشیا اور یورپ کے بہت سے ممالک کے دورے کیے۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۴۹ء تک سان فرانسسکو اور جنیوا میں رہے۔

جولائی ۱۹۶۲ء سے جنوری ۱۹۶۴ء کے دوران انگلستان، روس، الجیریا، مصر، لبنان اور ہنگری کا سفر کیا۔ ۱۹۸۵ء میں ایشیا اور افریقہ کے ادیبوں کی پہلی کانفرنس تاشقند میں ہوئی جس میں فیض نے ترقی پسند تحریک کے لیڈر کی حیثیت سے شرکت کی۔ فوج کی ملازمت کے دوران ۱۹۴۶ء میں ایم۔ بی۔ ای کا خطاب ملا۔ ۱۹۶۲ء میں فیض کو پہلا لینن انعام ملا۔ فیض پہلے ایشیائی شاعر ہیں جنھیں یہ اعزاز دیا گیا۔ اِس سے فیض کو نہ صرف بین الاقوامی شہرت ملی بلکہ اردو زبان کا بھی وقار بلند ہوا۔ فیض کو اُن کی زندگی میں ہی عالم گیر پیمانے پر شہرت مل چکی تھی۔

04.04 فیض احمد فیض کی نظم نگاری

۱۹۲۸ء میں جب فیض بی۔ اے سالِ اول میں تھے، شعر کہنے لگے تھے۔ مرے کالج سیال کوٹ کے لیکچرار محمد سلیم چشتی جو اقبال کے ہم عصر تھے، بی۔ اے کے طلبا کو اردو پڑھاتے تھے۔ چشتی صاحب نے ایک گروپ ''اخوان الصفا'' کے نام سے بنایا تھا جس کے زیرِ اہتمام ہر ماہ کالج میں ایک مشاعرے کی محفل منعقد کی جاتی تھی۔ اُس کے پہلے مشاعرے کے لئے یہ مصرع تجویز کیا گیا تھا۔ ع ......غمزہ نہیں ہوتا کہ اشارہ نہیں ہوتا۔

نومبر ۱۹۲۸ء کے پہلے ہفتے میں منعقد ہونے والی اِس محفل میں فیض نے پہلی بار غزل پڑھی۔

لب بند ہیں ساقی! مری آنکھوں کو پلا دے
وہ جام جو مِنَّت کش صہبا نہیں ہوتا

یہ شعر کافی مقبول ہوا۔ اُن کی پہلی نظم ''میرے معصوم قاتل'' گورنمنٹ کالج لاہور کے میگزین دسمبر ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی۔ مختلف رسائل میں اُن کا کلام شائع ہوتا رہا۔ فیض کا پہلا شعری مجموعہ ''نقشِ فریادی'' ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔ دیباچے میں فیض نے خود اعتراف کیا:

> ''اِس مجموعے کی اشاعت ایک طرح کا اعترافِ شکست ہے۔ شاید اِس میں دو چار نظمیں قابلِ برداشت ہیں لیکن دو چار نظموں کو کتابی صورت میں شائع کروانا ممکن نہیں تھا۔ اصولاً مجھے انتظار کرنا چاہیے تھا کہ ایسی نظمیں کافی تعداد میں جمع ہو جائیں لیکن یہ انتظار کچھ عبث معلوم ہونے لگا۔''

لیکن اپنے انکسار کی وجہ سے فیض نے یہ بات کہی تھی۔ اُن کا پہلا مجموعہ کافی مقبول ہوا۔ اِس مجموعے پر اُنہوں نے ن.م. راشد سے مقدمہ لکھوایا تھا۔

ن.م. راشد نے لکھا تھا:

> ''نقشِ فریادی ایک ایسے شاعر کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو رومان اور حقیقت کے سنگم پر کھڑا ہے۔''

ن۔م۔ راشد کا یہ جملہ فیض کی شاعری کا ''سَر نامہ'' ثابت ہوا۔ اردو شاعری میں فیض کی شخصیت ایک رومانی شاعر کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ فیض کی شاعری میں ابتدا سے انتہا تک رومان و حقیقت کی دھوپ، چھاؤں ہے۔ اُن کی شاعری میں حُسن و محبت کی دل گداز داستانیں اور بے زار نگاہوں کی تلخیاں بھی ہیں۔ حُسن کی رنگینی میں کھو جانے کی جرأت اور اجنبی ہونے کی تمنا بھی ہے۔ فیض اپنے عہد سے مایوس ہیں مگر شکست خوردہ نہیں۔ اُن کی شاعری میں تفکّر آمیز تجسّس ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ غلامی کا اندھیرا چند روزہ ہے۔ اِس کے لئے وہ

ہرستم سہنے کو تیار ہیں۔فیض کے مزاج میں رومانیت ہے۔ یہ رومانیت اُنہیں خالص انقلابی بننے سے روکتی ہے۔اُن کی انقلابیت میں رومانیت کے عناصر شامل ہوتے رہے۔ اِسی لئے وہ رومان اور حقیقت کے دوراہے پر کھڑے نظر آتے ہیں۔فیض نے اپنی زندگی میں محبت کی تھی اور ناکام ہوئے تھے۔اُن کا محبوب اُن کی مختلف نظموں میں صاف جھلکتا ہے۔

فیض کی نظموں میں یہ محبوب بار بار نظر آتا ہے لیکن یہ خیالی اور تصوّراتی محبوب نہیں ہے بلکہ جیتا جاگتا محبوب ہے جس سے اُنہیں بے پناہ پیار تھا۔ یہ محبوب متوسط طبقے سے تعلق نہیں رکھتا تھا بلکہ کسی اونچے گھرانے سے متعلق تھا۔فیض انتظار کرواتے نہیں بلکہ کرتے ہیں۔فیض کی ابتدائی شاعری میں ''تنہائی اور انتظار'' کی مرکزی حیثیت ہے۔فیض کی روح تنہائی کی شکار ہے۔وہ گردوپیش کے ماحول کو اُکتائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں۔اُن کا دل اُچاٹ ہے اور وہ پرانی زوال پذیر اَقدار سے مایوس ہیں۔اُنہیں انتظار ہے اپنے محبوب کا، کسی رنگین آنچل کا، گھنے درختوں پہ سوئی ہوئی چاندنی کا اور عہدِ نو کا جس پر اُن کا یقین ہے۔اُن کی تنہائی لمحہ بوجھل ہوتی جاتی ہے لیکن وہ مایوس نہیں ہیں۔ یہ نظمیں اپنا ایک انفرادی وجود رکھتے ہوئے بھی ایک سلسلے کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں۔آغازِ شاعری کا نمونہ ''نقشِ فریادی'' کی شکل میں ہمارے سامنے ہے جس میں حُسن و عشق کی دل فریبی، انتظارِ محبوب، مخملی بانہوں کا گداز، جادو بھری آنکھیں اور زلف و گیسو جیسے موضوعات ملتے ہیں۔

اِس مجموعے کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے:

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

اِن دو اشعار میں صرف یہ کہا گیا ہے کہ رات میرے محبوب کی بھولی ہوئی یاد میرے دل میں چپکے سے چلی آئی۔اِس یاد کو تین مختلف چیزوں سے تشبیہ دی گئی ہے جس سے بے پناہ حُسن پیدا ہوگیا ہے۔مجازی عشق اِن اشعار کا موضوع ہے۔حُسنِ محبوب کی ''سج دھج''، اُس کی ''خوابیدہ سی آنکھیں'' اور اُن آنکھوں میں ''کاجل کی لکیر''، اُس کے رخسار پر ''غازے کا ہلکا سا غبار'' اُس وقت تک فیض کی شعری کائنات بس اَرضی محبت کے اِسی تنگ دائرے میں قید تھی۔اِسی قبیل کی کچھ اور مثالیں پیشِ نظر کرتے چلتے ہیں:

طویل راتیں ابھی تک طویل ہیں پیاری اُداس آنکھیں ابھی انتظار کرتی ہیں
چشمِ مَے گُوں ذرا اِدھر کردے دستِ قدرت کو بے اثر کردے

''حسینۂ خیال سے'' کے یہ اشعار:

رسیلے ہونٹ، معصومانہ پیشانی، حسیں آنکھیں کہ میں اک بار پھر رنگینیوں میں غرق ہوجاؤں
مری ہستی کو تیری اک نظر آغوش میں لے لے ہمیشہ کے لئے اِس دَام میں محفوظ ہوجاؤں

اِن نظموں کی ایک خاص فضا ہے۔ایک غم انگیز خاموشی ہے۔فیض کی شاعری کا سارا حُسن فضا سے جھلکتا ہے۔وہ ایک ایسی فضا تعمیر کرتے ہیں جہاں مصرعوں کی معنویت اہم نہیں رہ جاتی بلکہ اُس فضا میں الفاظ موم کی طرح پگھل کر بہنے لگتے ہیں۔ایک سناٹا سا محسوس ہوتا ہے اور تنہائی روح کی گہرائیوں میں اُترتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور سارا وجود سراپا انتظار بن جاتا ہے۔فیض نے دو نظمیں ''تنہائی'' اور ''انتظار'' کے عنوان سے لکھیں۔نظم ''انتظار'' میں وہی اشتیاق ہے جو ہر شاعر کو اپنی محبوبہ کا ہوتا ہے۔اِس نظم میں وہ کوئی خاص فضا نہیں بنا سکے ہیں۔صرف اپنے عام احساسات کا اظہار کیا ہے۔نظم کے دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

جو حسرتیں ترے غم کی کفیل ہیں پیاری   ابھی تلک مری تنہائیوں میں بستی ہیں
طویل راتیں ابھی تک طویل ہیں پیاری   اُداس آنکھیں ابھی انتظار کرتی ہیں

نظم کے اختتام پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے شاعر تھک کر نڈھال ہو گیا ہے۔ ایک خود سپردگی کی کیفیت، شکست کا اعتراف اور التجا بھرا انداز اُبھر کر سامنے آتا ہے:

قسم تمہاری بہت غم اُٹھا چکا ہوں میں
غلط تھا دعویٰ صبر و شکیب، آ جاؤ
قرارِ خاطرِ بے تاب! تھک گیا ہوں میں

نظم ''تنہائی'' معنوی اور فنی اعتبار سے فیضؔ کی ایک اہم نظم ہے۔ یہ نظم داخلیت کا اظہار ہے۔ شاعر کا سارا وجود سمٹ کر انتظار کے نقطے پر مرکوز ہو جاتا ہے۔ خفیف سے خفیف آہٹ پر وہ چونک اُٹھتا ہے۔ اُسے اپنے محبوب کی آہٹ کا دھوکا ہوتا ہے۔ اُمید و بیم کی کیفیت ہوتی ہے۔ اُمید کی لو ٹمٹما رہی ہے پھر وہ بھڑک اُٹھتی ہے اور پھر بجھ جاتی ہے۔ بعض ناقدین نے اِسے جہانِ نو کا انتظار قرار دیا ہے۔ ن۔ م۔ راشد نے تاروں کے بکھرے ہوئے غبار اور ایوانوں کے لڑکھڑاتے چراغ کا مطلب تہذیب کا بکھرتا شیرازہ لیا ہے۔

جمیل جالبی نے نظم ''تنہائی'' (جو کہ نو مصرعوں پر مشتمل ہے) پر منفی رائے قائم کی ہے:

''نہ تو یہ نظم سیاسیات میں اُلجھے ہوئے لمحے کی پیداوار ہے اور نہ تہذیب و مذہب کے شیرازہ بکھرنے سے کوئی واسطہ رکھتی ہے اور ظاہر اطوار میں اِس نظم کے مصرعوں میں کوئی ربط اور وابستگی نہیں ہے۔ محض یاس کی ڈور سے ایک مصرعے کو دوسرے مصرعے سے منسلک کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔''

مصرعوں کی روانی دیکھ کر ایک کو دوسرے سے قصداً جوڑنے کی کوشش کا گمان نہیں ہوتا کیوں کہ داخلی و معنوی اعتبار سے اِن مصرعوں میں ایک باہمی ربط ہے۔ یہ نظم سیاسی بصیرت کی روشن مثال ہے۔ مشرقی علوم و فنون اور زندگی و ثقافت میں جو جمود و تعطّل ہے، اُس کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں۔ اِس نظم میں جو مجرّد ات ہیں، فیضؔ کا کمال ہے کہ اُنہیں زندہ و متحرک کر کے پیش کیا ہے جیسے تارے، راہ رَو، کواڑ، دلِ زار اور خوابیدہ چراغ وغیرہ۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اِس نظم کا تجزیہ پیش کیا ہے جو بہت معنی خیز اور دل چسپ ہے۔

بقولِ گوپی چند نارنگ:

''یہ بھی اگرچہ شدید طور پر ذہنی موضوعی نظم ہے لیکن اِس میں بھی ایک ذاتی انفرادی تجربہ ایک وسیع تر انسانی آفاقی کیفیت میں ڈھل جاتا ہے اور ذہن و روح کو اپنی حزنیہ کیفیت سے شدید طور پر متاثر کرتا ہے۔''

(ادبی تنقید اور اسلوبیات ص/۱۹۵)

فیضؔ کی رومانی شاعری میں عشق کی مدہوشی اور جسم کی لذّت کوشی کا بیان نہیں ہے۔ فیضؔ کے یہاں وصل کی سرشاری نہیں بلکہ جدائی کی خاموش تڑپ ہے۔ یہ شاعری ایک ایسے شخص کے آنسوؤں اور آہوں کی داستان ہے جسے اِس بات کا احساس کھائے جا رہا ہے کہ زندگی چند روزہ ہے اور شباب اُس سے بھی زیادہ چند روزہ ہے مثلاً نظم ''سرودِ شبانہ'' کا یہ شعر:

پھول لاکھوں برس نہیں رہتے دو گھڑی اور ہے بہارِ شباب

''سرودِ شبانہ، تہِ نجوم، یاس اور ایک منظر'' فیض کی فن کاری اور مصوّری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ اِن نظموں میں پراسرار خاموشی اور معنی خیز سرگوشی ہے۔ پرسکون اور خواب آور مناظر شاعر کی روح کی طرح بوجھل اور نڈھال ہیں لیکن اِن مناظر کی افسردگی اور اضمحلال میں سرگوشیاں سنائی پڑتی ہیں۔ اِن نظموں میں شاہ راہوں کا تجسّس ہے اور یہی نظمیں اُس عبوری دَور کی نشانی ہیں جہاں شاعر، شاعرِ محبت سے شاعرِ انسان بنتا ہے۔ اِن نظموں کا حُسن وسکون آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ ''سرودِ شبانہ'' میں شاعر نہ صرف عالمِ خودفراموشی میں ہے بلکہ اُس کے وجود کا ذرّہ ذرّہ اپنے گردوپیش کے منظر سے ہم آہنگ ہے:

نیم شب ، چاند ، خود فراموشی محفلِ ہست و بود ویراں ہے
پیکرِ التجا ہے خاموشی بزمِ انجم فسردہ ساماں ہے
آبشارِ سکوت جاری ہے چار سو بے خودی سی طاری ہے
زندگی جزوِ خواب ہے گویا ساری دنیا سراب ہے گویا
سو رہی ہے گھنے درختوں پر چاندنی کی تھکی ہوئی آواز
کہکشاں نیم وا نگاہوں سے کہہ رہی ہے حدیثِ شوقِ نیاز
چِھن رہا ہے خمارِ کیف آگیں آرزو، خواب، تیرا رُوئے حَسیں

نظم ''انجام'' میں دیکھیے:

ہیں لبریز آہوں سے ٹھنڈی ہوائیں اُداسی میں ڈوبی ہوئی ہیں گھٹائیں

اِن نظموں میں منظر نگاری کے باوجود جس اختصار سے کام لیا گیا ہے وہ فنی اعتبار سے بے حد بلند ہے۔ ''مری جاں! اب بھی اپنا حُسن واپس پھیر دے مجھ کو، تہِ نجوم، استفہامیہ اور تین منظر'' بھی جذبات کی مصوّری کی عمدہ مثالیں ہیں۔ نظم ''مرگِ سوزِ محبت'' میں کشمکش دیکھیے:

پھر اوٹ لے کے دامنِ ابرِ بہار کی دل کو منائیں ہم، کبھی آنسو بہائیں ہم
آؤ کہ آج ختم ہوئی داستانِ عشق اب ختمِ عاشقی کے فسانے سنائیں ہم

''میرے ندیم'' استفہامیہ نظم ہے۔ شاعر سوالیہ نشان قائم کرتا جاتا ہے۔ شاعر حیرت زدہ ہے کہ وہ احساسات اور وہ آرزوئیں کیا ہوئیں جن سے شعر کی دنیا آباد تھی۔ جن سے فکروعمل رنگین تھے۔ جن کے نور سے مہ وانجم شاداب تھے اور جنونِ عشق کی ہمّت جواں تھی۔ ''میرے ندیم'' تجسّس پر ختم ہوتی ہے۔ شاعر اگلی محبتوں کے مزار پر چراغاں کر کے دبے پاؤں نکل جاتا ہے:

چلو کہ چل کے چراغاں کریں دیارِ حبیب ہیں انتظار میں اگلی محبتوں کے مزار

فیضؔ کی شاعری ایک ایسی فضا میں پہنچاتی ہے جس میں ہندوستان کے نوجوانوں کی تنہائی، بے یقینی، جاں بازی اور بے جہتی سبھی کچھ تھی۔ یہ بڑی غم گسار فضا تھی۔ ''میرے ندیم'' ہی وہ نظم ہے جہاں فیض احمد فیضؔ شاعرِ محبت سے شاعرِ انسان بنتے ہیں۔

بقولِ ن۔م۔راشد اب تک اُن کی نگاہوں نے:

’’صرف حریری، گلابی ملبوسوں میں لپٹی ہوئی، خواب سے چُور اور لذّت سے سرشار تصویریں ہی دیکھی تھیں لیکن اب وہ اُن مناظر کی طرف بڑھتا ہے جو تلخ ہیں، جن میں ملبوس کی سرسراہٹ اور خواب کی ضیا پاشیاں نہیں بلکہ زندگی کی تڑپ اور پکار ہے۔‘‘

بے خواب کواڑوں کو مقفّل کرنے کے بعد نئے دروازے سے دوسری شاہ راہوں پر نکلتے ہیں۔ وہ شاہ راہیں جہاں نہ رنگین اور حریری ملبوسات ہیں، نہ کیفِ شراب، نہ خمارِ خواب سے لبریز آنکھیں، نہ رُخساروں کے عشرت آلود غازے، نہ سرخ ہونٹوں پر تبسم کی ضیا، نہ مرمریں ہاتھوں کی لرزشیں، نہ مخملی بانہیں اور نہ جھلکتے ہوئے آنچل۔ یہ شاہ راہیں بدنما اور ٹھوس ہیں۔ یہاں خاک و خون میں لتھڑے اور نہائے ہوئے جسم، بازاروں میں مزدوروں کا بکتا ہوا گوشت، بھوک اُگانے والے کھیت، ناتوانوں کے نوالوں پر جھپٹتے ہوئے عقاب، آرزؤں کی مقتل گاہیں، اجنبی ہاتھوں کا بے نام ستم، دلوں کی بے سود تڑپ اور جسموں کی مایوس پکار ہے۔

یہ تبدیلی کتاب کے دوسرے حصے میں صاف نظر آتی ہے جہاں شاعر اپنی ناسمجھی کا اعتراف کرتا ہے کہ اُس نے اپنے محبوب کو کُل کائنات سمجھ رکھا تھا۔ اپنے محبوب کے حصول ہی کو منزلِ مقصود سمجھ رہا تھا لیکن اب اُسے احساس ہو چلا ہے کہ:

اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا   راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
اَن گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم   ریشم و اطلس و کم خواب میں بُنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم   خاک میں لتھڑے ہوئے، خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنّوروں سے   پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کیجیے   اب بھی دل کش ہے ترا حُسن مگر کیا کیجیے
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب! نہ مانگ

ایک ایسی آواز اُبھرتی ہے جو صدیوں کے بہیمانہ طلسم کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے اور ایک سڑی اور کھوکھلی تہذیب اُبھر کر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ پورے معاشرے پر وحشت سی چھائی ہوئی ہے۔ مزدوروں، کسانوں اور گاؤں کی زندگی کا استحصال فیضؔ کو مغلوب کر دیتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا ایک نئی کروٹ لے رہی تھی۔ محنت کش طبقہ بیدار اور متحد ہو کر سرمایہ داری کا تختہ اُلٹ دینے کے خواب دیکھ رہا تھا جس کے زیرِ اثر ہندوستان میں ترقّی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ فیضؔ کی شاعری کو ایک نیا اور زوردار محرک میسر آیا۔ اب اُن کی نظروں میں ایسے سوالات سر اُٹھانے لگے:

آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سائے کے تلے   آدم و حوّا کی اولاد پہ کیا گزری ہے
اِن دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق   کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے؟
یہ حسیں کھیت، پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا   کس لئے اِن میں فقط بھوک اُگا کرتی ہے؟
جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت   شاہ راہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے اُبلتی ہے نہ پوچھ!   اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

مگر اِس کے ساتھ ہی فیضؔ انقلاب کی لَو تیز دیکھ کر پر اُمید ہو جاتے ہیں:

چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز ظلم کی چھاؤں میں دَم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں ، تڑپ لیں ، رُو لیں اپنے اجداد کی میراث سے معذور ہیں ہم

محنت کشوں اور مزدوروں کے مسائل و مصائب اب اُن کی نظر میں تھے اور اُن کے دُکھ، درد میں برابر کے شریک تھے لیکن محبوب کا سراپا اب بھی اُن کی آنکھوں کے سامنے گھومتا تھا اور کھوئی ہوئی یادیں اب بھی آ آ کے ستاتی تھیں۔ترقّی پسند تحریک نے ہزار ہا مضامین فراہم کر دیے تھے۔''موضوعِ سخن'' میں فیضؔ نے وضاحت کی ہے کہ حُسن سے زیادہ دل کش اُن کے لئے کوئی مضمون ہو ہی نہیں سکتا۔کہتے ہیں:

یہ بھی ہیں اور بھی ایسے کئی مضموں ہوں گے لیکن اُس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اُس جسم کے کم بخت دل آویز خطوط آپ ہی کہیے ، کہیں ایسے بھی اَفسوں ہوں گے
اپنا موضوعِ سخن اِن کے سوا اور نہیں طبعِ شاعر کا وطن اِن کے سوا اور نہیں

مطلب یہ کہ اُن کی شاعری میں ایک کش مکش نظر آتی ہے۔ایک طرف غریبوں ،مزدوروں اور کسانوں کے دکھ، درد ہیں اور دوسری طرف کسی جسم کے دل آویز خطوط۔یہ صورتِ حال ترقّی پسند تحریک کے رہ نماؤں کو ناگوار تھی۔تحریک کا مطالبہ یہ تھا کہ کھُل کر مظلوم کی حمایت کرو اور عشق و عاشقی کو بالائے طاق رکھو۔ادب پر ترقی پسند تحریک کے علم برداروں کا غلبہ تھا۔اُن کو ناخوش کرنا خلافِ مصلحت تھا کیوں کہ اس صورت میں گم نام ہو کر رہ جانے کا اندیشہ تھا۔چناں چہ اُس زمانے کی شاعری میں دورَنگی صاف جھلکتی ہے۔کبھی وہ دل کی بات مانتے ہیں اور کبھی دماغ کی۔''شیشوں کا مسیحا، رقیب سے، میرے ہم دَم! میرے دوست!'' ایسی نظمیں ہیں جن میں یہ کش مکش صاف نظر آتی ہے۔کچھ شعروں میں صاف صاف پروپیگنڈہ ہے تو کچھ اشعار فیضؔ کا خاص انداز لیے ہوئے ہیں۔''سیاسی لیڈر کے نام، ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے، ایرانی طلبا کے نام، چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز'' فیضؔ کی وہ نظمیں ہیں جو وقت اور تقاضے سے مجبور ہو کر لکھی گئیں۔اِن میں محنت کشوں اور مظلوموں کی آواز تو سنائی دیتی ہے مگر فیضؔ کی اپنی آواز گم ہو جاتی ہے۔تاہم اِن نظموں کے پہلو بہ پہلو ''ہم لوگ، صبحِ آزادی، تنہائی اور دریچہ'' جیسی لافانی نظمیں بھی ملتی ہیں۔جن میں شاعر نے زمانے کی پروا کیے بغیر اپنے رنگ میں کامیاب شاعری کی ہے۔فیضؔ جس کرب اور تہذیب کا نقشہ پیش کرتے ہیں وہ سماجی اجتماعیت کا لُبِّ لُباب ہے۔''دستِ صبا'' ۱۹۵۲ء کے ابتدائیے میں لکھتے ہیں:

''مجھے کہنا صرف یہ تھا کہ حیاتِ انسانی کی اجتماعی جدّ وجہد کا ادراک اور اِس جدوجہد میں حسبِ توفیق شرکت، زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا بھی تقاضا ہے۔فن اِسی زندگی کا ایک جز و اور فنّی جدّ وجہد اِسی جدّ وجہد کا ایک پہلو ہے۔''

یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ فیضؔ جس عہد میں شاعری کر رہے تھے اس وقت قومی اور بین الاقوامی سطح پر سماجی اور انسانی تہذیب میں تبدیلیاں رُونما ہو رہی تھیں۔جنگِ عظیم سے دنیا کا سیاسی اور سماجی نظام درہم برہم ہو گیا تھا۔بھوک اور افلاس نے سماج کی ریڑھ کمزور کر دی تھی۔طبقاتی کشمکش بڑھتی جا رہی تھی۔مغربی اقتدار کے خلاف آوازیں بلند ہوئیں اور اُن آوازوں کو دَبانے کے لئے ظلم کے

دروازے کھُل گئے۔دھیرے دھیرے ظلم کے دھارے سے بغاوت کی لہر اُبھری۔ہندوستانی تہذیب وتمدّن کو کچلا گیا۔جلیاں والا باغ کے واقعے سے متاثر ہوکر فیضؔ اپنے مجموعۂ کلام ''دستِ تہِ سنگ''میں لکھتے ہیں:

> ''پھر دیس پرِ عالمی کساد بازاری کے سائے ڈھلنے شروع ہوئے۔کالج کے بڑے بڑے بانکے تیس مارخاں تلاشِ معاش میں گلیوں کی خاک پھانکنے لگے۔یہ وہ دن تھے جب یکا یک بچوں کی ہنسی بجھ گئی،اُجڑے ہوئے کسان کھیت کھلیان چھوڑ کر شہروں میں مزدوری کرنے لگے اور اچھی خاصی شریف بہو بیٹیاں بازار میں آبیٹھیں۔''

فیضؔ کی شاعری میں زندگی کی اعلیٰ قدریں اور تہذیبی عناصر کی کارفرمائی دیکھی جاسکتی ہے۔تہذیبی عوامل میں اخلاق اورامن وآشتی کے عناصر بھی شامل ہیں۔انسانی زندگی کی اعلیٰ قدریں اور رکھ رکھاؤ کی روایتیں تہذیب وتمدّن کو مستحکم و پائیدار بناتی ہیں۔سجاد ظہیر ترقّی پسند تحریک کے روحِ رواں تھے۔''زنداں نامہ''کے آغاز میں لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک اُن اقدار کا تعلق ہے جن کو شاعر نے اِن میں پیش کیا ہے،وہ تو وہی ہیں جو اِس زمانے میں تمام ترقّی پسند انسانیت کی اقدار ہیں لیکن فیضؔ نے اُن کو اتنی خوبی سے اپنایا ہے کہ وہ نہ تو ہماری تہذیب و تمدّن کی بہترین روایات سے الگ نظر آتی ہیں اور نہ شاعر کی انفرادیت،اس کا عزم اور مترنّم اندازِ کلام کہیں بھی اُن سے جدا ہوتا ہے......اُس کے خیالات میں اُن سچائیوں اور جمہوری مقاصد کی چمک ہے جن سے ہماری قوم کی اکثریت کے دل روشن ہیں۔''

فیضؔ نے پوری انسانیت کی کراہ اور دنیا کے کریہہ مناظر کو بھی نرمی کے ساتھ پیش کیا ہے۔اُن کی نظموں کا ایک خاص مذہبی وثقافتی پس منظر بھی ہے۔اگرچہ وہ ترقی پسند اور کمیونزم سے وابستہ تھے مگر اُن کی ذہنی تربیت میں دینی تعلیم کا اہم رول رہا ہے۔عرب اسرائیل جنگ کا پس منظر،سرِ وادیٔ سینا،ربِّ کونین کی تجلّی سے تعلق رکھتا ہے۔یہودیوں کی بدنیتی اور شاطرانہ چال سے جس طرح عرب خصوصاً بیروت اور فلسطین تباہ وبرباد ہوئے اور اُن کی تہذیب وثقافت آلودہ ہوئی ہے۔اُس کے لئے فیضؔ اُمید کی ایک کرن دکھاتے ہیں جس سے اُن ملکوں کی تہذیبی وتمدّنی زندگی میں روشنی پھوٹنے کی اُمید ہے۔

بیداری کا ترانہ ملاحظہ کیجیے:

پندارِ جنوں
حوصلۂ راہِ عدم ہے کہ نہیں ہے
پھر برقِ فروزاں ہے سرِ وادیِ سینا
اے دیدۂ بینا!
پھر دل کو مصفّٰی کرو،اِس لوح پہ شاید
مابینِ مَن وتُو نیا پیماں کوئی اُترے

اب رسمِ ستم حکمتِ خاصانِ زمیں ہے
تائیدِ ستم مصلحتِ مفتیِ دیں ہے
اب صدیوں کے اقرارِ اطاعت کو بدلنے
لازم ہے کہ انکار کا فرماں کوئی اُترے (سرِ وادیِ سینا سے ماخوذ)

اِس کے علاوہ نظم ''کیا کیجیے'' میں شاعر کی مجبوری کی طرف اشارہ ہے۔''چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز'' فیض کی پہلی سیاسی نظم ہے۔ اِس نظم میں اُنہیں اُس ظلم و ستم کا شعور ہے جو ہندوستان کی سیاسی تحریکوں پر ڈھایا گیا اور اِس نظم میں ظلم کی زنجیر ٹوٹنے کا یقینِ محکم بھی ہے۔ بے شمار زخموں اور ناکامیوں کے باوجود فیض کو ایک نئی صبح کی آمد پر مکمل یقین ہے۔''اے دلِ بے تاب ٹھہر!'' میں اُن کی اُمیدیں اور قوی ہو جاتی ہیں۔

نظم ''سوچ'' میں وہ غمِ جاناں سے غمِ دوراں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ فیض آسائش کے خواب دیکھنے سے پہلے سب کے غم اپنانا چاہتے ہیں۔ یہیں سے فیض میں سرمایہ داری کے خلاف جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ سرمایہ داروں کے سکھ اور آسائش سارے انسانوں میں تقسیم ہو جائیں لیکن فیض کو اِس بات کا بھی شدید احساس ہے کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ اِس کے لئے طویل عرصہ درکار ہے اور بڑی قربانیاں دینی پڑیں گی۔ یہ فیض کی شاعری کی نئی آواز ہے جو نئی سمت کا پتہ دیتی ہے لیکن آواز نہ تو کرخت ہے اور نہ ہی اُس میں گھن گرج ہے۔ فیض نے اپنے دل میں مچلتے ہوئے انقلابی نعروں کو شگفتگی اور نرمی عطا کی ہے۔ یہ نرمی اور گداز اِس لئے پیدا ہوا کہ غمِ محبت نے اُن کی فکر کو غمِ حیات سے روشناس کیا ہے۔ انفرادی محبت کی حدیں اجتماعی محبت سے جا ملتی ہیں۔ جبر و استبداد فلسطین پر ہو یا افریقی عوام پر، فیض کا دل تڑپ اُٹھتا ہے۔ اُن کی شاعری میں محض ذاتی غم نہیں بلکہ اجتماعی احساس کے نقوش ملتے ہیں۔

فیض نے ''رقیب'' کو ایک نیا معنی دیا ہے۔ وہ رقیب میں ایک دردِ مشترک تلاش کرتے ہیں اور اُس سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

ہم نے اِس عشق میں کیا کھویا ہے، کیا سیکھا ہے جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں
عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی یاس و حرمان کے، دکھ درد کے معنی سیکھے
زیرِ دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا سرد آہوں کے، رُخِ زرد کے معنی سیکھے

نظم ''کُتّے'' کو فیض نے علامتی طور پر استعمال کر کے مزدوروں اور ناداروں کی کس مپرسی کو ظاہر کیا ہے۔ جس طرح کُتوں کی زندگی ہوتی ہے کہ ہر طرف سے دُھتکار ہی ملتی ہے۔ کچھ یہی سلوک مزدوروں اور کمزور طبقوں کے ساتھ بھی جائز رکھا جاتا ہے اور اِس کے باوجود ہم مہذّب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں:

یہ گلیوں کے آوارہ بے کار کُتّے کہ بخشا گیا جن کو ذوقِ گدائی
یہ ہر ایک کی ٹھوکریں کھانے والے یہ فاقوں سے اُکتا کے مر جانے والے
یہ مظلوم مخلوق گر سر اُٹھائے تو انسان سب سرکشی بھول جائے
یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنالیں یہ آقاؤں کی ہڈّیاں تک چبالیں
کوئی اِن کو احساسِ ذلّت دِلا دے کوئی اِن کی سوئی ہوئی دُم ہلا دے

مذکورہ نظم ''کتے'' میں وہ ہندوستانیوں کو ذلّت کا احساس دلاتے ہیں جو کہ انگریزوں کی غلامی کی زنجیریں توڑنے سے قاصر تھے اور انتہائی لاچاری کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اگر عوام متحد ہو کر بغاوت پر اُتر آئیں تو مضبوط سے مضبوط حکومت کی بنیادیں ہلا سکتے ہیں۔ فیضؔ نے راندۂ درگاہ کُتّے کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ''کُتّے'' مظلوم مخلوق کی علامت ہے۔

نظم ''ترانہ'' میں فیضؔ کہتے ہیں کہ حق و باطل کی جنگ میں سر پھوٹیں گے اور بہت خون بہے گا۔ فیضؔ راول پنڈی سازش کیس کے تحت مارچ ۱۹۵۱ء سے اپریل ۱۹۵۵ء تک قید و بند کی صعوبتیں جھیلتے رہے۔ ''دستِ صبا'' اور ''زنداں نامہ'' اُنہی دنوں کی یادگار ہیں۔ اُن دنوں کے مجموعوں میں فکر کی گہرائی اور فن کا کمال ہے۔ قید خانے کے اندر کی دنیا ''تنہائی'' باہر کی دنیا کا تصوّر ایک نیا شعور پیدا کرتی ہے۔ فیضؔ ابتدا میں سرگودھا اور لائل پور کی جیلوں میں تھے اور تین مہینے ''قیدِ تنہائی'' میں کاٹے۔ کاغذ، قلم، دوات، کتابیں، رسائل اور خطوط کسی چیز کی اجازت نہیں تھی۔ بڑی اذیت کا دَور تھا لیکن فیضؔ کے یہاں کوئی تلخی نہیں ہے۔

انہوں نے کہا:

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے — کہ خونِ دل میں ڈُبولی ہیں اُنگلیاں میں نے
زباں پہ مُہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے — ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے
قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں — چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم
صبا کی مست خرامی تہِ کمند نہیں — اسیرِ دام نہیں ہے بہار کا موسم

قید کے زمانے میں فیضؔ نے بہترین شاعری کی۔ وطن کی پکار، غریبوں کی آہیں، مظلوموں کی تڑپ اور آنے والے دَور کی آہٹیں سب کچھ اُنہوں نے محسوس کیا۔ حُبُّ الوطنی اور سوز ایک ہوگئے۔ وطن کا تصورّ محبوب کے پیکر میں ڈھل گیا:

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے — کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اُٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے — کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہوگی
بہت ہے ظلم کے دستِ بہانہ جُو کے لئے — جو چند اہلِ جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہلِ ہوس، مدعی بھی، منصف بھی — کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں

اور نظم ''یاد'' میں بھی وطن اور محبوب ایک ہو جاتے ہیں:

اِس قدر پیار سے اے جانِ جہاں! رکھا ہے — دل کے رُخسار پہ اِس وقت تری یاد نے ہات
یوں گماں ہوتا ہے، گرچہ ہے ابھی صبحِ فراق — ڈھل گیا ہجر کا دن، آ بھی گئی وصل کی رات

فیضؔ کا تعلق مزدور تحریک سے تھا۔ جیل میں بھی فیضؔ ایسا محسوس کرتے تھے جیسے وہ محنت کشوں کے ساتھ قدم ملا کر چل رہے ہوں۔ وہ مفلس، نادار، مفلوک الحال، غریب اور محنت کش عوام سے مخاطب ہو کر نظم ''شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں'' میں لکھتے ہیں:

موتی ہو کہ شیشہ، جام کہ دُر — جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا
کب اشکوں سے جُڑ سکتا ہے — جو ٹوٹ گیا سو چھوٹ گیا

تم ناحق ٹکڑے چن چن کر دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں کیا آس لگائے بیٹھے ہو

یہ شیشے دراصل عزت وناموس اور خواب ہیں۔فیضؔ کہتے ہیں کہ اِن شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں ہے۔اِن ٹکڑوں کو جوڑنے والا کوئی نہیں ہے۔فیضؔ دونوں طبقات کا تقابل کرتے ہیں۔ایک وہ جس کے پاس سب کچھ ہے اور جو اپنی دولت پر پردہ لٹکائے بیٹھا ہے۔دوسرا وہ جو اِن پردوں کو نوچ گراتا ہے۔یہ کش مکش جاری ہے۔دونوں میں گھمسان کا رَن پڑتا ہے۔فیضؔ کہتے ہیں اپنا حق چھین کر حاصل کرنا چاہیے۔ساری نظم رمزیہ پیرائے میں ہے جس میں کوئی سیاسی نعرہ نہیں ہے۔

مارچ ۱۹۵۴ء میں فیضؔ تین ہفتوں کے لئے لاہور جیل لائے گئے۔فیضؔ کو لاہور سے بہت ہی زیادہ عقیدت ومحبت تھی جس پر اُنہوں نے نظم ''اے روشنیوں کے شہر!'' لکھی۔فیض کی شاعری میں جذبے،فکر،داخلیت،خارجیت،امتزاج اور توازن کی حیرت انگیز مثال ہے۔ فیضؔ کا مسلک محبت ہے۔وطن سے محبت،بنی نوعِ انسان سے محبت۔اس کے علاوہ درد بھی مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔فیضؔ نے اپنی مشہور نظم ''ملاقات'' منٹگمری جیل میں کہی۔اس نظم میں شاعر پہلے رات کی عظمت کا اعتراف کرتا ہے۔وہ رات کو شجر کی علامت بناتا ہے تاکہ زندگی قابلِ برداشت ہوجائے پھر ملاقات ایک قوت بن جاتی ہے۔جو درد کے رشتوں کو اُستوار کرتی ہے۔شاعر کے نظریے میں اَلم نصیبوں،جگر فگاروں کی صبح افلاک پر نہیں بلکہ زمین پر ہے:

جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں سحر کا روشن اُفق یہیں ہے
یہیں پہ غم کے شرار کھل کر شفق کا گلزار بن گئے ہیں

اِس نظم میں فیضؔ نے خوب صورت استعارے استعمال کیے ہیں۔یہ نظمِ معرّیٰ ہے۔منٹگمری جیل میں فیضؔ نے نظم ''دریچہ اور درد آئے گا دَبے پاؤں'' جیسی نظمیں لکھیں۔جیل کے اندر جب ایتھل اور جولیس روزن برگ کی شہادت کی خبر ملی تو فیضؔ نے اپنی مشہور نظم ''ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے'' کہی۔

اُس کے متعلق ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

''فیضؔ دیکھ رہے تھے کہ ظلم واستبداد کے خلاف یہ حشر خیز تحریکیں صرف اُن کے وطن میں نہیں،ایشیا اور افریقہ کے دوسرے ملکوں میں سر اُٹھا رہی ہیں۔اُنہوں نے ساری دنیا کے حُرّیت پسند باغیوں کی جدوجہد سے اپنے آپ کو وابستہ کرلیا تھا۔اپنی نظم ''آجاؤ ایفریقا'' میں اُنہوں نے کینیا اور دوسرے افریقی ملکوں کے حریت پسند عوام کی آواز سے آواز ملائی ہے۔ایران کے قیدخانوں میں وطن پرست نوجوان شاہ کی چیرہ دستیوں کا شکار ہورہے تھے۔'' (شبستاں،فیض نمبر ص/۶۷)

فیضؔ اقتصادی بربادی یا معاشرتی اُلجھاؤ کو اپنا موضوع نہیں بناتے ہیں۔جس چیز کا احساس فیضؔ کو سب سے زیادہ ہے وہ سیاسی غلامی اور ظلم و استبداد کا خونی واہنی پنجہ ہے۔فیضؔ نے اپنی شاعری کے ذریعے ظلم کو ظلم اور ستم کو ستم کہنے کا سلیقہ سکھایا،انکار کی جرأت عطا کی،مشاہدۂ حق کی گفتگو میں حُسن کی لطافتوں کا رنگ بھر کے گفتگو کو زیادہ بامعنی،دل کش اور پُر اثر بنایا۔فیضؔ کے کلام میں پیکر تراشی بھی پائی جاتی ہے۔پیکر تراشی سے شعر کے حُسن میں دل کشی پیدا ہوجاتی ہے۔

فیضؔ نے اِس فنّی تدبیر سے بہت کام لیا ہے۔اُن کی نظموں میں وہ ڈرامائی کیفیت تو نہیں پائی جاتی جو اقبالؔ کی نظموں میں ملتی ہے پھر بھی اُنہوں نے اِس تکنیک سے خوب کام لیا ہے۔اُن کے کلام میں نہایت کامیاب تمثیل کی مثالیں بھی موجود ہیں۔تمثیل نگاری میں تجسیم سے کام لینا پڑتا ہے۔بے جان اشیا کو جان دار کرداروں کا درجہ دے کر تمثیل کی تخلیق کی جاتی ہے۔کلامِ فیضؔ کی نمایاں خصوصیت نغمگی و ترنّم ہے۔ فیضؔ شاعری میں موسیقی کی اہمیت سے واقف ہیں۔وہ لفظوں کا انتخاب کرتے اور اُنہیں ترتیب دیتے وقت اِس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ شعر میں ایک خاص قسم کا ترنّم پیدا ہو۔اس لئے وہ شاعری میں وزن کی اہمیت کے قائل ہیں۔فیضؔ کی جن نظموں کے کچھ مصرعے چھوٹے اور کچھ بڑے ہیں اُن میں عام طور پر یہ خیال رکھا گیا ہے کہ پوری نظم میں ایک ہی رکن کی تکرار ہو لیکن مصرعوں میں اُن کی تعداد گھٹتی اور بڑھتی رہے۔

فیضؔ اردو شاعری کی روایات سے بخوبی آشنا ہیں۔غالبؔ،اقبالؔ اور میرؔ کے کلام کا اُنہوں نے بہت توجّہ سے مطالعہ کیا ہے۔فارسی اور انگریزی شاعری سے بھی وہ اچھی طرح واقف ہیں۔اس لئے اپنی کلاسیکی روایت کا احترام اور کہیں کہیں اُس سے انحراف بھی کرتے ہیں مثلاً وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ قافیہ شاعر کے پاؤں کی زنجیر ہے اور شاعری میں اکثر رکاوٹ بن جاتا ہے لیکن وہ اِس راز سے واقف ہیں کہ قافیے سے شعر میں نغمگی و موسیقیت پیدا ہوتی ہے۔اس لئے وہ قافیے کو آخر میں نہیں لاتے تو اکثر نظموں میں مصرعوں کے درمیان میں لے آتے ہیں۔ فیضؔ کی خصوصیات نے اُن کو اردو شاعری میں ایک اعلیٰ مقام عطا کیا ہے۔فیضؔ کی شاعری میں قدیم و جدید میلانات کا دل کش امتزاج ملتا ہے۔وہ کُوے یار سے سُوے دار تک سفر کرتے ہیں۔فیضؔ کا اپنی شاعری کے متعلق یہ کہنا پوری طرح سچ ثابت ہوتا ہے کہ:

ع...ہمیں سے سنتِ منصور و قیس زندہ ہے

04.05 نظم ''یاد'' متن

دشت تنہائی میں اے جانِ جہاں! لرزاں ہیں
تیری آواز کے سایے ، ترے ہونٹوں کے سراب
دشتِ تنہائی میں دُوری کے خس و خاک تلے
کِھل رہے ہیں ترے پہلو کے سمن اور گلاب
اُٹھ رہی ہے کہیں قربت سے تری سانس کی آنچ
اپنی خوشبو میں سلگتی ہوئی مدھم مدھم
دور اُفق پار چمکتی ہوئی قطرہ قطرہ
گِر رہی ہے تری دل دار نظر کی شبنم
اِس قدر پیار سے اے جانِ جہاں! رکھا ہے
دل کے رُخسار پہ اِس وقت تری یاد نے ہات
یوں گماں ہوتا ہے گرچہ ہے ابھی صبحِ فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن ، آ بھی گئی وصل کی رات

04.06 نظم "یاد" تجزیہ

تین بندوں پر مشتمل اِس نظم کے ابتدائی بند میں لفظ "دشتِ تنہائی" اپنے آپ میں ایک استعارہ ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ تنہائی کے جنگل میں تیری آواز کے سائے اور ہونٹوں کے سراب لرز رہے ہیں۔ دُوری کے خس وخاشاک تلے تیرے پہلو کے سمن اور گلاب کِھل رہے ہیں۔ کسی کی نزدیکی سے تیری سانس کی آنچ خوشبو میں سلگتی ہوئی مدھم مدھم اُٹھ رہی ہے۔ تیری دِل دار نظر کی شبنم اُفق پار قطرہ قطرہ چمکتی ہوئی گر رہی ہے۔ اِس قدر پیار سے دل کے رخسار پہ اُس وقت تری یاد نے ہاتھ رکھا ہوا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر چہ ابھی جدائی کی صبح ہے لیکن ہجر کا دن ڈھل گیا ہے اور وصل کی رات قریب آ گئی ہے۔ اِس نظم میں شاعر کے لئے وطن اور محبوب ایک ہو گئے ہیں۔ اس نظم کا شمار فیضؔ کی منفرد و ممتاز نظموں میں ہوتا ہے۔

04.07 نظم "تنہائی" متن

پھر کوئی آیا دلِ زار! نہیں ، کوئی نہیں
راہ رَو ہوگا ، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے اَیوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزر
اجنبی خاک نے دُھندلا دِیے قدموں کے سراغ
گُل کرو شمعیں ، بڑھا دو مَے و مینا و اَیاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفّل کر دو
اب یہاں کوئی نہیں ، کوئی نہیں آئے گا

04.08 نظم "تنہائی" تجزیہ

نظم "تنہائی" معنوی اور فنی اعتبار سے فیض کی ایک اہم نظم ہے۔ یہ نظم داخلیت کا اظہار ہے۔ شاعر کا سارا وجود سمٹ کر انتظار کے نقطے پر مرکوز ہو جاتا ہے۔ خفیف سے خفیف آہٹ پر بھی وہ چونک اُٹھتا ہے۔ اسے اپنے محبوب کی آہٹ کا دھوکا ہوتا ہے۔ اُمید وبیم کی کیفیت ہوتی ہے، اُمید کی لَو ٹمٹما رہی ہے۔ پھر وہ بھڑک اُٹھتی ہے اور پھر بجھ جاتی ہے۔ نظم کے پہلے مصرعے میں شاعر کا وجود دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہے۔ شاعر خود کلامی کی کیفیت سے دوچار ہے۔ شک وشبہ کی کیفیت ہے مگر دوسرے مصرعے میں شاعر کو خیال آتا ہے کہ کوئی راہ گیر ہوگا اور وہ کہیں اور چلا جائے گا۔ پھر انتظار کی شدّت مایوسی میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ نا اُمیدی و یاس میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ رات اپنے سفر پر رواں دواں ہے۔ تاروں کا غبار بھی بکھرنے کے قریب ہے۔ ایوانوں میں جو چراغ جل رہے تھے اب وہ چراغ لڑکھڑانے لگے ہیں۔ راستہ تک تک کے

اُسے یقین ہوتا جا رہا ہے کہ اب کوئی آنے والا نہیں ہے۔ اجنبی خاک نے قدموں کے سراغ بھی دُھندلا دِیے ہیں اِس لئے اب شمعوں کو گُل کرنے (بجھانے) کا وقت آ گیا ہے اور مئے و مینا و ایاغ کو بڑھا دینے کی بات ہو رہی ہے۔

بے خواب کواڑوں کو مقفّل کرنے کی التجا کی جا رہی ہے۔کوئی نہیں، کوئی نہیں کی تکرار نا اُمیدی و مایوسی کا اظہار بن جاتی ہے۔نظم ''تنہائی''، کسی بھڑکتی ہوئی شمع کے بجھنے کی کیفیت کا اظہار کرتی ہے۔ن۔م۔ راشد نے تاروں کے بکھرتے ہوئے غبار اور ایوانوں کے لڑکھڑاتے چراغ کا مفہوم تہذیب کا شیرازہ لیا ہے۔بعض نقّادوں نے اسے جہانِ نو کا انتظار قرار دیا ہے۔

04.09 خلاصہ

فیضؔ کا پورا نام فیض احمد خاں تھا۔وہ ۱۳رفروری ۱۹۱۱ء کو ضلع سیال کوٹ کے قصبے قادر میں پیدا ہوئے۔والدِ محترم کے زمانے میں اُنہوں نے بڑی خوش حال زندگی گزاری۔فیضؔ نے انگریزی اور عربی میں ایم۔اے کیا۔فیضؔ کی تعلیمی زندگی شروع سے آخر تک فرسٹ کلاس ہے۔فیضؔ درس و تدریس سے وابستہ ہوئے پھر فوج میں ملازم ہو گئے۔انگریزی روزنامہ ''پاکستان ٹائمز، اِمروز'' او ہفت روزہ ''لیل و نہار'' کے چیف ایڈیٹر رہے۔قیامِ پاکستان کے تین برس بعد راوَل پنڈی سازش کیس میں ۱۹۵۱ء میں گرفتار کر لیے گئے۔اپریل ۱۹۵۹ء میں اُنہیں رہائی نصیب ہوئی۔فیضؔ کا انتقال ۲۰رنومبر ۱۹۸۴ء کو ہوا۔

''نقشِ فریادی، دستِ صبا، زنداں نامہ، دستِ تہِ سنگ، سرِ وادیِ سینا، شامِ شہرِ یاراں اور میرے دل میرے مسافر'' وغیرہ اُن کے شعری مجموعے ہیں۔اس کے علاوہ اُن کے نثری مضامین، خطوط کے مجموعے اور سفرنامے بھی ہیں۔فیضؔ کی شاعری کی ابتدا ۱۹۲۸ء سے ہوئی۔ اُن کی پہلی نظم ''میرے معصوم قاتل'' ہے۔فیضؔ نے ابتدا میں رومانی شاعری کی لیکن وہ بہت جلد حقیقت کی طرف راغب ہو گئے۔فیضؔ کی شاعری میں رومان و حقیقت کی دھوپ چھاؤں ابتدا سے انتہا تک ہے۔وہ رومان اور حقیت کے دوراہے پر کھڑے نظر آتے ہیں۔''سرودِ شبانہ، مری جاں! اب بھی اپنا حُسن واپس پھیر دے مجھ کو اور میرے ندیم'' وغیرہ اُن کی رومانی نظمیں ہیں۔اُن کی نظموں ''تنہائی اور انتظار'' کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔فیضؔ کی رومانی شاعری میں جدائی کی خاموش تڑپ ہے۔

''سرودِ شبانہ، تہِ نجوم، یاس اور ایک منظر'' فیضؔ کی مصوّری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔''مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب! نہ مانگ'' میں فیضؔ حقیقت کی طرف نظر آتے ہیں۔''چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز'' اُن کی پہلی سیاسی نظم ہے۔''اے دلِ بے تاب ٹھہر، سوچ، کتے، بول، صبحِ آزادی اور ترانہ'' وغیرہ اُن کی سیاسی نظمیں ہیں۔اسیری کے دوران فیضؔ نے بہترین شاعری کی۔''نثار میں تری گلیوں پہ، یاد، اے روشنیوں کے شہر، ملاقات، دریچہ، درد آئے گا دَبے پاؤں اور ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے'' وغیرہ یادگار نظمیں ہیں۔ظلم واستبداد کے خلاف جہاں بھی تحریکیں چلائی گئیں فیضؔ نے اُن کی تائید کی اور ''آجاؤ ایفریقا، سرِ وادیِ سینا'' جیسی نظمیں لکھیں۔فیضؔ کی شاعری میں قدیم و جدید کا حسین سنگم ملتا ہے۔وہ کوچۂ یار سے تختۂ دار تک کا سفر کرتے ہیں۔اُن کے یہاں سنتِ منصور و قیس ملتی ہے۔

اس اکائی میں فیضؔ کی زندگی، تعلیم و تربیت، ملازمت، کارنامے اور تصنیفات کے ساتھ ساتھ اُن کی نظم نگاری کی خصوصیات اور اُن کی اہم نظموں ''یاد اور تنہائی'' کا متن و تجزیہ پیش کیا گیا ہے جس کے ذریعے آپ کی معلومات میں یقیناً اضافہ ہوا ہوگا۔

04.10 فرہنگ

افلاک	:	فلک کی جمع، آسمان	سرمایہ داری	:	دولت مندی
ایاغ	:	پیالہ	سمن	:	ایک سفید پھول
تاب ناک	:	چمک	شرار	:	چنگاری، پتنگا
حریری	:	ریشمی	شفق	:	اُفق کی سرخی
خاشاک	:	کوڑا کرکٹ	عرصہ	:	وقت، مدت
خس	:	کوڑا، گھاس	غمزہ	:	اشارہ
خوابیدہ	:	سویا ہوا	قربت	:	نزدیکی
داغ بیل	:	بنیاد	لرزاں	:	کانپتا ہوا
دوام	:	ہمیشگی	مجرّد ذات	:	غیر جسمانی چیزیں
ربط	:	میل جول	مصائب	:	مصیبت کی جمع، پریشانیاں
صبحِ فراق	:	جدائی کی صبح	مے	:	شراب
سراب	:	پانی کی مانند چمکتی ہوئی ریت	مینا	:	شراب کا شیشہ، برتن
سراغ	:	پتہ	ہجر	:	جدائی

04.11 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر ۱ : نظم ''تنہائی'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں کیجیے؟

سوال نمبر ۲ : فیض احمد فیضؔ کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم کے بارے میں بتائیے؟

سوال نمبر ۳ : فیض احمد فیضؔ کی ملازمت اور گرفتاری کے بارے میں اظہارِ خیال کیجیے؟

تفصیلی سوالات

سوال نمبر ۱ : نظم ''یاد'' کا تجزیہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے؟

سوال نمبر ۲ : فیض کی شاعری میں تنہائی اور انتظار پر ایک مضمون لکھیے؟

سوال نمبر ۳ : فیض احمد فیضؔ کے حالاتِ زندگی پر ایک مفصل مضمون لکھیے؟

سوال نمبر ۴ : فیض کی رومانی شاعری سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیجیے؟

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ بلدیہ کے ریکارڈ کے مطابق فیضؔ کی تاریخِ پیدائش کون سی ہے؟

(الف) ۷؍جنوری ۱۹۱۱ء (ب) ۷؍جنوری ۱۹۱۲ء (ج) ۱۳؍فروری ۱۹۱۱ء (د) ۱۳؍فروری ۱۹۱۲ء

سوال نمبر۲ فیض کی پہلی سیاسی نظم کون سی ہے؟

(الف) سرودِشبانہ (ب) کتے (ج) سوچ (د) چندروز اور مری جان! فقط چند ہی روز

سوال نمبر۳ فیض کی پوری تعلیمی زندگی کیسی رہی ہے؟

(الف) فرسٹ ڈویژن (ب) سیکنڈ ڈویژن (ج) تھرڈ ڈویژن (د) ناکام

سوال نمبر۴ فیض نے انگلش کے علاوہ دوسری کس زبان میں ایم۔اے کیا؟

(الف) اردو (ب) فارسی (ج) عربی (د) ہندی

سوال نمبر۵ فیض کا انتقال کس شہر میں ہوا؟

(الف) راوَل پنڈی (ب) لاہور (ج) کراچی (د) دیگر کوئی

سوال نمبر۶ نظم ''یاد'' کے علاوہ دوسری کون سی نظم شاملِ نصاب ہے؟

(الف) کتے (ب) تہِ نجوم (ج) بول (د) تنہائی

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱	: (ج) ۱۳؍فروری ۱۹۱۱ء	جواب نمبر۴	: (ج) عربی
جواب نمبر۲	: (د) چندروز اور مری جان! فقط چند ہی روز	جواب نمبر۵	: (ب) لاہور
جواب نمبر۳	: (الف) فرسٹ ڈویژن	جواب نمبر۶	: (د) تنہائی

04.12 حوالہ جاتی کتب

۱۔ شاعری کی تنقید از ابوالکلام قاسمی

۲۔ فیض احمد فیضؔ عکس اور جہتیں از شاہد ماہلی

۳۔ اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ از سُنبل نگار

۴۔ جدید نظم حالیؔ سے میراجی تک از کوثر مظہری

۵۔ جدید شاعری از عبادت بریلوی

۶۔ فیض احمد فیضؔ تنقیدی جائزہ از خلیق انجم

۷۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک از خلیل الرحمٰن اعظمی

✲

اکائی 05 : اسرارالحق مجازؔ ''نذرِعلی گڑھ''

ساخت :

05.01 : اغراض ومقاصد
05.02 : تمہید
05.03 : اسرارالحق مجازؔ کے حالاتِ زندگی
05.04 : اسرارالحق مجازؔ کی نظم نگاری
05.05 : نظم ''نذرِعلی گڑھ'' متن
05.06 : نظم ''نذرِعلی گڑھ'' تجزیہ
05.07 : خلاصہ
05.08 : فرہنگ
05.09 : سوالات
05.10 : حوالہ جاتی کتب

05.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ اسرارالحق مجازؔ کی حیات، تعلیم وتربیت، شخصیت، ملازمت، کارناموں، نظم نگاری، خصوصیات اور اُن کی ایک اہم نظم ''نذرِعلی گڑھ'' کا مطالعہ کریں گے نیز نظم نگاری میں اُن کی نمایاں خدمات، حیثیت، مقام ومرتبے اور فنّی خصوصیات سے متعلق معلومات حاصل کریں گے۔

05.02 تمہید

اسرارالحق مجازؔ بیسویں صدی کے ایک ممتاز، صاحبِ طرز اور انقلابی شاعر ہیں۔اُن کی شاعری کا آغاز ایک ایسے دَور میں ہوا جب پرانی اقدار کا دامن ہندوستانیوں کے ہاتھوں سے چھوٹ چکا تھا اور نئی قدروں کا جنم ہو رہا تھا۔لوگوں کی زندگی ایک خاموش انقلاب سے گلے مِل رہی تھی۔ اردو ادب بھی اِس تبدیلی کو پُرزور لبیک کہہ رہا تھا۔ایک طرف اقبالؔ اپنی فکری،فنی اور فلسفیانہ نظموں کے ذریعے نئے منارے روشن کر رہے تھے تو دوسری طرف پریم چند لوگوں کو زمینی حقائق سے آگاہ کر رہے تھے۔اِن کے علاوہ اخترؔ شیرانی،اصغرؔ گونڈوی، حسرتؔ موہانی، نیازؔ فتح پوری، مجنوںؔ گورکھ پوری، جوشؔ ملیح آبادی،حفیظؔ جالندھری، فانیؔ بدایونی، یگانہؔ چنگیزی، جگرؔ مرادآبادی اور ساغرؔ نظامی وغیرہ اپنے اپنے نغمے الگ الگ انداز سے گا رہے تھے۔ایسے دَور میں مجازؔ نے اُس نئے احساس کو اپنی شاعری میں ادا کرنے کی کوشش کی جو نئی نسل کو زندگی کے بدلتے ہوئے تجربات سے حاصل ہو رہا تھا۔اُن کے اِس طرزِ احساس میں بہت کچھ منفرد، الگ اور نیا تھا۔

05.03 اسرارالحق مجازؔ کے حالاتِ زندگی

اسرارالحق مجازؔ کی پیدائش ۱۹؍اکتوبر ۱۹۱۱ء کو یوپی کے ضلع بارہ بنکی کے قصبہ ردولی میں ہوئی۔ اُن کے والدِ محترم کا نام چودھری سراج الحق تھا جو لکھنؤ میں محکمۂ رجسٹریشن میں ہیڈ کلرک تھے اور دادا کا نام چودھری احمد حسین تھا جو متوسط درجے کے زمین دار تھے۔

﴿۱﴾ **بچپن:** مجازؔ کا گھرانہ ایک خوش حال زمین دار گھرانہ تھا۔ اِس لئے اُن کا بچپن انتہائی عیش و آرام اور خوش حالی میں گزرا مزید یہ کہ اُن سے بڑے ایک بھائی جو کہ تقریباً ڈھائی سال کے تھے اُن کا وصال ہوگیا جس کے باعث اسرارالحق مجازؔ کے لاڈ، پیار میں مزید اضافہ ہوگیا اور اُن پر خاص توجہ اور نظرِ عنایت ہوگئی۔ بیگم حمیدہ سالم نے اپنے مضمون ''جگن بھیّا'' میں مجازؔ کے بچپن کی جو تصویر کشی کی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بچپن میں شریر اور جھگڑالو قسم کے تھے۔ کھلونوں کو توڑنا، دوسروں کے حصے کی چیزیں کھانا، ہمیشہ اپنے حق میں فیصلہ کروانا اور گلی، ڈنڈا کھیلنا اُن کے پسندیدہ مشاغل تھے۔ حُسن سے مجازؔ کو بچپن سے محبت تھی۔ بیگم حمیدہ سالم لکھتی ہیں:

> ''کوئی خوب صورت بیوی دیکھ لیتے بس دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر گھنٹوں اُن کے پاس بیٹھے رہتے۔ کھیل کود، کھانے پینے کسی چیز کا ہوش نہ رہتا۔ میری پیدائش کے وقت لکھنؤ سے ایک خوب صورت دلہن بیاہ کر رُدولی آئی تھیں اُن کا نام حمیدہ تھا۔ اُن کے پیچھے جگن بھیّا کی دیوانگی کا عالم یہ تھا۔ میرا نام ذکیہ رکھا گیا تھا۔ ضد کر کے بدلا اور (اُن خاتون کے نام پر) حمیدہ رکھ دیا۔ جانے محض چاہت میں یا اِس اُمید پر کہ شاید نام ہی کی لاج......میں خوب صورت نکل جاؤں۔''

﴿۲﴾ **تعلیم:** مجازؔ کی روایتی تعلیم رُدولی کے ایک مکتب میں ہوئی۔ اُس کے بعد وہ لکھنؤ چلے آئے۔ امین آباد ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا جہاں اُن کے فارسی کے استاد اُن کے بعد کے قریبی دوست فرحت اللہ انصاری کے والد تھے۔ مجازؔ پڑھنے میں بہت تیز تھے۔ حساب میں تو خاص طور پر بہت دست رَس تھی۔ اس کے علاوہ ہاکی، جمپنگ (کودنا) وغیرہ کے بہت دل دادہ تھے۔ امین آباد ہائی اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد مجازؔ کے والد کا تبادلہ آگرہ ہوگیا اِس لئے مجازؔ آگرہ چلے گئے۔ آگرہ میں ۱۹۲۹ء میں اُنھوں نے سینٹ جانس کالج، آگرہ میں ایف۔ ایس۔ سی میں داخلہ لیا۔ آگرہ میں ہی مجازؔ کی ملاقات معین احسن جذبیؔ سے ہوئی جو اُن کے کلاس میٹ تھے۔

میکشؔ اکبرآبادی سے تعلقات یہیں پر قائم ہوئے۔ میکشؔ سے ملاقات جذبیؔ کے ذریعے ہوئی اور پھر میکشؔ کی وساطت سے مجازؔ، فانیؔ تک پہنچے۔ ان کے علاوہ آگرہ میں قیام کے دَوران آل احمد سرور اور حامد حسن قادری سے ملاقاتیں ہوئیں اور تعلقات بھی قائم ہوئے۔ ان ملاقاتوں اور تعلقات نے مجازؔ کی ادبی زندگی میں ایک روح پھونکی اور پھر یہیں مجازؔ نے اپنے کلام پر فانیؔ بدایونی سے اصلاح لی۔ مجازؔ کو آگرہ ہی میں اپنی بہترین غزل کے لئے ''گولڈ میڈل'' سے نوازا گیا۔ حامد حسن قادری نے آگرہ میں ''انجمن ترقی اردو'' کی شاخ قائم کی۔ اس ادبی ماحول نے مجازؔ کو متاثر کیا اور اُن کی فکر کو اُجاگر کرنے، صلاحیتوں کو چمکانے اور اُن کے اچھوتے جذبات کے اظہار کے لئے مواقع فراہم کرنے میں معاون ثابت ہوا۔

۱۹۳۰ء میں مجازؔ کے گھر والے آگرہ سے علی گڑھ آگئے اور یہاں اُنھوں نے ۱۹۳۱ء میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں آرٹ میں داخلہ لیا۔ جہاں اُن کے مضامین فلسفہ، معاشیات اور اُردو تھے۔ دسمبر ۱۹۳۳ء میں انجمن حدیقۃ الشعرا کے سالانہ مشاعرے میں شریک ہوئے جس

کی صدارت سرراس مسعود وائس چانسلر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے کی تھی اور جس میں حسرتؔ موہانی، اصغر گونڈوی اور حفیظؔ جالندھری جیسے شعرا شامل تھے۔

مجازؔ نے ''صبحِ بہار'' کے موضوع پر ایک پُر اثر اور پُر سوز نظم سُنا کر داد وتحسین حاصل کی۔ علی گڑھ کی خوش گوار ادبی فضا سے مجازؔ کا یہ پہلا تعارف تھا۔ علی گڑھ کی فضا میں اُن کی شاعری نے کُھل کر سانس لی۔ مجازؔ نے اس دوران اپنی شروعاتی بعض کامیاب نظمیں لکھیں۔ اس دوران اُن کے محبوب شعرا جوشؔ ملیح آبادی، اخترؔ شیرانی اور حفیظؔ جالندھری ہوا کرتے تھے۔ علی سردار جعفری لکھتے ہیں:

''جوشؔ کی رندی اور بے باکی، اخترؔ شیرانی کی معصومیت اور رنگینی اور حفیظؔ کی نغمگی نے اس کو متاثر کیا تھا اور جب رندی اور بے باکی، معصومیت اور رنگینی نے مجازؔ کی شاعری میں تحلیل ہو کر ایک نیا روپ اختیار کیا تو ترقی پسند تحریک کی ابتدائی دَور کی سب سے حسین شاعری پیدا ہوئی۔''

(شاعرِ شہرِ نگاراں)

علی گڑھ میں قیام کے دوران مجازؔ کی عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، حیات اللہ انصاری اور علی سردار جعفری جیسی شخصیات سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ اِس دوران اُنہوں نے ۱۹۳۵ء میں بی.اے پاس کرلیا اور ایم.اے اردو میں داخلہ بھی لے لیا۔ بطورِ شاعر مجازؔ کی شہرت و مقبولیت کو دیکھتے ہوئے پرانی روایت کو نظر انداز کرتے ہوئے اُنہیں سالِ اوّل کا طالبِ علم ہونے کے باوجود میگزین کا ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ وہ مسلم یونی ورسٹی میں تقریباً پانچ سال تک رہے۔ اُن کی زندگی کے یہی پانچ سال اُن کے ذہنی سکون کے تھے۔ اُنہیں یہاں مسرّت افزا ماحول، پُر کشش فضا اور زندگی کی رعنائیوں سے ہم کنار ہونے کا موقع ملا۔ علی گڑھ کے پانچ سال اُن کی زندگی میں ایک نئے انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ یہاں اُنہوں نے ترقی پسند تحریک سے خود کو وابستہ کیا۔ انقلاب کے نعرے لگائے اور خوش حال زندگی کے خواب دیکھے۔ کچھ مہینوں کے بعد ہی اُن کو دہلی میں ملازمت مل گئی اور وہ ایم.اے پورا کیے بغیر ہی دہلی چلے گئے۔

﴿۳﴾ **ملازمت:** مجازؔ ۱۹۳۵ء میں آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہوئے۔ اُن کی یہ ملازمت تقریباً سال بھر رہی۔ وہ آل انڈیا ریڈیو کے اردو رسالے ''آواز'' کے سب ایڈیٹر بھی تھے۔ اِس رسالے کا نام مجازؔ کا ہی تجویز کردہ تھا۔ ریڈیو کے پروگراموں کا آغاز بھی مجازؔ کی غزل سے ہوا تھا جس کا مطلع ہے:

سارا عالم گوش بر آواز ہے
آج کن ہاتھوں میں دل کا ساز ہے

دہلی میں قیام کے دوران اُن کی زندگی میں شاعری اور شراب کی کثرت ہوگئی۔ اُن کی شاعری ترقی کے زینے چڑھنے لگی۔ شراب کی لَت زیادہ ہوگئی اور اُنہیں ایک چنچل، شوخ، البیلی اور عیش وعشرت کی عادی لڑکی سے محبت ہوگئی۔ اِس معاشقے کا ذکر آل احمد سرور، فرحت اللہ انصاری اور بیگم حمیدہ سالم نے بھی کیا ہے۔ ریڈیو کی ملازمت ختم ہونے کے بعد مجازؔ لکھنؤ چلے گئے۔ لکھنؤ میں سبطِ حسن کی نگرانی میں ''پرچم'' نکالنا شروع کیا جس کے معاونین میں سے ایک مجازؔ تھے۔ ۱۹۳۵ء میں مجازؔ نے سبطِ حسن اور علی سردار جعفری کے ساتھ مل کر ''نیا ادب'' نام سے ایک ادبی رسالہ نکالا۔ یہیں پر ۱۹۴۰ء میں مجازؔ پر جنون کا پہلا دَورہ پڑا۔ ۱۹۴۳ء میں مجازؔ ہارڈنگ لائبریری میں بحیثیتِ اسسٹنٹ لائبریرین مقرّر

ہوئے جب کہ آل احمد سرور اور شاعر رفعت سروش نے لکھا ہے کہ وہ لائبریری میں بحیثیتِ کلرک تھے۔ ۱۹۴۵ء میں اُن کا مجموعۂ کلام ''شبِ تاب'' شائع ہوا۔ اسی دوران اُنہوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور ۱۹۴۵ء میں ہی اُن پر جنون کا دوسرا دورہ پڑا۔ ۱۹۴۹ء میں مجازؔ کراچی پاکستان مشاعرے میں شرکت کی غرض سے تشریف لے گئے۔ جہاں اُن کی ملاقات اُن کے پرانے دوست نصیر حیدر سے ہوئی۔

پاکستان سے واپس آنے کے بعد ۱۹۵۲ء میں جنون کا تیسرا دورہ پڑا تو اُنہیں رانچی مینٹل اسپتال میں داخل کروایا گیا جہاں وہ تقریباً چھ مہینے رہے۔ صحت یاب ہونے کے بعد جب گھر لوٹے تو اُن کی بہن صفیہ اختر کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس صدمے کے بعد مجازؔ نے شراب چھوڑ دی اور بہن کے بچوں کے ساتھ اپنا زیادہ تر وقت گزارنے لگے۔ احباب نے پھر اُنہیں شراب پینے پر مجبور کر دیا۔ بالآخر ۵ر دسمبر ۱۹۵۵ء کو بلرام پور اسپتال میں مجازؔ کا انتقال ہوا اور ۶ر دسمبر کو لکھنؤ کے نشاط گنج قبرستان میں اُن کو سپردِ خاک کیا گیا۔ اُن کے جنازے میں مسلمان، ہندو اور سکھ کثیر تعداد میں شریک تھے۔

05.04 : اسرار الحق مجازؔ کی نظم نگاری

مجازؔ نے جب میدانِ شاعری میں قدم رکھا تو اُن کے لئے ترقی پسند تحریک کا پلیٹ فارم موجود تھا۔ مجازؔ کے سامنے شاعری کے آسمان پر سرورؔ جہان آبادی، علامہ اقبالؔ، پنڈت برج نرائن چکبستؔ، ابوالاثر حفیظؔ جالندھری، اخترؔ شیرانی، اصغرؔ گونڈوی اور جگرؔ مرادآبادی جیسے شعرا درخشندہ ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ اِن شعرا کے درمیان میں اپنے وجود کا احساس دلانا بہت بڑی بات تھی۔ کہیں کہیں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا جا رہا تھا۔ آغاز میں مجازؔ پر رومانی کیفیت چھائی رہی اور وہ غزل ہی کہتے رہے مثلاً:

تیرے گناہ گار گنہ گار ہی سہی تیرے کرم کی آس لگائے ہوئے تو ہیں
آنکھ سے آنکھ جب نہیں ملتی دل سے دل ہم کلام ہوتا ہے
یہ میرے عشق کی مجبوریاں معاذ اللہ تمہارا راز تُمھی سے چھپا رہا ہوں میں

لیکن ۱۹۳۲ء کے بعد اُن کی شاعری کے مزاج میں تبدیلی آنے لگی۔ ۱۹۳۳ء میں مجازؔ نے مشہور نظمیں ''رات اور ریل اور انقلاب'' کہیں جن میں ایک نئے پن اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ ''رات اور ریل'' میں کہیں کہیں استعاراتی انداز میں انسانی وجود اور مقاصدِ زندگی کی طرف لطیف اشارے ملتے ہیں:

چھیڑتی اک وجد کے عالم میں سازِ سرمدی غیظ کے عالم میں منہ سے آگ برساتی ہوئی
آگے آگے جستجو آمیز نظریں ڈالتی شب کے ہیبت ناک نظاروں سے گھبراتی ہوئی
ایک اِک حرکت سے اندازِ بغاوت آشکار عظمتِ انسانیت کے زمزمے گاتی ہوئی

مجازؔ کے شعری مزاج، ذہنی وفکری رویّے اور تفکراتی پرواز کی راہیں متعین کرنے والا علی گڑھ کا ماحول تھا جس میں حُسن ونغمہ، ساز وجام اور تیغ وسنان کی بڑی حسین آمیزش تھی۔ اُس ماحول نے وضع داری، خوش اخلاقی، مروّت، شرافت، خوش مذاقی اور انسان دوستی کی اقدار کو تکمیل بخشی جو اُنہیں اپنے گھرانے سے وراثت میں ملی تھی۔ حُسن پرستی کا جو جوہر اُن کی فطرت میں قدرتی طور پر ودیعت کیا گیا تھا اُس کو جلا علی گڑھ ہی میں ملی۔ علی گڑھ میں اُن کی خواتین کے درمیان بے پناہ مقبولیت کی وجہ سے اُن کا رومانی انداز اُبھر کر سامنے آیا۔

یہیں مجاؔز کی ملاقات ڈاکٹر اشرف ،اختر حسین رائے پوری ،آل احمد سرور، حیات اللہ انصاری، جاں نثار اختر ،سبطِ حسن ،علی سردار جعفری اور معین احسن جذبی اور دیگر لوگوں سے ہوئی جو اپنی تحریروں سے ترقی پسند ادب کے ابتدائی نقوش اُجاگر کر رہے تھے۔ اِنہی دوستوں نے مجاؔز کو انقلاب، اشتراکیت اور ترقّی پسندی کے نظریات سے واقف کرایا۔

انسان دوستی کی قدروں اور حُسن پرستی کے تصوّرات نے اُنہیں رومانی اور گداز طبیعت کا مالک بنایا اور اشتراکی نظریات نے شاعرِ انقلاب بنایا لیکن اُن کی شاعری میں رومان و انقلاب کا وجود الگ الگ نہیں بلکہ امتزاجی ہے اور بقولِ فیضؔ اُن کی شاعری میں بیش تر شعرا کے برعکس ان عناصر میں فرضی تضاد کی دیواریں نہیں ملتیں بلکہ شمشیر کی صلابت اور ساز و جام کا گداز دونوں ایک دوسرے میں گھُل مِل گئے ہیں۔

''آزادی، مساوات، آزاد خیالی اور جنسی برابری کا تصوّر'' یہ سب اقدار اُنہیں بہت عزیز تھیں۔ اسی لئے اُن کو اشتراکی نظام پسند تھا کہ وہ اِن سب اقدار کی پاسبانی کرتا ہے۔ اپنی نظم ''خوابِ سحر'' میں وہ اشتراکیت کو ہی منزل قرار دیتے ہیں:

زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں ذہنِ انسانی ہے اب اَوہام کے ظلمات میں
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک اُدھر دیکھا تو ہے کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے

مجاؔز جب اشتراکیت کی رَو میں بہہ کر نظمیں کہتے ہیں تو اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ پاتے اور انقلاب سے ہٹ کر نعرہ بازی کرنے مجبور ہو جاتے ہیں۔ اُن کی نظم ''انقلاب'' کا یہ حصہ ملاحظہ ہو:

جھونپڑوں میں خوں، محل میں خوں، شبستانوں میں خوں
دشت میں خوں، وادیوں میں خوں، بیابانوں میں خوں
پرسکوں صحرا میں خوں، بے تاب دریاؤں میں خوں
دَیر میں خوں ، مسجدوں میں خوں ، کلیساؤں میں خوں

مجاؔز نے ۱۹۳۷ء میں نظم ''سرمایہ داری'' لکھی۔ اس نظم میں اُنہوں نے بہت تلخ حقائق کا انکشاف کیا ہے۔ اس نظم سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کس قدر مہلک اور خطرناک ہے۔

نظم کا یہ حصہ ملاحظہ فرمائیں:

مگر مزدور کے تن سے لہو تک چوس لیتی ہے یہ اپنے ہاتھ میں تہذیب کا فانوس لیتی ہے
محل میں ناچتی ہے، رقص گاہوں میں تھرکتی ہے غریبوں کا مقدّس خون پی پی کر بہکتی ہے
مگر گُل باغِ عالم کو جہنّم کر دیا اِس نے بظاہر چند فرعونوں کا دامن بھر دیا اِس نے

مجاؔز کی شاعری میں اگر کہیں غم و افسردگی کا سایہ نظر آتا ہے تو اُس کا تعلق اُن کی ذاتی زندگی کے المیے کے بجائے پوری نسل کے المیے سے ہے۔ اُن کی یہ نا قابلِ شکست رجائیت اُس سیاسی و سماجی شعور کی دین ہے جس کے اثرات اُن کے زمانے میں نمایاں ہو رہے تھے۔ مجاؔز کی یہ سیاسی بصیرت اور سماجی شعور اُن کی اُن نظموں میں واضح نظر آتا ہے جہاں وہ سماج سے اپنی بے اطمینانی و نا آسودگی پر احتجاج کرتے ہیں۔ کہیں کہیں اُن کے احتجاج میں تلخی آ گئی ہے اور فریاد کی لَو تیز ہو گئی ہے۔ جہاں ایسا ہوا ہے وہاں اُن کی فطری غنائیت اُن کی شاعری کو نعرہ بازی ہونے سے بچانے کی کوشش کرتی نظر آتی ہے مگر یہ نعرے کے طور پر ہی محسوس کی جاتی ہے۔

مجاؔز کی ایک مشہور و معروف نظم ''آوارہ'' ہے۔ یہ اردو شاعری کی ایک شاہ کار اور طویل نظم ہے۔ اِس نظم میں بھی مجاؔز آخر تک پہنچتے پہنچتے جذباتی ہو جاتے ہیں اور نعرے بازی جیسی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے۔

نظم کا یہ بند دیکھیں:

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اُس کے دَمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غمِ دل! کیا کروں ، اے وحشتِ دل! کیا کروں
بڑھ کے اِس اندرسبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اِس کا گلشن پھونک دوں ، اِس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں
اے غمِ دل! کیا کروں ، اے وحشتِ دل! کیا کروں

اِس کے علاوہ ''خانہ بدوش، خوابِ سحر، اِدھر بھی آ، آہنگِ نَو اور اندھیری رات کا مسافر'' وغیرہ مجاؔز کی نمائندہ نظمیں ہیں جن میں ایک عہد کا اجتماعی و انفرادی کرب جھلکتا ہے۔ یہ نظمیں مادی، عملی اور جمالیاتی اقدار کا حسین و بہترین امتزاج ہیں۔

کوثر مظہری کہتے ہیں کہ یہ ایک جذباتی کمزوری ہوتی ہے کہ شعلہ بیانی شاعری میں دَر آتی ہے۔ پختہ فن کار ہمیشہ خود کو جذبات سے مغلوب ہونے سے بچائے رکھتا ہے۔ سردار جعفری نے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ دراصل سیاست سے آلودہ ہو کر آرٹ خراب نہیں ہوتا وہ خراب ہوتا ہے آرٹسٹ کی ذہنی اور جذباتی کمزوریوں سے۔

اِسی خطبے میں آگے کہتے ہیں:

''ادب اور تحریک کا اپنے ملک کی قومی اور انقلابی سیاست سے متاثر ہونا فطری عمل ہے لیکن ادب اور تحریک کو کسی سیاسی جماعت کا آلۂ کار نہیں بنایا جا سکتا۔''

مگر ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعرا خود کو آزاد نہ کرا سکے۔ سیاسی جکڑ بندیاں اُن کی تقدیر کا حصہ بن گئیں۔ کچھ نے دامن جھاڑنے کی کوشش بھی کی مگر کہیں نہ کہیں فارمُولا بندی اور سیاسی رنگ کا ظہور ہو کر ہی رہا۔ اِس تحریک میں دو طرح کے رجحانات تھے۔ ایک کی بنیاد سیاست پر تھی اور دوسرے کی ادب پر۔ عمرانی پہلوؤں اور سماجی اُمور کی پیش کش کے ساتھ ساتھ حُسن کو برقرار رکھنے میں ترقی پسند شعرا میں فیضؔ، مخدومؔ، ساحرؔ، مجاؔز اور مجروحؔ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ مجاؔز کی نظموں میں سماجی شعور کی پختگی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ تخریب میں تعمیر کا پہلو دیکھتے ہیں۔ وہ معاشرے کی تہذیبی روایت اور اشتراکیت کو ہم آہنگ کر کے ظلمت میں نور دیکھنے کی دعوت دیتے ہیں مثلاً:

تقدیر کچھ ہو ، کاوشِ تدبیر بھی تو ہے تخریب کے لباس میں تعمیر بھی تو ہے
ظلمات کے حجاب میں تنویر بھی تو ہے آ منتظر ہے عشرتِ فردا اِدھر بھی آ

مجاز کی شاعری کا خمیر ہندوستانی تہذیب وثقافت سے تیار ہوتا ہے۔ اِس خمیر میں رام، گوتم، شیخ و برہمن، ابنِ مریم، مسجد کے خطبات اور مندر کیا شلوک سب کی جھلکیاں ہیں۔ نظم ''خوابِ سحر'' کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

آسمانوں سے فرشتے بھی اُترتے ہی رہے نیک بندے بھی خدا کا کام کرتے ہی رہے
ابنِ مریم بھی اُٹھے، موسیٰ و عمراں بھی اُٹھے رام و گوتم بھی اُٹھے، فرعون و ہاماں بھی اُٹھے
مسجدوں میں مولوی خطبے سناتے ہی رہے مندروں میں برہمن اشلوک گاتے ہی رہے

اور آگے دیکھیے کہ مجاز کی نگاہ دوربین وخوردبین کی طرح کہاں تک پہنچتی ہے:

اک نہ اک دَر پر جبینِ شوق گھستی ہی رہی آدمیّت ظلم کی چکی میں پستی ہی رہی
رہبری جاری رہی ، پیغمبری جاری رہی دین کے پردے میں جنگِ زرگری جاری رہی

مجاز نے اپنی نظموں میں جس عورت کا تصوّر پیش کیا ہے وہ باحیا بھی ہے اور باہمت بھی ہے۔ اُس کے اندر علَمِ بغاوت اُٹھانے کا جوش وجذبہ بھی ہے۔ وہ ہر میدان میں مرد کے شانہ بشانہ چل سکتی ہے۔ خلیل الرّحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

''مجاز جس عورت سے محبت کرتا ہے وہ بے باک اور سرکش ہوتے ہوئے بھی نسائی دل کشی اور مریمی شان رکھتی ہے...... یہ عورت اُن بے پردہ، بیبیوں سے مختلف ہے جنہیں دیکھ کر اکبرالہٰ آبادی غیرتِ قومی سے زمین میں گڑ گئے تھے۔''

عورت کے تصوّر کو مجاز نے جس طرح پیش کیا ہے اُس میں لذّتیت اور سطحی پن نہیں ہے۔ ''عیادت، مادام، بتانِ حرم، نوجوان خاتون سے، نذرِ خالدہ اور ننھی پجارن'' جیسی نظموں کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مجاز نے ''عورت'' کو تلذّذ کا سامان نہیں سمجھا ہے بلکہ یہاں ایک طرح کے پُر وقار اور تہذیبی رکھ رکھاؤ کا احساس ہوتا ہے۔ بازاری پن اور سستے جذبات سے مجاز نے خود کو مغلوب نہیں ہونے دیا ہے۔ ایسا اس لئے ہوسکا ہے کہ مجاز کا شعور بیمار نہیں بلکہ توانا ہے، رکیک نہیں بلکہ صالح ہے۔

مجاز انسانی رشتوں کا مغنّی ہے۔ وہ نوعِ انسانی کا پرستار ہے۔ جب معاشرے میں کسی پر ظلم ہوتا ہے یا کسی کے ساتھ ناروا سلوک ہوتا ہے تو فوراً اُس کی مذمت کرتے ہیں۔ اُن کے سامنے خانہ بدوشوں کی زندگی بھی ہے اور اُمرا کی عیش پسندی بھی۔ نام نہاد تہذیب اور کلچر کو وہ خوب سمجھتے ہیں۔ نظم ''خانہ بدوش'' میں خانہ بدوشوں کی زندگی اور کلچر کے نقوش ملتے ہیں۔ خانہ بدوشوں کا کہیں مستقل ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ اُن کے گھر اُن کے دوش پر ہوتے ہیں۔ اُن کا طرزِ رہائش اور طریقۂ خورد ونوش سب ہماری تہذیبی زندگی سے واضح تفاوت رکھتا ہے مثلاً:

بستی سے تھوڑی دور چٹانوں کے درمیاں ٹھہرا ہوا ہے خانہ بدوشوں کا کارواں
میلے پھٹے لباس میں کچھ دیویاں بھی ہیں سب زندگی سے تنگ بھی ہیں، سرگراں بھی ہیں
پیسہ اگر ملے تو حمیّت بھی بیچ دیں روٹی کا آسرا ہو تو عزّت بھی بیچ دیں

اِس نظم کا وہ حصہ بہت اہم ہے جس میں اِس خانہ بدوش قوم کی تاریخ کا بیان ہے۔ یہ تلمیحی طرزِ اظہار قدیم قبائلی تہذیب سرزمینِ عرب کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اِس نظم میں ماضی کی جھلکیاں دیکھیے:

اُٹھے ہیں جس کی گود سے آذر وہ قوم ہے　　توڑے ہیں جس نے چرخ سے اختر وہ قوم ہے
پلٹے ہیں جس نے دَہر کے دفتر وہ قوم ہے　　پیدا کیے ہیں جس نے پیمبر وہ قوم ہے
اب کیوں شریکِ حلقۂ نوعِ بشر نہیں　　انسان ہی تو ہیں یہ کوئی جانور نہیں

مجاؔز کونوعِ انسانی سے محبت ہے۔ وہ مسلک اور عقیدے کے لحاظ سے صاف کہتے ہیں۔ وہ دھرم اور مذہب سے اوپر اُٹھ کر محبت ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ:

کفر و الحاد سے نفرت ہے مجھے
اور مذہب سے بھی بے زار ہوں میں

کوثر مظہری اپنی کتاب ''حالؔی سے میرا جی تک'' میں لکھتے ہیں:

''مجاؔز کے افکار میں سرمایہ داری کے منفی اثرات اور انقلاب دونوں موجود تھے۔ ورنہ مجاؔز تو بے شک مطرب ونغمہ نگار ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مجاؔز کو انسانیت سے اُنسیت ہے۔ تفریق کی دیوار کو وہ قابلِ مذمّت تصوّر کرتے ہیں۔ اُنہیں مساوات اور انسانی تہذیب کی اساس پر تعمیر شدہ معاشرہ پسند ہے۔ کھوکھلی اور نام نہاد تہذیب سے اُنہیں کوئی سروکار نہیں۔''

مجاؔز کے نظریۂ حیات اور انسانی عظمت کے تصوّر کو سمجھنے کے لئے ''آہنگِ جنوں'' کے یہ دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

نہ واعظ ہوں، نہ ناصح ہوں، نہ ہادی ہوں، نہ رہبر ہوں　　محبت میرا قرآں ہے، جوانی کا پیمبر ہوں
بغاوت کا علَم بردار ہوں، محشر بداماں ہوں　　فرشتوں نے جسے سجدے کیے ہیں، میں وہ انساں ہوں

مجاؔز کے یہاں عام ترقّی پسند شعرا کی طرح فنی بے راہ روی نہیں ملتی۔ وہ پرانی روایتوں سے انحراف نہیں کرتے۔ اُن کے یہاں کلاسیکی شعرا جیسی باوقار سادگی و پرکاری اور ایک سیال نغمگی اور غنائیت ہے جو اُن کی انقلابی نظموں میں نعرے بازی کی کیفیت پیدا نہیں ہونے دیتی۔ وہ اپنی تخلیقات میں نرمی ونزاکت اور حُسن کاری کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ وہ فارسی دانی اور نکھرے ہوئے شعور کی مدد سے وسیع معنویت کی حامل تشبیہات اور تراکیب تراش کر اپنی تخلیقات کو ایسی اثر آفرینی اور معنویت عطا کرتے ہیں جو اُن کے ہم عصروں کے یہاں نہیں ملتی۔

بالآخر فیض احمد فیضؔ کے اس نظریے پر یہ بات ختم ہوجاتی ہے جس کے لئے فیضؔ نے ''آہنگ'' کے دیباچے میں لکھا ہے کہ:

''مجاؔز انقلاب کا ڈھنڈورچی نہیں بلکہ انقلاب کا مطرب ہے۔''

05.05 نظم ''نذرِ علی گڑھ'' متن

سرشارِ نگاہِ نرگس ہوں، پا بستۂ گیسوے سنبل ہوں
یہ میرا چمن ہے میرا چمن، میں اپنے چمن کا بلبل ہوں
ہر آن یہاں صہباے کہن اک ساغرِ نو میں ڈھلتی ہے

کلیوں سے حُسن ٹپکتا ہے، پھولوں سے جوانی اُبلتی ہے
جو طاقِ حرم میں روشن ہے، وہ شمع یہاں بھی جلتی ہے
اِس دشت کے گوشے گوشے سے اک جُوے حیات اُبلتی ہے
اسلام کے اِس بت خانے میں اصنام بھی ہیں اور آذر بھی
تہذیب کے اِس مَے خانے میں شمشیر بھی ہے اور ساغر بھی
یاں حُسن کی برق چمکتی ہے ، یاں نور کی بارش ہوتی ہے
ہر آہ یہاں اک نغمہ ہے، ہر اشک یہاں اک موتی ہے
ہرشام ہے شامِ مصر یہاں ، ہرشب ہے شبِ شیراز یہاں
ہے سارے جہاں کا سوز یہاں اورسارے جہاں کا ساز یہاں
یہ دشتِ جنوں دیوانوں کا ، یہ بزمِ وفا پروانوں کی
یہ شہرِ طرب رومانوں کا ، یہ خلدِ بریں ارمانوں کی
فطرت نے سکھائی ہے ہم کو افتاد یہاں، پرواز یہاں
گائے ہیں وفا کے گیت یہاں، چھیڑا ہے جنوں کا ساز یہاں
اِس فرش سے ہم نے اُڑ اُڑ کر افلاک کے تارے توڑے ہیں
ناہید سے کی ہے سرگوشی ، پروین سے رشتے جوڑے ہیں
اِس بزم میں تیغیں کھینچی ہیں،اِس بزم میں ساغر توڑے ہیں
اِس بزم میں آنکھ بچھائی ہے، اِس بزم میں دل تک جوڑے ہیں
اِس بزم میں نیزے پھینکے ہیں،اِس بزم میں خنجر چومے ہیں
اِس بزم میں گر کر تڑپے ہیں،اِس بزم میں پی کر جھومے ہیں
آ آکے ہزاروں بار یہاں خود آگ بھی ہم نے لگائی ہے
پھرسارے جہاں نے دیکھا ہے، یہ آگ ہمی نے بجھائی ہے
یاں ہم نے کمندیں ڈالی ہیں، یاں ہم نے شب خوں مارے ہیں
یاں ہم نے قبائیں نوچی ہیں، یاں ہم نے تاج اُتارے ہیں
ہر آہ ہے خود تاثیر یہاں، ہر خواب ہے خود تعبیر یہاں
تدبیر کے پائے سنگیں پر جھک جاتی ہے تقدیر یہاں
ذرّات کا بوسہ لینے کو سو بار جھکا آکاش یہاں

خود آنکھ سے ہم نے دیکھی ہے باطل کی شکستِ فاش یہاں
اِس گل کدۂ پارینہ میں پھر آگ بھڑکنے والی ہے
پھر ابر گرجنے والے ہیں ، پھر برق کڑکنے والی ہے
جو اَبر یہاں سے اُٹھّے گا ، وہ سارے جہاں پر برسے گا
ہر جُوے رَواں پر برسے گا ، ہر کوہِ گراں پر برسے گا
ہر سرو وسمن پر برسے گا ، ہر دشت و دمن پر برسے گا
خود اپنے چمن پر برسے گا ، غیروں کے چمن پر برسے گا
ہر شہرِ طرب پر گرجے گا ، ہر قصرِ طرب پر کڑکے گا
یہ اَبر ہمیشہ برسا ہے ، یہ اَبر ہمیشہ برسے گا

05.06 نظم ''نذرِ علی گڑھ'' تجزیہ

یہ مجازؔ کی ایک طویل نظم ہے۔اس نظم میں انہوں نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کومختلف زاویوں سے پیش کیا ہے۔اُس کی خصوصیات اور مختلف الجہات خوبیوں سے قاری کو روشناس کرایا ہے۔پہلے تین اشعار میں مجازؔ کہتے ہیں کہ یہ علی گڑھ میرا چمن ہے اور میں اپنے اِس چمن کا بلبل ہوں۔اِس چمن میں موجود نرگس سے میں سرشار ہوں اور یہاں کے سنبل کی زلفوں سے میرے پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔اِس چمن میں ہر وقت پرانی شراب کونئی شراب کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے۔یہاں کلی کلی سے حُسن ٹپکتا ہے اور پھول پھول سے جوانی اُبلتی ہے یعنی ہر چیز تروتازہ ہے۔جو شے پرانی ہے اُسے بھی یہاں نئی زندگی بخشی جاتی ہے۔

پھر کہتے ہیں کہ جو شمع حرم (کعبہ) کے اندر روشن ہے وہ شمع یہاں بھی روشن ہے اور یہاں کے گوشے گوشے سے زندگی کے چشمے پھوٹتے ہیں۔چوتھے شعر میں کہتے ہیں کہ اسلام کے اِس بت خانے (علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی) میں بت بھی موجود ہیں اور آذر بھی اور اس تہذیب کے مَے خانے میں شمشیر بھی موجود ہے اور شراب بھی۔یہاں حُسن کی بجلیاں چمکتی ہیں۔یہاں نور کی بارش ہوتی ہے۔یہاں سے جو آہ اُٹھتی ہے وہ ایک نغمہ ہوتی ہے اور جو اشک زمین پر گرتا ہے وہ موتی ہوتا ہے۔یہاں جو شام ہوتی ہے وہ مصر کی شام ہوتی ہے اور جو رات ہوتی ہے وہ شبِ شیراز لگتی ہے۔یہاں سارے جہاں کا سوز اور ساز ہے۔

مجازؔ کہتے ہیں کہ یہ چمن (علی گڑھ) دیوانوں کا دشتِ جنوں ہے، پروانوں کی بزم ہے، رومانوں کا شہرِ طرب اور ارمانوں کی جنت ہے۔یہاں ہمیں فطرت نے گرنا بھی سکھایا اور اُڑنا بھی، یہیں ہم نے وفا کے گیت گائے ہیں اور یہیں ہم نے دیوانگی کے راگ الاپے ہیں۔اِسی فرش سے ہم نے اُڑ کر افلاک کے تارے بھی توڑے ہیں اور یہیں ہم نے ناہید سے سرگوشی بھی کی ہے اور پروین سے ہم نے رشتے ناطے بھی جوڑے ہیں۔اِسی بزم میں ہم نے میانوں سے تلواریں بھی نکالی ہیں اور ساغر بھی توڑے ہیں۔اِسی بزم میں ہم نے آنکھیں بھی بچھائی ہیں اور یہیں ہم نے دل بھی جوڑے ہیں۔اِسی بزم میں ہم نے نیزے بھی پھینکے ہیں اور خنجروں کو چوما بھی ہے۔اِسی بزم میں ہم گر گر تڑپے ہیں اور شراب پی کر جھومے بھی ہیں۔

مجاز کہتے ہیں کہ اگر ہم یہاں سے چلے بھی گئے ہیں تو پھر واپس آ کر یہاں ہم نے آگ بھی خود لگائی ہے اور پھر ساری دنیا اِس بات کی گواہ ہے کہ وہ آگ بھی ہمیں نے بجھائی ہے۔ یہاں ہم نے شب خون مارے ہیں اور کمندیں بھی ڈالی ہیں۔ یہاں ہم نے قبائیں بھی نوچیں ہیں اور اُمرا کے تاج بھی اُتار پھینکے ہیں۔ یہاں کی ہر آہ اپنے آپ میں ایک تاثیر ہے۔ یہاں جو خواب ہوتا ہے وہ خود تعبیر ہوتا ہے۔ یہاں تدبیر کے مضبوط قدموں پر تقدیر بھی اپنی پیشانی جھکا دیتی ہے۔ یہاں کے ذرّات کو چومنے کے لئے خود آسمان بھی سیکڑوں بار جھک چکا ہے اور ہم نے خود اپنی آنکھوں سے یہاں بار بار باطل کی شکستِ فاش دیکھی ہے۔

مجاز آخر میں کہتے ہیں کہ اِس پرانے چمن میں پھر آگ بھڑکنے، بادل گرجنے اور برق چمکنے والی ہے اور جو ابر یہاں سے اُٹھے گا وہ سارے عالم پر برسے گا۔ پہاڑ، پتھر، ندی ہر جگہ بارش ہوگی۔ کیا جوے رواں، کیا کوہِ گراں، کیا شہر، کیا محلات ہر جگہ برسے گا اور یہ ابر ہمیشہ برسا ہے اور ہمیشہ برستا رہے گا۔ یہ نظم (نذرِ علی گڑھ) اسرار الحق مجاز کی اعلیٰ ترین نظموں میں شمار کی جاتی ہے جس کے اندر علی مسلم یونی ورسٹی کے اوصاف کو پرویا گیا ہے۔

05.07 خلاصہ

اسرار الحق مجاز ۱۹/اکتوبر ۱۹۱۱ء کو قصبہ ردولی ضلع بارہ بنکی اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والدِ محترم کا نام چودھری سراج الحق تھا۔ وہ رجسٹرار کوآپریٹیو تھے۔ ابتدائی تعلیم ردولی کے ایک مکتب میں ہوئی پھر لکھنؤ اور آگرہ میں تعلیم حاصل کی اور بعد میں علی گڑھ چلے گئے جہاں سے بی۔اے پاس کر کے ایم۔اے میں داخلہ لیا لیکن اسی اثنا میں اُنہیں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازمت مل گئی تو مجاز ایم۔اے مکمل کیے بغیر ہی ملازمت سے وابستہ ہو گئے مگر جلد ہی ملازمت چھوڑ دی۔ ریڈیو کی ملازمت ختم ہونے کے بعد مجاز لکھنؤ چلے گئے۔

لکھنؤ میں سبطِ حسن کی نگرانی میں ''پرچم'' نکالنا شروع کیا جس کے معاونین میں سے ایک مجاز تھے۔ ۱۹۳۵ء میں مجاز نے سبطِ حسن اور علی سردار جعفری کے ساتھ مل کر ''نیا ادب'' نام سے ایک ادبی رسالہ نکالا۔ یہیں پر ۱۹۴۰ء میں مجاز پر جنون کا پہلا دَورہ پڑا۔ ۱۹۴۳ء میں مجاز ہارڈنگ لائبریری میں بحیثیتِ اسسٹنٹ لائبریرین مقرّر ہوئے جب کہ آل احمد سرور اور شاعر رفعت سروش نے لکھا ہے کہ وہ لائبریری میں بحیثیتِ کلرک تھے۔ ۱۹۴۵ء میں اُن کا مجموعۂ کلام ''شبِ تاب'' شائع ہوا۔ اُسی دوران اُنھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور ۱۹۴۵ء میں ہی اُن پر جنون کا دوسرا دَورہ پڑا۔ ۱۹۴۹ء میں مجاز کراچی مشاعرے میں شرکت کی غرض سے تشریف لے گئے جہاں اُن کی ملاقات اپنے پرانے دوست نصیر حیدر سے ہوئی۔ پاکستان سے واپس آنے کے بعد ۱۹۵۲ء میں جنون کا تیسرا دَورہ پڑا تب اُنہیں رانچی مینٹل اسپتال میں داخل کرایا گیا جہاں تقریباً چھ مہینے رہے۔

صحت یاب ہونے کے بعد جب گھر لوٹے تو اُن کی بہن صفیہ اختر کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس صدمے کے بعد مجاز نے شراب چھوڑ دی اور صفیہ اختر کے بچوں کے ساتھ اپنا زیادہ تر وقت گزارنے لگے۔ اُن کے احباب نے پھر اُنہیں شراب پینے پر مجبور کر دیا۔ بالآخر ۵/دسمبر ۱۹۵۵ء کو بلرام پور اسپتال میں اُن کا انتقال ہوا اور ۶/دسمبر کو لکھنؤ کے نشاط گنج قبرستان میں مجاز کو سپردِ خاک کیا گیا۔ اُن کے جنازے میں مسلمان، ہندو اور سکھ کثیر تعداد میں شریک تھے۔ مجاز کے کلام کے تین مجموعے شائع ہوئے۔ پہلے اور تیسرے مجموعے کا نام ''آہنگ'' ہے۔ آہنگ پر فیض نے دیباچہ لکھا ہے۔ دوسرا مجموعہ ''سازِ نو'' کے نام سے موسوم ہے۔

اردو نظم نگاری میں اُن کی حیثیت ایک قدآور نظم نگار کی ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک کے معمارِ اوّلین میں سے ہیں۔ اُن کی شاعری شباب اور شراب و انقلاب کا حسین امتزاج ہے۔ مجاؔز کی شاعری میں ایک نئی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس کو محض جذبات کا اُبال نہیں کہا جا سکتا وہ محض تخیل کی پیداوار نہیں بلکہ اس میں عقل و شعور کی فراوانی ہے اور اس منزل تک پہنچنے میں اس کو کئی منازل سے گزرنا پڑتا ہے۔ آغاز میں ایک جذباتی لے ملتی ہے اور ایک قسم کی جھنجھلاہٹ کا احساس ہوتا ہے۔ ایک طرح کی شدّت اور انتہا پسندی نظر آتی ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس میں توازن پیدا ہوتا جاتا ہے اور شعور کی فراوانی اس میں ایک رکھ رکھاؤ پیدا کر دیتی ہے۔

اس منزل پر پہنچ کر وہ ایسی شاعری نہیں رہ جاتی جو محض انقلابی ہو بلکہ اس میں حرّیت اور آزادی، اخوّت اور محبت، انسان دوستی اور مساوات کے خیالات رونما ہونے لگتے ہیں۔ مجاؔز کی اس انقلابی شاعری میں زندگی اور انسانیت کے بارے میں ایک بہت واضح نقطۂ نظر ملتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کی بنیادیں حکیمانہ شعور پر اُستوار نظر آتی ہیں اور یہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

05.08 فرہنگ

اُخوّت	بھائی چارہ	رندی	شرابی
اُستوار	مضبوط	رومانی	افسانوی
اشتراکی نظام	جمہوری نظام	زمزمے	گیت، نغمے
امتزاج	سنگم، آمیزش، ملاوٹ	سرشار	لبالب، لبریز، مست ہونا
انکشاف	کھولنا، کھلنا	سَرمدی	ہمیشگی، دائمی
بغاوت	خلاف ہونا، دنگا	شبستاں	مکان، خواب گاہ
پُراثر	اثر سے بھرا ہوا	شعور	عقل
پُرسوز	سوز سے بھرا ہوا	صحت یاب	شفا پانا
پروین	ثریا	فراوانی	زیادتی
تجربات	تجربہ کی جمع، آزمائش	قصرِ سلطاں	بادشاہوں کے محلات
تخیل	خیال میں لانا	کوہِ گراں	بھاری پہاڑ
تضاد	مخالف، ضد	لَت	عادت
جنون	دیوانگی، سودا	معاون	مددگار
جدِ امجد	دادا	معصومیت	بے گناہی
جوہر	بیش قیمت، ہر چیز کی اصل یا خلاصہ	منفرد	الگ
جوئے رواں	بہتا ہوا دریا، ندی، نالہ	مہلک	ہلاک کرنے والا

حریت	:	آزادی	ناہید	:	ستارۂ زہرہ
حکیمانہ	:	عقل مندانہ	وابستہ	:	متعلق، باندھا ہوا
خمیر	:	گندھا ہوا، مایہ	واضح	:	صاف، ظاہر
خوش حال	:	اچھی زندگی گزارنے والا	وراثت	:	میراث
خوش گوار	:	اچھا	ودیعت	:	امانت
دست رَس	:	پہنچ، قدرت، طاقت	وصال	:	انتقال، موت

05.09 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبرا : مجازؔ کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم کے بارے میں بتائیے؟

سوال نمبر۲ : مجازؔ کی ملازمت اور بیماری کے بارے میں اظہارِ خیال کیجیے؟

سوال نمبر۳ : مجازؔ کی شاعری میں انقلاب اور رومان کے امتزاج پر ایک مضمون لکھیے؟

تفصیلی سوالات

سوال نمبرا : مجازؔ کی نظم نگاری پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے؟

سوال نمبر۲ : مجازؔ کے حالاتِ زندگی پر ایک مفصل مضمون لکھیے؟

سوال نمبر۳ : نظم ''نذرِ علی گڑھ'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے؟

معروضی سوالات

سوال نمبرا۔ اسرارالحق مجازؔ کی پیدائش یو پی کے کس ضلع میں ہوئی؟

(الف) لکھنؤ (ب) فیض آباد (ج) بارہ بنکی (د) آگرہ

سوال نمبر۲۔ مجازؔ کی شاعری میں کس سنہ سے تبدیلی ہونے لگی؟

(الف) ۱۹۳۱ء (ب) ۱۹۳۲ء (ج) ۱۹۳۳ء (د) ۱۹۳۴ء

سوال نمبر۳۔ مجازؔ کس سنہ میں پیدا ہوئے؟

(الف) ۱۹/اکتوبر۱۹۱۱ء (ب) ۲۰/اکتوبر۱۹۱۲ء (ج) ۱۹/نومبر۱۹۱۰ء (د) ۲۰/دسمبر۱۹۱۳ء

سوال نمبر۴۔ مجازؔ نے بی۔اے کس یونی ورسٹی سے کیا؟

(الف) جامعہ ملیہ اسلامیہ (ب) لکھنؤ یونی ورسٹی (ج) عثمانیہ یونی ورسٹی (د) علی گڑھ یونی ورسٹی

سوال نمبر۵۔ مجازؔ کا انتقال کس جگہ ہوا؟

(الف) بارہ بنکی (ب) فیض آباد (ج) بلرام پور اسپتال (لکھنؤ) (د) گورکھ پور

سوال نمبر۶۔ نظم ''نذرِ علی گڑھ'' میں کتنے اشعار ہیں؟

(الف) سولہ (ب) سترہ (ج) اٹھارہ (د) انیس

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱	: (ج) بارہ بنکی	جواب نمبر۴	: (د) علی گڑھ یونی ورسٹی
جواب نمبر۲	: (ب) ۱۹۳۲ء	جواب نمبر۵	: (ج) بلرام پور اسپتال (لکھنؤ)
جواب نمبر۳	: (الف) ۱۹/اکتوبر ۱۹۱۱ء	جواب نمبر۶	: (د) اُنیس

05.10 حوالہ جاتی کتب

۱۔ انتخابِ کلام مجازؔ، جذبیؔ، جاں نثار اختر از محمد حسن

۲۔ جدید نظم: حالیؔ سے میراجی تک از کوثر مظہری

۳۔ مجازؔ: حیات اور شاعری از منظر سلیم

۴۔ دیباچہ ''آہنگ'' (مجموعۂ کلامِ مجازؔ) از فیض احمد فیضؔ

۵۔ جدید شاعری از عبادت بریلوی

✵

بلاک نمبر 02

اکائی 06	میراجی......''سمندر کا بلاوا''	ڈاکٹر ریاض احمد
اکائی 07	معین احسن جذبی......''میری شاعری اور نقاد''	پروفیسر محمد نعمان خاں
اکائی 08	علی سردار جعفری......''نئی دنیا کو سلام''	محمد افضل حسین
اکائی 09	جاں نثار اختر......''روشنیاں، زندگی کے موڑ پر''	ڈاکٹر ریاض احمد
اکائی 10	اختر الایمان......''یادیں''	ڈاکٹر بی۔ بی۔ رضا خاتون

اکائی 06 : میراجی ''سمندر کا بُلاوا''

ساخت :

06.01 : اغراض ومقاصد
06.02 : تمہید
06.03 : میراجی کے حالاتِ زندگی
06.04 : میراجی کی نظم نگاری
06.05 : میراجی اور حلقۂ اربابِ ذوق
06.06 : نظم ''سمندر کا بلاوا'' متن
06.07 : نظم ''سمندر کا بلاوا'' تجزیہ
06.08 : خلاصہ
06.09 : فرہنگ
06.10 : سوالات
06.11 : حوالہ جاتی کتب

06.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ میراجی کی نظم نگاری کی انفرادیت جان سکیں گے۔ اردو نظم نگاری میں میراجی کے ہیئتی تجربات کا مطالعہ کر سکیں گے۔ ان کے حالاتِ زندگی اور ادبی کارکردگی کو جان سکیں گے۔ میراجی کی شعری علامتوں، خصوصیات اور ان پر عصری رجحانات کے اثرات کا مطالعہ کر سکیں گے۔ عام طور پر میراجی کے گیتوں اور بالخصوص ان کی نظموں کا تجزیہ کر سکیں گے۔ ان کی نظم ''سمندر کا بُلاوا'' کے اُسلوب کو سمجھ سکیں گے۔ نظم ''سمندر کا بُلاوا'' کی ادبی جمالیات اور معنویت کا مطالعہ کر سکیں گے۔

06.02 تمہید

آپ جانتے ہیں کہ سماجی تبدیلیوں کا اثر ادب پر بھی مُرتسم ہوتا ہے۔ ادیب اور شاعر تہذیب وتمدّن اور تاریخی حقائق سے اپنی ادبی نگارشات کا خمیر تیار کرتا ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں ملکی و عالمی سطح پر کئی طرح کی تبدیلیاں رونما ہوئیں جن میں پہلی اور دوسری عالمی جنگ، دنیا کا نظریاتی طور پر متعدد خیموں میں تقسیم ہونا، بہت سارے ممالک کا نو آبادیات میں تبدیل ہونا اور پرانی نو آبادیات کا بطورِ آزاد مملکت ظہور پذیر ہونا شامل ہے۔ چناں چہ ان سب حالات وواقعات کا اثر ادب پر پڑا اور اس میں کئی سطحوں پر تبدیلی آئی۔ اسی تبدیلی کی وجہ سے ترقّی پسند تحریک کی داغ بیل یورپ میں پڑی اور ہندوستانی ادب کے اُفق پر بھی اس کا اثر واضح طور پر دیکھنے کو ملا۔

ہندوستانی زبانوں میں اصناف کی سطح پر ملکی اور عالمی حالات و واقعات کے زیر اثر تبدیلی رونما ہوئی۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۰ء تک کا زمانہ ادب میں مختلف نقطۂ نظر اور تحریکات کے وقوع پذیر ہونے کا زمانہ ہے، خواہ ''ترقّی پسند تحریک'' کی شکل میں ہو یا ''حلقۂ اربابِ ذوق'' کی شکل میں۔ مختلف تحریکات اور سماجی تبدیلیوں کے زیرِ اثر نثر میں ناول اور افسانے نے اپنی فکری اور اسلوبیاتی سطح میں تبدیلی کی وہیں نظم میں بھی فکری اور ہیئتی سطح پر تبدیلی رونما ہوئی۔

اردو نظموں میں ہندوستان کی مٹی، اس کے مناظر، رسم و رواج اور متعدّد تہذیبی و اساطیری وابستگی کی مثال نظیؔر اکبر آبادی کی نظموں میں ملتی ہے۔ نظیؔر کے اس نظریے اور رجحان کا فروغ بعد کے کئی شعرا نے مختلف اصناف کے ذریعے کیا۔ مثنوی ''سحر البیان'' اور ''گلزارِ نسیم'' میں ارضِ وطن کے رسوم وعقائد کے شواہد ملتے ہیں۔ اردو داستانوں میں بھی ان کی کڑیاں جڑتی ہیں۔ نظیؔر کے بعد کے شعرا آزاؔد، حاؔلی اور اسمٰعیلؔ میرٹھی وغیرہ نے بھی ملک کے رسم ورواج، عقائد، پہاڑوں، وادیوں اور موسموں کو بہت حد تک اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔

چکبستؔ کے یہاں بھی ملکی روایات سے گہری وابستگی ملتی ہے۔ ہمارے بہت سے نظم گو شعرا نے حُبُّ الوطنی کے جذبات کا اظہار کیا ہے لیکن جس شاعر نے اردو نظم میں ان تمام چیزوں کا گہرا مطالعہ کر کے اپنی تخلیقات پیش کی ہیں اُسے 'دَھرتی پوجا' کا انوکھا نمونہ کہنا چاہیے۔ اُردو نظم نگاری کی روایت میں میرا جی اوّلین شاعر ہیں جنہوں نے صرف رسمی طور پر یہاں کے رسوم وعقائد اور مظاہرِ فطرت سے وابستگی کا اظہار ہی نہیں کیا بلکہ مغربی تہذیب وتمدّن کے ردِّعمل میں اپنے وطن کے گُن گائے۔

زیرِ مطالعہ اکائی میں ہم میرا جی کی شاعری کا مطالعہ کریں گے جن کے سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز قدیم ملکی روایات، اس کی تاریخ اور اساطیری واقعات سے جڑا ہوا ہے۔ یہ اندازِ بیان میرا جی کے گیتوں، غزلوں اور نظموں سبھی میں یکساں ہے۔

06.03 میرا جی کے حالاتِ زندگی

میرا جی کا اصل نام ثناء اللہ ڈار تھا۔ میرا جی ۲۵ رمئی ۱۹۱۲ء کو لاہور میں ایک قلیل آمدنی والے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام منشی مہتاب الدین تھا۔ کہا جاتا ہے کہ میرا جی کا بچپن نہایت تنگ دستی میں گزرا۔ انہوں نے اپنے بچپن کے دن گجرات کے کاٹھیاواڑ میں گزارے۔ وہ طویل عرصے تک دُوارکا کے قریب سکونت پذیر رہے۔ میرا جی کے متعلق یہ عام روایت ہے کہ انہوں نے جوانی کے آغاز میں ایک بنگالی لڑکی کو دیکھا جس کا نام 'میرا سین' تھا۔ اس کا عشق اُن کے سر چڑھ کر بولنے لگا اور وہ میرا سین کے عشق میں اس قدر اسیر ہوئے کہ اپنی ہیئت تک بدل ڈالی۔ اس عشق نے ان کے ذہن ودل پر اس قدر اثر کیا کہ وہ ثناء اللہ سے میرا جی ہو گئے یعنی انہوں نے اپنا نام تبدیل کر لیا، بال بڑھا لیے اور گلے میں مالا ڈال لی۔ انہیں اپنی محبوبہ کی ہر شے زبان، مذہب، لباس اور روایت اس قدر عزیز ہو گئی کہ اُنہیں اپنی ذات سے ہم آہنگ کر لیا۔

بعض ناقدین کا خیال ہے کہ میرا جی کے ذہن میں پہلے سے ہی ہندوستان اور اس کی پرانی روایات سے مماثلت تھی اور دوسری بات یہ کہ بچپن کے حالات و واقعات عام طور سے انسان کی باقی ماندہ زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ کسی بھی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں ان حالات و واقعات کا کافی عمل دخل ہوتا ہے جن کا بہت دنوں تک آدمی مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ میرا جی بچپن، عشق، جوانی اور نسل ہر طرح سے ہندوستانی تہذیب وتمدّن کا پرتو نظر آتے ہیں۔

خود میرا جی نے اپنے متعلق لکھا ہے:

''میرے آباواجداد آریہ نسل کے انسان تھے۔ وہ آریہ جو وسطِ ایشیا سے چل کر جب جنوب کی طرف روانہ ہوئے تو اُن کا سفر کہیں رکنے میں نہیں آتا تھا۔ اُنہی کی ذہانت اُنہی کا حافظہ اور اُنہی کی طبیعت نسل در نسل مجھ تک پہنچی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میرا ذہنی سفر بھی پنجاب سے جنوب کی طرف رہا ہے۔''

(میرا جی کی نظمیں ص ۱۱/ بحوالہ وزیر آغا ''نظمِ جدید کی کروٹیں'' ص ۵۱/)

میرا جی نے جتنا اپنے گھاؤ کو بھرنے کی کوشش کی وہ اتنا ہی گہرا ہوتا گیا۔ ظاہر ہے کہ جو شخص محرومی اور ناکامی کا درد اپنے اندر پال کر رکھے گا وہ معمول کی زندگی بسر نہیں کر سکے گا۔ میرا جی نے اپنی زندگی کو گزند پہنچایا لیکن دوسرے انسانوں سے صرف محبت کی۔ انہوں نے اپنے احساسات پر کبھی بھی چھوت کی چادر نہیں ڈالی۔ میرا جی نے قدیم ہندوستان سے شعوری وابستگی کو میرا سین کی محبت کا عطیہ سمجھا۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ اُن کے اِس رجحان کی جڑ اُنہی کی روح کی گہرائیوں میں بہت دُور تک اُتری ہوئی تھی جس کی شدّت اتنی تھی کہ وہ ہمیشہ ان کے وجدان اور شخصیت پر چھائی رہی۔ اپنے ناکام عشق کے گہرے اثرات کو انہوں نے اپنی نظموں کی تخلیق کا ذریعہ بنایا۔

اس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ایک ہی بار مشرقی ہندوستان کی ایک عشرت انگیز مورت (میرا سین) کی طرف نظر کی اور ہزیمت کا منہ دیکھا اور ذہنی تلخی کو کم کرنے کے لئے، اپنے شکست کے احساس سے رہائی کرنے کے لئے میرا ذہن ادبی تخلیقات میں مجھے بار بار پرانے ہندوستان کی طرف لے جاتا ہے۔ مجھے کرشن، کنہیّا اور برندابن کی گوپیوں کی ایک جھلک دکھا کر وشنومت کا پجاری بنا دیتا ہے''۔

(میرا جی کی نظمیں ص ۱۱/ بحوالہ وزیر آغا ''نظمِ جدید کی کروٹیں'' ص ۵۱/)

میرا جی نے ناکام عشق کے بعد اپنا حلیہ بدل لیا۔ نہ کھانے کی فکر اور نہ پہننے کا ڈھنگ، اب میرا جی کسی جوگی کی طرح لگتے لیکن میرا جی شہرت اور تخلیقی بلندی پر تیزی سے چڑھتے گئے۔ برِّ صغیر میں چند برسوں میں ان کی نظموں کی دھوم مچ گئی۔ میرا جی کی نظموں میں تازہ بہار کی مہک تھی اور آواز میں جادو۔ نظمیں ہی کیا انہوں نے صنفِ گیت کو کمال تک پہنچا دیا جس پر کسی شاعر نے توجہ نہیں کی تھی۔ نئی طرز کی گہرائی رکھنے والے، گیت لکھنے والے میرا جی اندر سے تو زیادہ اُجلے تھے مگر باہر نہ نہانے دھونے کی سُدھ نہ کپڑا بدلنے کی فکر، کوئی ان کے حلیے کے بارے میں مزاحاً کہتا تو وہ ایک پھیکی سی ہنسی ہنستے اور کہتے کہ اندر سب ٹھیک ہے۔ ان کے ہاتھوں میں لوہے کے کڑے اب ان کی شناخت بن گئے تھے۔ اندر باہر دونوں کا تجزیہ رکھنے والے سچے ساتھیوں کا خیال تھا کہ میرا جی کا ظاہر جتنا میلا ہے آنکھوں میں اتنی ہی تیز روشنی اور دل میں اتنی ہی سچائی اور دیانت داری ہے۔ میرا جی کی صداقت اور محبت سب کے لئے یکساں تھی۔ بقولِ حمید نسیم:

''میرا جی کی آنکھیں اور محبت خاک کے ذرّے سے مہر و ماہ تک اور شہودِ کائنات کے سارے مناظر سے لے کر غیب تک کا احاطہ کرتی تھیں۔ سو باہر کی بگڑتی ہوئی حالت مجھ تک بہت کم پہنچی۔ مجھ

تک جو چیز پہنچی وہ میراجی کے باطن کا بے کراں جمال تھا جس سے وجود کے فانی ہونے کا ایک خفی سا گداز بہم آمیز ہو گیا تھا۔''

(حمید نسیم، پانچ جدید شاعر، ص/۱۶۰)

عشق کا مرض جو جوانی میں جا گزیں ہو گیا تھا اس نے میراجی سے بڑے تخلیقی کام کروائے۔ اس عشق کے جوہر نے ان کے فن کو توانائی بخشی۔ اسی آتشِ عشق نے ان کی شاعری کے تیز رو دریا کو سمندر تک پہنچانے کا کام کیا لیکن ذاتی طور پر آتشِ عشق کے بلند تر ہوتے شعلے میراجی کو اندر ہی اندر جلاتے چلے گئے۔ میراجی کی نظموں میں جن محرومیوں کا خفیف سا نشان ملتا ہے وہ ان کے اندر جلنے والی آگ کے شعلے تھے۔ اس شعلے کو بجھانے کے لئے میراجی سیال آگ کے عادی ہو گئے جو آدمی کو مست کر کے چند لمحوں کے لئے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیتی ہے۔ اس مدہوش کر دینے والی دارُو سے وقتی طور پر روگ کا مداوا تو ہوا لیکن بہت جلد اُس نے اُنہیں اِس دنیا سے بے خبر کر دیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد میراجی لاہور سے ممبئی آ گئے اور وہیں رہنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ ۳/نومبر ۱۹۴۹ء کو ممبئی میں اُبھرتی ہوئی نظموں کا جوالا مکھی صرف ۳۷/برس کی عمر گزار کر دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔

06.04 میراجی کی نظم نگاری

جدید اردو نظم کے ارتقا میں میراجی کی حیثیت مسلم ہے۔ میراجی نے اردو نظم کو ہیئت، اُسلوب اور طرز ہر اعتبار سے یورپی نظموں کے ہم پلّہ کرنے کی کوشش کی۔ چوں کہ میراجی کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔ انہوں نے انگریزی، فرانسیسی، جرمنی اور روسی زبانوں کا بغور مطالعہ کیا تھا، یہی نہیں بلکہ انہوں نے بین الاقوامی معیار کی بہت سی نظموں کا منظوم ترجمہ بھی کیا تھا۔ میراجی کی شاعری میں خواہ وہ نظمیں ہوں، گیت ہوں یا غزل سب میں جنس ایک اہم موضوع رہا ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں جنس کا پوری ایمان داری سے اظہار کیا ہے۔

میراجی کی شاعری میں رادھا اور کرشن، برندابن اور گوپیوں اور اُن کے آزاد اختلاط کا برملا اظہار ملتا ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں قدیم ہندوستانی تہذیب و تمدّن اور اس کے اقدار کو تہذیبی علامت قرار دیا ہے۔ میراجی کی شاعری کی فضا بندی قدیم روایات اور اساطیری تاریخ سے مزیّن ہے۔ میراجی کی شاعری میں عورت کا تصوّر ایک زرخیز زمین کے مشابہ ہے۔ وہ وشنومت کی افزائشِ نسل کے نظریے کے پیرو کار نظر آتے ہیں۔ مختلف طرح کی جنسی اُلجھنیں اور شکست و ریخت کی مثالیں تشبیہ و استعارے کے ساتھ اُن کی نظموں میں نمودار ہوتی ہیں۔ ''دھوبی گھاٹ، ایک شام کی کہانی، دوسری عورت اور اخلاق کے نام'' وغیرہ نظمیں اُن اُلجھنوں کی نشان دہی کرتی ہیں۔ ''نارسائی، کٹھور، مجھے گھر یاد آتا ہے اور دُور کنارہ'' وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن میں جنسی جذبے، شکستِ آرزو، دُوری کی اذیت، شخصی محرومی، انتظار کا غم اور تلاش و جستجو کی تپش کا بیان ملتا ہے۔ میراجی نے اپنے ہم عصروں کی طرح علامتی نظمیں بھی کہی ہیں۔ ''بادل کی اُڑان، اندھا طوفان، فاختہ اور کوّا'' وغیرہ علامتی نظمیں سمجھی جاتی ہیں۔ ''اونچا مکان اور کلرک کا نغمۂ محبت'' وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن میں بازاری عورت کے کرب، زندگی کی مجبوریوں اور انسانی خواب کے شکست و ریخت کا پُر اثر بیان ملتا ہے۔

میراجی کی شاعری اُن کے عہد میں بھی زیرِ بحث رہی اور اُن کے ہم عصروں میں بھی۔ ہم عصروں میں ن۔م۔ راشد سے اُن کا گہرا ربط تھا۔ میراجی اور راشد میں ایک بات مشترک تھی اور وہ یہ کہ نظم کہیں سے بھی شروع کی جا سکتی ہے اور کہیں بھی ختم ہو سکتی ہے۔ گویا دونوں

نے آغاز وانجام کی روایتی شعری منطق سے نجات حاصل کر لی تھی۔ حالاں کہ راشد کا شعری جغرافیہ عرب وعجم کے ساتھ ساتھ پورا مشرقِ وسطیٰ ہے جب کہ میرا جی کے یہاں جنگل کی تہذیب اور برندابن کی شانتی کا پرتو ہے۔ راشد اسلامی تاریخ اور اُس کی فصیلوں اور گنبدوں کا منظر نامہ پیش کرتے ہیں تو میرا جی مندروں اور گھاٹوں کی منظر کشی کرتے ہیں۔ تاہم میرا جی کی شخصیت سے راشد دُور دُور تک متاثر نظر آتے ہیں۔

میرا جی کے شاعرانہ مقام کی تعریف کرتے ہوئے راشد نے لکھا ہے:

''میری رائے میں میرا جی ہمارے زمانے کے سب سے زیادہ قابلِ ذکر شاعر ہیں۔ سب سے زیادہ جدّت پرست، سب سے زیادہ زرخیز ذہن کے مالک، سب سے منفرد اور سب سے زیادہ بدنام۔''

(ن م. راشد: لا انسان، لاہور: المثال ۱۹۴۹ء ص ۲۶)

میرا جی کی شاعری کے ماضی اور حال دو اہم زمانے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ مستقبل کے کردار کا تعین ماضی اور حال سے ہوتا ہے۔ میرا جی ماضی کی زندہ تہذیبی روایت سے ہمیشہ منسلک رہے۔ انہیں اس روایت کو حال سے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے پر یقین تھا۔ ان کی شاعری میں ماضی پرانی یادوں کی طرح ان کا تعاقب کرتا ہے۔ ماضی ان کے تجربے کو ایک تخلیقی قوّت بخشتا ہے۔ گزرے ہوئے زمانے میں میرا جی کے لئے رومان اور محبت کا بھرپور احساس ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ماضی ایک ایسی کھڑکی ہے جسے کھول کر وہ اَن دیکھی دنیا میں داخل ہو سکتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ماضی کے رنگ محل کی کنجی ہمارے حال کے بہت سے مسائل کو سُلجھا سکتی ہے۔ اُنہوں نے خود لکھا ہے:

''حال کی حقیقت ایک کھلے میدان کی سی ہے جس میں ہم کھڑے ہیں اور جس کے دوسرے کنارے پر ماضی کا ایوان دکھائی دے رہا ہے۔ ایک رنگ محل جس کی خوشیوں کا عکس ہمیں ہر سانس کی تلخی کے ساتھ محسوس ہوتا ہے۔ گزری ہوئی زندگی نسبتاً زیادہ مسرّت کی حامل ہوتی ہے یا حال کی زندگی......؟ اس وقت اس سے بحث نہیں ہے، ہاں ماضی کے رنگ محل کی کنجی ہماری ذات کے بہت سے مسائل کو سُلجھا سکتی ہے، اِس سے انکار نہیں ہو سکتا ہے۔''

(میرا جی۔ ''میرا جی کی نظمیں''، دِلّی، ساقی بک ڈپو ۱۹۴۴ء ص ۱۰/۱۱)

میرا جی کی علامتی نظموں میں کافی تنوّع ملتا ہے۔ ان علامتوں کی توضیح وتشریح میں نقاد بہر حال مختلف خیال رکھتے ہیں لیکن میرا جی کے ذہنی پس منظر اور عام زندگی میں اس کے رجحانات کا پتہ ان کی نظموں سے لگایا جا سکتا ہے۔ عام زندگی میں میرا جی نے ایک خاص فضا سے وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ ان کے ذہنی پس منظر اور ان رجحانات کے وجود کی نفی کرنے کی گنجائش نہیں۔ میرا جی نے اپنے ہم عصر شعرا مثلاً امرو، چنڈی داس اور وِدّیا پتی کے بارے میں جو مضامین لکھے ہیں ان سے بھی ان کے ذہنی تاثر کا پتہ لگتا ہے۔ یوں تو میرا جی کی کتاب ''مشرق و مغرب کے نغمے''بہت سارے مشرقی ومغربی عظیم شعرا کی نگارشات پر گہرا مطالعہ اس کتاب میں موجود ہے تاہم عہدِ قدیم کے ہندوستانی شاعر چنڈی داس اور ودیا پتی (جن کا کرشن رادھا سے گہرا لگاؤ تھا) کے گیتوں کا تذکرہ میرا جی بڑی خوش اُسلوبی سے کرتے ہیں۔ انہوں نے ان کا تجزیہ کرتے وقت ان نظموں میں استعمال کی گئی تلمیحات، تشبیہات، اشارات اور کنایات (جو عہدِ قدیم کے ہندوستان اور اساطیری بدھ مت

عہد کے پس منظر کے لئے خاص طور سے استعمال کی گئی ہیں) کا تذکرہ بڑے تحسینی نقطۂ نظر سے کیا ہے۔ ان نظموں میں مندر، پجاری، راجا رانی، آرتی، سنکھ، جمنا تٹ، دیوداس، رقص منچ اور راگ راگنیوں کے واضح اشارے ملتے ہیں۔ عہدِ قدیم کے مختلف تاریخی پس منظر کے نقوش میراجی کی بہت سی نظموں میں ملتے ہیں مثلاً:

پھر وہی دَور پلٹ آیا ہے، اب راج کمار
رشکِ فردوس، محل کی زینت
یعنی شہزادی یشودھا کو لیے آتا ہے

''اجنتا کے غار''

جھومی گیسو کی چھایا تو دھیان انوکھا آیا
نٹ کھٹ برندابن سے ساتھ میں رادھا کو بھی لایا
رادھا مکھ کی اُجلی مورت، شیام گیسو کا سایا

''ایک منظر''

اور بادل کے گھونگھٹ کی اوٹ سے ہی تکتے تکتے چنچل چندا کا روپ بڑھا!
یہ چندا کرشن......ستارے ہیں جھرمٹ برندا کی سکھیوں کا!
اور زہرہ نیلے منڈل کی رادھا بن کر کیوں آئی ہے؟

''سنجوگ''

جب بھی دیکھا، ایک ہی اُلجھن نئے روپ میں آئی
کنبھ کرن کی نیند سے صدیوں کا سویا دُریودھن جاگا
سب سکھ بھاگا
پورب پچھّم ہاہا کار مچائی
راجا ڈوبے، پرجا ڈوبی، بولی رام دہائی

''ایک ہی کہانی''

اِس کو ہاتھ لگایا ہوگا ہاتھ لگانے والے نے
پھول ہے رادھا، بھونرا، بھونرا، بھونرے نے، ہاں کالے نے
دھوکا کھایا، دھوکا کھایا، دھوکا کھانے والے نے

''ترقی پسند ادب''

پیچھے پیچھے لاکھ شکاری آگے ایک شکار
دھن گُن. گیان بھی کام نہ آئے
نام ہری کا جپنا جائے
اپنی سی وہ کہے جائے گا، کرلوا تیا چار
دھیان کی دُھن میں مگن رہیں گے۔ بیڑا اپوم یار
جب جیون کا پھندا ٹوٹے
جب بیری کے جال سے چھوٹے
سامنے دور دھرتی کے دوا پرمکتی کا سنسار

میرا جی نے جسمانی طور پر تو جوگی کا روپ لے لیا تھا لیکن علمی سطح پر وہ ہمیشہ چاک وچو بند رہے۔ باطنی روشنی کی وجہ سے ان کے اندر دروں بینی اور نفسیاتی کیفیات دونوں کا امتزاج ملتا ہے۔ خلقی اور جبلّی خواہشوں میں مخفی خیر وشر کی تلاش اور کھرے کھوٹے کی پہچان کے لئے میرا جی کے پاس الفاظ کا پیراہن موجود تھا تاہم کئی بار اُنہیں اپنے بلیغ تاریخی، تہذیبی، منطقی اور کائنات کے میکانیکی تصوّرات پیش کرنے میں زبان کی سطح پر مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔

حمید نسیم نے اپنی کتاب پانچ جدید شاعر میں میرا جی کی ان مشکلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''جو باتیں میرا جی کہنا چاہتا تھا، خواہش کی مختلف سطحوں کی جبلّت نارمل، اَب نارمل حالتوں کی۔ ان کے لئے نظم میں کوئی فرہنگ، کوئی لہجہ دست یاب نہ تھا۔ میرا جی کا سب سے بڑا، سب سے اہم اور فوری مسئلہ ایک نئی زبان اور نئی فرہنگ کی اختراع تھا۔ مجھے یقین ہے اگر میرا جی، فیضؔ صاحب اور راشدؔ صاحب کی طرح طبعی عمر تک پہنچتا تو یقیناً ایک نہایت وسیع فرہنگ اور اسلوب نفسیاتی شاعری کے لئے ایجاد ہی نہیں مکمل کر کے دے جاتا مگر اس نے تو ابھی اس راہ میں سفر کا آغاز کیا تھا، ابھی ابتدائی نوعیت کے لسانی تجربے کر رہا تھا کہ موت نے آلیا پھر بھی اس نے موجود لہجے اور لفظیات کے ساتھ اپنا ہر خیال نہایت سہولت سے، نہایت کامیابی سے موزوں کلام میں پیش کیا اور منزلِ کمال پر پہنچ گیا۔''
>
> (''پانچ جدید شاعر'' مکتبہ جامعہ لمیٹڈ. ۲۰۱۲ء ص ۱۶۴)

06.05 میرا جی اور حلقۂ اربابِ ذوق

حلقۂ اربابِ ذوق جسے ''بزمِ داستان گویاں'' نے بنیاد فراہم کی۔ یہ لاہور کی ادبی سرگرمیوں میں ایک منضبط سرگرمی تھی۔ چوں کہ اس سے قبل ترقی پسند تحریک کا قیام عمل میں آیا تھا اور ترقی پسند اُدبا و شعرا کی منشا جدید ادب کی ترویج و ترقی کے ساتھ ساتھ کسی خاص نظریے کی تبلیغ بھی تھی۔ ایسے میں ایک ایسے حلقۂ ادب کی تشکیل ہوئی جس کا ماننا تھا کہ ادب کا مقصد صرف ادب ہی ہے۔

اس کی ابتدا ''۱۹/ اپریل ۱۹۳۹ء'' کی شام کو میکلورڈ روڈ پر سید نصیر احمد شاہ کے مکان پر ہوئی۔ پہلے اس مختصر سی جماعت کا ادبی نام ''بزمِ داستان گویاں'' رکھا گیا۔ شروع میں بغیر کسی مستقل صدر اور سکریٹری کے جن احباب نے مجلسِ انتظامیہ کا بار سنبھالا اُن میں حفیظ ہوش

یار پوری، شیر محمد اختر، تابش صدیقی، محمد افضل اور سید نصیر احمد شاہ شامل تھے۔ ابتدا میں اس کے اجلاس میں صرف افسانے پڑھے جاتے تھے اور جدید مغربی تنقید کی روشنی میں اس پر تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔ چند مہینوں بعد ہی یہ تجویز منظور ہوئی کہ افسانوں کی طرح شاعری پر بھی بزم میں تنقید ہونی چاہیے۔ اس تجویز کے منظور ہوتے ہی اس بزم کا نام ''حلقۂ اربابِ ذوق'' رکھا گیا۔

۱۶/ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو حلقۂ اربابِ ذوق کا پہلا جلسہ منعقد ہوا۔ شروع میں اس بزم کا حلقہ لاہور اور پنجاب تک محدود تھا لیکن جلد ہی برِّ صغیر کے دیگر شعرا و اُدبا نے اس میں اپنی شرکت اور اپنا تعاون پیش کیا۔ میراجی کے ''حلقۂ اربابِ ذوق'' کی رکنیت قبول کرنے کے بعد اس کا ادبی رجحان واضح ہوگیا۔ اولاً ۲۵/ اگست ۱۹۴۰ء کو میراجی نے اس حلقے میں شمولیت اختیار کی۔

میراجی کی شمولیت کے بعد حلقۂ اربابِ ذوق اور میراجی ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہوگئے۔ حالاں کہ اس کے درجنوں ممبران تھے مثلاً بیدی، ہنس راج رہبر، کنہیا لال کپور، پرکاش پنڈت اور بیگم سکینہ محمود کے علاوہ اس بزم کی شمالی شاخ اور دہلی میں بہت سے ارکان نے اس میں شمولیت اختیار کی۔ حلقۂ اربابِ ذوق کے ذریعے شعروادب کے فروغ کے رجحان میں میراجی نے غیر معمولی حصہ لیا۔ ۱۹۴۱ء میں اس بزم میں بہترین نظموں کا انتخاب شائع ہوا جس کے دیباچے سے حلقے کے تصوّرات و مقاصد پر روشنی پڑتی ہے۔

میراجی کے مطابق:

''اگر دو ایک لمحوں کے لئے فن برائے حیات کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو ہم کہیں گے کہ فن برائے فن کے بغیر فن ہی نہیں ہوسکتا۔ پھر یہ برائے حیات کا دُم چھلّہ کیسا۔ حقیقت میں تہذیب و تمدّن نے جن حشو و زوائد کو ہم پر طاری کر دیا ہے اُنہی میں سے برائے حیات کا تصوّر بھی ایک چیز ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس زمانے کے لوگوں کی باتیں زندگی کی ترجمان نہیں تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ لوگ حال کے بعض سیاسی نظریے اور سماجی و اقتصادی نظام کے موجودہ رنگوں سے واقف نہ تھے۔''

(میراجی ''دیباچہ: ۱۹۴۱ء کی بہترین نظمیں، حلقۂ اربابِ ذوق، لاہور، ص/۱۱)

اس انتخاب میں ۲۴/ نظمیں شامل تھیں۔ جن شعرا نے بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لیا ان میں میراجی کے علاوہ احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیضؔ، مختار صدیقی، ن۔م۔ راشد، جوشؔ ملیح آبادی، اختر شیرانی، سلام مچھلی شہری، شاد عارفی، اختر الایمان اور راجا مہدی علی خاں خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اس وقت تک بنیادی طور پر مختلف مکاتبِ فکر اور نظریات کے حامل شعرا و اُدبا میں حدِ فاصل نہیں تھی۔

''حلقۂ اربابِ ذوق'' کے سب سے سرگرم رکن اور روحِ رواں میراجی کا خیال تھا کہ:

''بعض پڑھنے والے جانتے ہوں گے کہ میری نظموں کا نمایاں پہلو ان کی جنسیت ہے اور اس لئے بیش تر مجھے اسی نقطۂ نظر سے گزرے ہوئے واقعات کو دیکھنا ہوگا جب کہ حلقۂ اربابِ ذوق سے متعلق ن۔م۔ راشد کا کہنا تھا کہ میرا یا میراجی کا مقصد کسی نظریے کی تلقین کرنا نہ تھا بلکہ ہمارے نزدیک انسانی شخصیت کی داخلی ہم آہنگی ایک طبعی امر تھی اور اس کا ذکر ہم نے بغیر کسی ذہنی کش مکش یا خلفشار کے کیا ہے۔''

۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۷ء تک حلقۂ اربابِ ذوق کی مجلسوں میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی اور اس زمانے کی بہترین نظمیں حلقے نے شائع کیں۔ ہاں ۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ہند کے بعد جو فسادات ہوئے اس نے ''حلقۂ اربابِ ذوق'' کو متاثر کیا۔ ۳رنومبر ۱۹۴۹ء کو میراجی کے انتقال کے بعد حلقۂ اربابِ ذوق کے موقف، اس کے استحکام اور اس کے نظریات کو نقصان پہنچا۔ میراجی کے انتقال کے بعد ۱۹۴۹ء کی بہترین نظموں کا انتخاب اس سلسلے کی آخری کڑی ثابت ہوئی۔ حلقۂ اربابِ ذوق اپنے اوّلین دنوں سے میراجی کی سرگرم شخصیت کے زیرِ سایہ رہا اور اُن کی موت کے چند سال بعد تاریخ کا حصہ بن گیا۔

06.06 نظم ''سمندر کا بلاوا'' متن

یہ سرگوشیاں کہہ رہی ہیں اب آؤ کہ برسوں سے تم کو
بلاتے بلاتے مرے دل پہ گہری تھکن چھا رہی ہے
کبھی ایک پل کو، کبھی ایک عرصہ صدائیں سنی ہیں مگر یہ انوکھی ندا آرہی ہے
بلاتے بلاتے تو کوئی نہ اب تک تھکا ہے نہ آئندہ شاید تھکے گا
''مرے پیارے بچّے!'' ...... ''مجھے تم سے کتنی محبت ہے''۔
''دیکھو! اگر یوں کیا تو بُرا مجھ سے بڑھ کر نہ کوئی بھی ہوگا''
''خدایا! خدایا!''
کبھی ایک سسکی، کبھی اک تبسم، کبھی صرف تیوری
مگر یہ صدائیں تو آتی رہی ہیں
اِنہی سے حیاتِ دوروزہ ابد سے ملی ہے
مگر یہ انوکھی صدا جس پہ گہری تھکن چھا رہی ہے
یہ ہر اک صدا کو مٹانے کی دھمکی دِیے جارہی ہے
اب آنکھوں میں جنبش نہ چہرے پہ کوئی تبسم، نہ تیوری
فقط کان سنتے چلے جارہے ہیں
یہ اک گلستاں ہے، ہوا لہلہاتی ہے، کلیاں چٹکتی ہیں، غنچے مہکتے ہیں
اور پھول کھلتے ہیں، کھل کھل کے مرجھا کے گرتے ہیں، اک فرشِ مخمل
بناتے ہیں، جس پہ مری آرزوؤں کی پریاں عجب آن سے یوں رواں ہیں
کہ جیسے گلستاں ہی اک آئنہ ہے
اسی آئینے سے ہر اک شکل نکھری، سنور کر مٹی اور مٹ ہی گئی پھر نہ اُبھری
یہ پربت ہے خاموش! ساکن!

کبھی کوئی چشمہ اُبلتے ہوئے پوچھتا ہے کہ اس کی چٹانوں کے اُس پار کیا ہے؟

مگر مجھ کو پربت کا دامن ہی کافی ہے......دامن میں وادی ہے

وادی میں ندی ہے، ندی میں بہتی ہوئی ناؤ ہی آئنہ ہے

اسی آئینے میں ہر اک شکل نکھری مگر ایک پل میں جو مٹنے لگی ہے تو وہ پھر نہ اُبھری

یہ صحرا ہے......پھیلا ہوا، خشک، بے برگ صحرا

بگولے یہاں تند بھوتوں کا عکسِ مجسم بنے ہیں

مگر میں تو دُور......ایک پیڑوں کے جُھرمٹ پہ اپنی نگاہیں جمائے ہوئے ہوں

نہ اب کوئی صحرا، نہ پربت، نہ کوئی گلستاں

اب آنکھوں میں جنبش، نہ چہرے پہ کوئی تبسم، نہ تیوری

فقط ایک انوکھی صدا کہہ رہی ہے کہ تم کو بلاتے بلاتے مرے دل پہ گہری تھکن چھارہی ہے

بلاتے بلاتے تو کوئی نہ اب تک تھکا ہے، نہ شاید تھکے گا

تو پھر یہ ندا آئنہ ہے......فقط میں تھکا ہوں

نہ صحرا نہ پربت، نہ کوئی گلستاں، فقط اب سمندر بلاتا ہے مجھ کو

کہ ہر شے سمندر سے آئی، سمندر میں جا کر ملے گی

06.07 نظم ''سمندر کا بُلاوا'' تجزیہ

سمندر کا بُلاوا ایک علامتی نظم ہے۔ کئی جدید شعرا نے علامتی نظمیں لکھی ہیں لیکن میراجی کی علامتی نظمیں ان سب میں منفرد و ممتاز ہیں۔ ''سمندر کا بُلاوا'' میراجی کی ہی نہیں بلکہ اردو کی چند عظیم نظموں میں سے ایک ہے۔ نصف صدی سے زائد گزر جانے کے بعد بھی اس کی دل کشی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ اس نظم میں وقت بقائے دوام کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ اتنا تیز رَو ہے کہ اس کو قید کرنا مشکل ترین امر ہے۔ سمندر جو حقیقتِ کبریٰ ہے۔ وہ اس کائنات کے قادرِ مطلق کی حیثیت رکھتا ہے اور وقت اس کا ہم سَر ہے، بدیع السمٰوات ہے اور جو کچھ زندگی کے عناصر ہیں، جو اپنی جگہ قطرہ ہیں اگر سمندر میں نہ ملیں تو فنا ہو جائیں گے، ان کی کوئی حیثیت باقی نہ رہے گی۔ سمندر میں ملنے کے بعد بھی اُن کی حیثیت باقی نہیں رہے گی۔ وہ فنا ہو کر اپنے جزو کی حیثیت تو کھو دیں گے لیکن بقائے دوام حاصل کر لیں گے۔

اس نظم میں میراجی نے جو تجربے کی ترسیل اور اُسلوب اختیار کیا ہے، جو تکنیک برتی ہے وہ مغرب کی نظموں سے مستعار ہے لیکن جس ہنرمندی سے میراجی نے مغرب کی نظموں کی ہیئت کو اردو میں برتا ہے وہ پہ اُنہی کا حصہ ہے۔ نظم میں کئی طرح کی صدائیں ہیں، کچھ صدائیں پل بھر کی ہیں، کچھ کئی عرصے پر محیط ہیں اور کچھ صدائیں ندا کی حیثیت رکھتی ہیں۔ میراجی نے صدا کو زندگی اور ندا کو موت کے پیغام کی طرح برتا ہے۔ صدا حیات بخشتی ہے لیکن ندا اُنہی صداؤں کو مٹانے پر تلی ہے۔ نظم میں صدا کو دیکھا جا سکتا ہے مگر ندا کو نہیں:

''کبھی ایک سسکی، کبھی اک تبسم، کبھی صرف تیوری
مگر یہ صدائیں تو آتی رہی ہیں
اِنہی سے حیاتِ دوروزہ اَبد سے ملی ہے
مگر یہ انوکھی صدا جس پہ گہری تھکن چھا رہی ہے
یہ ہراک صدا کو مٹانے کی دھمکی دِیے جارہی ہے''

نظم میں شاعر کو دُور سے آتی ہوئی ایک ندا سنائی دے رہی ہے جو تھکی سی محسوس ہو رہی ہے۔ آواز کی تھکن اس کی قدر متعین کر رہی ہے۔فطرت کا تقاضا ہے کہ انسان اپنی ماں کو کبھی نہیں بھولتا۔ دکھ میں بھی ہائے ماں! کہتا ہے۔شاعر کے سامنے ماضی کا دھندلکا اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ آواز کی تھکن ایسا تو نہیں کہ کوئی بلاتے بلاتے تھک گیا ہو لیکن نہیں! وہ آئندہ بھی بلائے گا لیکن نہیں تھکے گا کیوں کہ شوق و محبت پر تھکن غالب نہیں ہوسکتی۔ یہاں شاعر معصوم نظر آتا ہے۔انسانی فطرت کی سچائی سے بہت قریب ہے۔

کبھی ماں اپنی تھکن اور بچے کی ضد کی شدّت سے ہار مان کر روتی اور سسکتی ہے اور کبھی بچہ مان گیا تو کلی کی طرح تبسم کرتی ہے۔کبھی آنکھوں کے اشارے سے منع بھی کرتی ہے اور ڈانٹتی بھی ہے لیکن یہ یادیں بے لوث محبت اور ڈانٹ، ڈپٹ صرف یادیں ہیں اور یہ یادیں ابد تک رہیں گی لیکن یہ خوشیاں واپس نہیں مل سکتیں۔اب جو صدا آ رہی ہے، ماں کی آواز جیسی نہیں، یہ تو تھکانے والی آواز ہے۔روح پر چھا جانے والی آواز ہے۔اب سے پہلے کی صداؤں اور نداؤں کو مٹا دینے والی آواز ہے گویا اب منظر بدل گیا ہے۔ماضی کی جگہ موجودہ شعور نے لے لی ہے۔اب نہ ویسی آنکھیں ہیں نہ حُسن ہے نہ تبسّم اور نہ تیوری۔سارے حواس میں صرف سماعت موجود ہے نہ ذائقہ، نہ دید، نہ شنید، نہ لمس لیکن شاعر کا ذہن اور اس کا تصوّر زیادہ فعّال نظر آتا ہے۔ یہاں باغ میں نمودار ہونے والی علامتوں سے شاعر نے کام لیا ہے۔کونپلیں پھوٹتی ہیں، کلیاں کھلتی ہیں، پھول بنتے ہیں اور پھر پھول اپنی بہار دکھا کر مرجھا مرجھا کر شاخ سے ٹوٹ جاتے ہیں۔وہی پھول سیج پر سجا کر اُنہی کا رنگ دِکھا کر حُسن کی شہزادیاں محوِ خرام ہیں۔

شاعر گلستاں کو آئینے سے تشبیہ دیتا ہے۔آئینہ بے مثل صنّاعی اور دانش وَری کی مثال ہے۔آئینہ بہ یک وقت افلاطونی، اسلامی اور ہندو تصوّف کی مشترکہ علامت ہے۔ گویا ساری دنیا نمودِ آئینہ ہے۔اس خالقِ کائنات کی حقیقتیں آئینے یعنی دنیا میں مختلف رنگوں اور مختلف خدوخال میں نمایاں ہیں لیکن اس آئینے کو بھی فنا ہونا ہے۔اب آئینے کی جگہ پہاڑ ہے جس میں وادیاں ہیں اور وادیوں میں کوئی چشمہ اور چشمے کے کنارے گلستاں۔شاعر کہتا ہے: پربت میرا پرتو ہے اور آئینہ بھی لیکن دونوں کی حقیقت کیا ہے؟ فانی؟ جس سے شاعر کو کچھ لینا دینا نہیں۔ اس کے لئے تو خالقِ کائنات کا نمود اور جمال کافی ہے۔اگر پربت، وادی، ندی، ناؤ اور آئینہ وحدت الشہود ہیں اور ان سے دل اور کائنات کا ذرّہ ذرّہ روشن ہے تو اسی سے اس آئینے کی نمود ہوگی جس میں ساری شکلیں اُبھریں گی لیکن بہتی ہوئی ندی، ناؤ اور آئینے پر منعکس ہونے والے مناظر پے درپے آتے ہیں، رکتے نہیں، ہاتھ لگاؤ تو کچھ موجود نہیں، سوائے عکس کے۔یعنی وقت ایسی چیز ہے کہ انسان کوشش بھی کرے تو اسے نہ گرہ میں باندھ سکتا اور نہ مٹھی میں بند کرسکتا ہے۔

شاعر کا طلسم جب ٹوٹتا ہے تو نمودِ آئینہ بھی سامنے نہیں، زندگی کی حقیقت لق ودق صحرا کے مانند ہے جہاں نہ پانی کا کوئی قطرہ ہے نہ ہریالی، نہ پھول، نہ پتی، صرف بگولے ہیں جو رقصاں ہیں۔ شاعر نے یہاں آنکھیں موندلیں۔ گویا نمود کا باطل ہونا ثابت ہوگیا۔ ایک بار پھر بچپن کی طرف، جوانی کی طرف، دید کی طرف، ذائقے کی طرف، مہک می طرف، لمس کی طرف اور تبسم و تیوری کی طرف شاعر کا ذہن مبذول ہوتا ہے جہاں سے آواز آرہی ہے کہ اے مخاطب! مجھ پر تجھے بلاتے بلاتے تھکن طاری ہورہی ہے اور پھر شاعر سوچتا ہے کہ آواز میں تھکن کیسی، اسے غیبی آواز اپنی ماں کی یاد دِلا رہی ہے۔ آیۃ الکرسی کی طرح یا کسی برہمن کے خیال کی طرح گونج سنائی دے رہی ہے۔ اب اس پر یہ آشکار ہے کہ یہ ندا اس کی باطنی حقیقت کی آئینہ دار ہے۔ ندا میں تھکن نہیں، خود وہ شکستوں کا بارِ گراں سر پر اُٹھائے، محرومیوں کو دل میں چھپائے ہوئے تھک گیا ہے۔ اس کی تھکن اس بات کا احساس دِلا رہی ہے کہ اب وہ بحرِ بیکراں میں مل کر سکون حاصل کرلے اور سمندر جو رحمتِ بے کراں ہے گویا وہ بلا رہا ہے کہ آؤ! مجھ میں مل کر آسودہ ہو جاؤ اور دوام حاصل کرلو! گویا:

نہ صحرا نہ پربت نہ کوئی گلستاں
فقط اک سمندر بلاتا ہے مجھ کو

شاعر کو اب یہ لگ رہا ہے کہ وہ محض نمود ہے جو چھایا ہوا ہے۔ مجھے تو قادرِ مطلق بلا رہا ہے جس کے سوا کوئی وجود نہیں۔ ہر شے سمندر سے آئی ہے اور سمندر میں جا کر مل جائے گی یعنی اُسی خالقِ کائنات کی کارکردگی ہے کہ وہی پیدا کرتا ہے، مختلف طرح کے اعمال کرواتا ہے اور پھر اپنے پاس بلالیتا ہے۔

06.08 خلاصہ

اردو میں جدید نظم کی ابتدا تو آزادؔ اور حالیؔ کے ذریعے ہوگئی تھی مگر جن شعرا نے جدید اردو نظم کو مزید جدّت بخشی اور گوناگوں ہیئتی اور اُسلوبیاتی تغیر سے اردو ادب کو آشنا کیا ان میں میراجی کا نام سرِفہرست ہے۔ میراجی کا اصل نام ثناءاللہ ڈار تھا۔ وہ منشی محمد مہتاب الدین کے گھر ۲۵/مئی ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوئے۔ میراجی نے اپنے بچپن کے دن کاٹھیاواڑ، گجرات اور دُوارکا میں گزارے۔ جواں سال ہوتے ہی اُنھیں ایک بنگالی لڑکی ''میراسین'' سے عشق ہوگیا۔ میراسین کے عشق میں میراجی اس قدر اسیر ہوگئے کہ انہوں نے اپنا نام اور حلیہ تک بدل لیا۔ اب ثناءاللہ کا نام میراجی ہوگیا اور پہچان جوگیوں جیسی۔ میراجی پر ہندوستانی تہذیب وتمدّن کا گہرا اثر تھا۔ سنِ شعور میں انہوں نے قدیم ہندوستانی تہذیب کا گہرا مطالعہ بھی کیا۔ میراجی کی نظم نگاری کی شہرت بہت جلد ہی برِّصغیر کے متعدّد شہروں میں پہنچ گئی۔

میراجی کی نظموں میں تازہ بہار کی مہک اور ان کی آواز میں جادو تھا، جو سنتا تھا کھنچا چلا آتا تھا۔ میراجی نے نظموں کے علاوہ غزلیں بھی کہیں مگر انہوں نے صنفِ گیت کو کمال تک پہنچا دیا۔ میراجی کی سچائی وصداقت، محبت واخوت سب کے لئے یکساں تھی۔ عشق کا مرض جو جوانی میں جاگزیں ہوا تھا اس نے میراجی سے بڑے بڑے تخلیقی کام کروائے اور اسی نے ان کے فن کو توانائی بخشی۔ میراجی کی شاعری میں عورت کا تصوّر ایک زرخیز زمین کے مشابہ ہے۔ وہ وشنومت کے نظریے سے متاثر نظر آتے ہیں۔ میراجی کی نظموں میں جنسیات کا جابجا ذکر ملتا ہے۔ جنسی جذبات، شکست، آرزو، دوری کی اذیت، شخصی محرومی، انتظار کا غم اور تلاش وجستجو کی مثال جن نظموں میں بطورِ خاص ملتی ہے اُن میں ''نارسائی، کٹھور، مجھے گھر یاد آتا ہے، دور کنارہ، اندھا طوفان، فاختہ اور کوّا، اونچا مکان اور کلرک کا نغمۂ محبت'' بہت اہم ہیں۔

میراجی کی شاعری میں حال اور ماضی کا اہم مقام ہے۔ میراجی نے ہندی شعرا ''امرو، چنڈی داس اور وِدّیاپتی'' پر تاثراتی مضامین بڑے تحسینی انداز سے لکھے ہیں۔ میراجی کی نظموں میں عہدِ قدیم کے ہندوستان، اساطیری عہد اور بدھ مت کے پس منظر میں بہت سی تلمیحات و تشبیہات اور اشارات و کنایات ملتے ہیں۔ ان کی نظموں میں پجاری، راجا، رانی، سنگھ، جمنا تٹ، دیوداس، رنگ منچ اور راگ راگنیوں کے واضح اشارے ملتے ہیں۔ میراجی حلقۂ اربابِ ذوق کے سرگرم رکن اور روحِ رواں رہے۔ انہوں نے جدید نظموں کا انتخاب ۱۹۴۱ء کی بہترین نظموں کے نام سے ترتیب دیا۔ ان کے ہم عصروں میں احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض، مختار صدیقی، ن.م. راشد، جوش، اختر شیرانی، سلام مچھلی شہری، شاد عارفی، اختر الایمان اور راجا مہدی علی خاں قابلِ ذکر ہیں۔

میراجی پر تقسیمِ ملک کا گہرا اثر پڑا۔ تقسیم کے بعد میراجی لاہور سے ممبئی منتقل ہوگئے اور وہیں ۳ رنومبر ۱۹۴۹ء کو صرف ۳۷ رسال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

آپ نے اس اکائی میں میراجی کی مشہور نظم ''سمندر کا بُلاوا'' کا مطالعہ کیا ہے جس میں انسانی زندگی کی حقیقت اور کائنات کی مختلف چیزوں کے فنا ہونے کا علامتی اظہار ملتا ہے۔ نظم میں وقت کو بقائے دوام اور سمندر کو حقیقتِ کبریٰ تسلیم کیا ہے جو قادرِ مطلق کی مستقل نشانیاں ہیں۔ دنیا میں کسی بھی چیز کو بقائے دوام نہیں، نہ انسان کو نہ حیوان کو اور نہ نباتات و جمادات کو۔

میراجی نے اس نظم میں ترسیل کے مغربی اُسلوب کو بہتر تکنیک کے ذریعے بڑی باریکی سے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ نظم میں انسانی زندگی کے مختلف ادوار سے بحث کی گئی ہے جنہیں باغ کے مختلف عناصر اور نمود سے تشبیہ دے کر سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسانی زندگی اور دنیا کی تمام چیزیں باغ، پھول، پتے، پہاڑ اور چشمے وغیرہ سب خالقِ کائنات کے اشارے پر چلتے ہیں اور اُنہیں فنا ہونا ہے۔ انسانی زندگی کے آخری ایام لق ودق صحرا کی مانند ہے جہاں کسی طرح کی کوئی زندگی کی رَمق باقی نہیں۔ یہاں شاعر نے بچپن، جوانی اور پیری کی بڑی اچھی تلمیح پیش کی ہے۔ نظم میں انسان بحیثیتِ قطرہ اور قادرِ مطلق بحیثیتِ سمندر ہے جو رحمتِ بے کراں ہے جس میں مل کر شاعر آسودگی اور بقائے دوام حاصل کرنے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کل ملا کر میراجی کی یہ علامتی نظم اردو کی جدید نظم نگاری کی تابندہ مثال ہے۔

06.09 فرہنگ

اختراع	:	نئی بات نکالنا، طبیعت سے نئی بات پیدا کرنا	دروں بینی	:	داخلی کیفیت یا حالت کی تحقیق
اختلاط	:	ربط، ضبط، میل جول، پیار، محبت	رنگ محل	:	عیش و عشرت کا گھر، عشرت گاہ، سجا ہوا مکان
اساطیری	:	(واحد اسطورہ) قصے کہانیاں	طبعی امر	:	قدرتی کام، فطری کام یا عمل
بارِ گراں	:	بھاری بوجھ	عسرت	:	تنگی، غربت، دشواری
بحرِ بے کراں	:	بہت بڑا سمندر، وہ سمندر جس کا کنارہ نہ ہو	عشرت انگیز	:	خوشی سے بھرا ہوا، خوشی دینے والا
بدیع السمٰوات	:	سارے آسمانوں کو بنانے والا، انوکھا، نادر	عکسِ مجسم	:	پرچھائیں، جسم کا سایہ، مکمل پرتو
بے کراں	:	نہایت وسیع، بہت زیادہ، بے کنار	قادرِ مطلق	:	پوری طاقت رکھنے والا، اللہ تعالیٰ
پیراہن	:	کپڑا، پوشاک، لباس، جامہ، کرتا	گداز	:	نرمی، ملائمت، پگھلانے والا

تلمیحات	:	کلام میں کسی قصے یا واقعے کی طرف اشارہ کرنا	مبذول	:	خرچ کیا گیا، لگایا گیا، منعطف
تنوّع	:	قسم قسم کا ہونا، مختلف رنگ کا ہونا	محوِخرام	:	مستی یا مدہوشی میں چلنا، مٹک کر مستی سے چلنا
حقیقتِ کبریٰ	:	بہت بڑی حقیقت، اللہ تعالیٰ کی طرف اشارہ			
حیاتِ دوروزہ	:	مختصر زندگی، کم عمر	مماثلت	:	مشابہت، مانند ہونا
خفی	:	پوشیدہ، چھپا ہوا، باریک، مہین	نمود	:	نمائش، ظہور، بالیدگی
خمیر	:	سرشت، طبیعت، مزاج، فطرت	وحدت الشہود	:	اصطلاح تصوف میں دنیا کی ہر چیز جو پیشِ نظر ہے اللہ تعالیٰ کا پرتو ہے
داغ بیل	:	کسی کام کی ابتدا، کسی کام کی بنیاد			

06.10 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ : میراجی کی علامتی نظموں پر مختصر نوٹ لکھیے؟

سوال نمبر۲ : ثناءاللہ ڈار سے میراجی کیسے ہوئے؟ بتلایئے؟

سوال نمبر۳ : میراجی کی شاعری کے بنیادی عناصر سے بحث کیجیے؟

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ : نظم 'سمندر کا بلاوا' کا تنقیدی جائزہ لیجیے؟

سوال نمبر۲ : جدید نظم نگاری میں میراجی کی اہمیت واضح کیجیے؟

سوال نمبر۳ : میراجی کی شاعری میں ''جنسیت کا برملا اظہار ہے'' تجزیہ کیجیے؟

06.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔ ادب اور شعور از ممتاز حسین

۲۔ اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ از منظر اعظمی

۳۔ اردو میں نظمِ معرا اور آزاد نظم ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک از حنیف کیفی

۴۔ پانچ جدید شاعر از حمید نسیم

۵۔ تاریخِ ادبِ اردو ''جلد چہارم'' از سیّدہ جعفر

۶۔ جدید نظم: حاؔلی سے میراجی تک از کوثر مظہری

اکائی 07 : معین احسن جذبیؔ ''میری شاعری اور نقّاد''

ساخت :

07.01 : اغراض و مقاصد
07.02 : تمہید
07.03 : معین احسن جذبیؔ کے حالاتِ زندگی
07.04 : معین احسن جذبیؔ کی نظم نگاری
07.05 : نظم ''میری شاعری اور نقاد'' متن
07.06 : نظم ''میری شاعری اور نقاد'' تجزیہ
07.07 : خلاصہ
07.08 : فرہنگ
07.09 : سوالات
07.10 : حوالہ جاتی کتب

07.01 اغراض و مقاصد

اُردو کے معروف و معتبر شاعر معین احسن جذبیؔ سے متعلق اِس اکائی کے مطالعے سے آپ جذبیؔ کی شخصیت، سوانحی حالات، علمی ادبی خدمات بالخصوص شاعر کی حیثیت سے اُن کے کلام کی خصوصیات اور اُن کی مشہور نظم ''میری شاعری اور نقاد'' کے بارے میں ضروری اور اہم معلومات حاصل کر سکیں گے۔ اِس اکائی کے مطالعے سے اندازہ ہو سکے گا کہ معین احسن جذبیؔ کا شاعرانہ اُسلوب اور انداز کیا ہے؟۔ اردو شاعری خصوصاً ترقی پسند اردو شعرا میں اُن کا مقام و مرتبہ کیا ہے؟۔ اردو شاعری میں اُن کی خدمات کیا ہیں؟۔

07.02 تمہید

معین احسن جذبیؔ کا شمار اہم ترقی پسند شعرا میں ہوتا ہے۔ جذبیؔ بنیادی طور پر شاعر تھے۔ شاعری کا شوق اُنہیں وَرثے میں ملا تھا۔ وہ فطری شاعر تھے اس لئے اُنہوں نے کسی کی تقلید گوارا نہیں کی۔ اُن کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ عمیق تھا۔ زندگی، سماج اور ماحول پر اُن کی گہری نگاہ تھی۔ اُن کی شاعری اُن کے ماحول، زندگی سے حاصل شدہ تجربات اور ذاتی احساسات کی ترجمان ہے۔ وہ زود گو شاعر نہیں تھے پھر بھی جب تک اُن کا مشاہدہ اور تجربہ اُنہیں مجبور نہیں کرتا وہ شعر نہیں کہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے بہت زیادہ شعری سرمایہ یادگار نہیں چھوڑا۔ جو کچھ کہا وہ اُن کے ذاتی تجربات و احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ تعداد سے زیادہ معیار کے قائل تھے۔ یہی سبب ہے کہ اُنہوں نے صلہ و ستائش کی تمنّا کیے بغیر اپنے تخلیقی سفر کو جاری رکھا اور معیار سے کوئی سمجھوتا نہیں کیا۔ اُن کی شاعرانہ تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف تمام اہم ناقدین نے کیا ہے۔

07.03 معین احسن جذبی کے حالاتِ زندگی

معین احسن جذبی ۲۱ راگست ۱۹۱۲ء کو قصبہ مبارک پور ضلع اعظم گڑھ، اُتر پردیش کے ایک علمی وادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد جھانسی سے ہائی اسکول پاس کیا۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۱ء تک سینٹ جانس کالج آگرہ سے ایف۔ ایس۔ سی کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ اینگلو عربک کالج، دہلی سے ۱۹۳۶ء میں بی۔ اے کیا۔ ۱۹۴۲ء میں ایم۔ اے اور ۱۹۶۵ء میں پی ایچ۔ ڈی کی اسناد حاصل کیں۔ ابتداً مختلف عہدوں پر بغرضِ ملازمت فائز رہے۔ ماہ نامہ ''آج کل'' دہلی کے مدیر رہے۔ شعبۂ اردو، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں لیکچرر کے عہدے پر مستقل ملازمت کا آغاز کیا اور ۲۱ راگست ۱۹۷۴ء کو اسی شعبہ سے سبک دوش ہوئے۔ تحقیقی مقالہ بعنوان ''حالی کا سیاسی شعور'' شائع کیا جسے ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا اور پسند کیا گیا۔ معین احسن جذبی کا انتقال ۱۳ رفروری ۲۰۰۵ء کو تقریباً ۹۲ ر سال کی عمر میں ہوا۔ اُنہوں نے طویل عمر پائی اور ساری عمر خاموشی کے ساتھ تخلیقِ شعروادب میں مصروف ومنہمک رہے۔

اُن کی اہم ادبی خدمات کے اعتراف میں مختلف علمی وادبی، سرکاری اور ذاتی اداروں نے اُنہیں انعامات واعزازات سے نوازا۔ مدھیہ پردیش سرکار کے ''اقبال سمان''، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کے ''غالب اعزاز'' اور دہلی اردو اکادمی کے ''کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ'' کے علاوہ مختلف صوبائی اردو اکادمیوں نے بھی اُنہیں اعزاز سے نوازا۔ معین احسن جذبی کے شعری مجموعے ''سخنِ مختصر'' اور ''فروزاں'' کے نام سے شائع ہوئے۔ ''گدازِ شب'' میں مذکورہ بالا دونوں شعری مجموعوں کا انتخاب شامل ہے۔

07.04 معین احسن جذبی کی نظم نگاری

معین احسن جذبی نے غزل اور نظم دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ اگر چہ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے لیکن اُن کی بعض نظموں کو بھی خاصی شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی۔ معین احسن جذبی نے ابتدا میں ملالؔ تخلص اختیار کیا تھا مگر بعد میں جذبی کے نام سے مشہور ہوئے۔ معین احسن جذبی کی شاعری میں حزن وملال کی لے پائی جاتی ہے۔ ادب، سماج اور ادیب یا شاعر حالات کا ترجمان ہوتا ہے۔ جذبی مزاجاً حسّاس اور خوددار انسان واقع ہوئے تھے۔ حالات نے اُنہیں مزید غم پسند اور حسّاس بنا دیا۔

مزاج کی اِس حسّاسیت اور غم نصیبی کی کیفیت نے اُن کے کلام میں غم انگیزی، دردمندی، سنجیدگی، گہرائی اور اثر وتاثیر کی خوبیاں پیدا کر دیں اور یہی تمام باتیں اُن کے کلام کی پہچان بن گئیں۔ اِنہی حالات نے اُن کے انداز واُسلوب اور لب ولہجے کو ایک ایسا خاص رنگ و آہنگ عطا کیا جو دُور اور الگ سے پہچانا جانے لگا۔ جذبی کی غم نصیبی کی پہلی وجہ یہ تھی کہ وہ جب چار برس کے تھے تب اُن کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور وہ اپنی والدہ کے سایۂ شفقت ومحبت سے محروم ہو گئے۔

والدہ کے انتقال کے بعد اُن کے والد نے عقدِ ثانی کر لیا اور اُن کی پرورش اُن کے دادا، دادی اور پھوپی نے کی۔ اُن کے دادا، پھوپھا اور پھوپی شاعر اور ادیب تھے اس لئے بچپن ہی سے اُنہیں شعری اور ادبی ماحول میسر آیا اور اُسی ادبی ماحول میں اُن کی تعلیم وتربیت اور پرورش ہوئی اور کم سنی ہی میں اُنہوں نے شعر گوئی کا آغاز کر دیا۔

جذبی کے گھر کے ماحول، اور بچپن کے حالات سے متعلق انور عظیم نے لکھا ہے:

''میاں معین احسن کی عمر تقریباً سات، آٹھ یا نو سال کی تھی کہ اُن پر شاعری کا حق ادا کرنا واجب ہو گیا

تھا۔اُن کو روزانہ غزلیں یا نظمیں یاد کرنے کو کہا جاتا۔میاں معین احسن جن کے حلیے کا اندازہ اگر آج کے حلیے سے لگایا جائے تو دیکھنے پر ایک بے حد مسکین، خاموش اور سست لڑکا دکھائی دیں گے۔یہی لڑکا پرانی تہذیب کا بھار سر پر اُٹھائے، سر پر ٹوپی چپکائے، آنکھیں نیچی کیے، نہایت ادب سے غالبؔ، اسمٰعیلؔ میرٹھی، حالیؔ اور اقبالؔ کی چیزیں زبانی یاد کرتا اور روز اپنے بزرگوں کو سنایا کرتا.....دادا اور پھوپی وغیرہ کی ادبی دل چسپیوں، غزلیں اور نظمیں یاد کرنے کا اس خاموش لڑکے کے ذہن پر یہ اثر ہوا کہ نَو سال کی عمر میں جناب نے تک بندی شروع کردی۔''

(شخصیات نمبر، نقوش لاہور)

مذکورہ بالا اقتباس کے مطالعے سے جذبیؔ کے بچپن کے ماحول اور اُس ماحول کے اثر سے بننے والے اُن کے مزاج اور طرزِ فکر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔گھر کے علمی اور ادبی ماحول نے جہاں اُن کی ذہنی، علمی اور ادبی تربیت میں نمایاں حصہ لیا وہیں والد کے دوسری شادی کرنے کے سبب اُن کے مزاج میں حُزن و یاس اور ملال کی کیفیت پیدا کردی۔بچپن کے ماحول کے سبب ابتدا ہی سے اُن کے کلام میں غم نصیبی، سنجیدگی اور حزن و ملال کی کیفیت پیدا ہوگئی جو کہ آخر تک قائم رہی اور یہی رنگ اُن کے کلام کو متاثر کن بنانے میں مددگار ثابت ہوا۔

جذبیؔ کا ابتدائی کلام روایتی انداز کا تھا لیکن ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستگی کے بعد اُن کے موضوعات اور لب و لہجے میں قدرے تبدیلی پیدا ہوگئی۔جذبیؔ نے ترقی پسند ادبی تحریک کے مثبت اثرات کو ہی قبول کیا۔اُنھوں نے روایت سے اپنا رشتہ اُستوار رکھا اور ترقی پسندانہ خیالات کو بھی اپنے کلام میں جگہ دی لیکن اپنے تجربات واحساسات کو بنیاد بنانے کے سبب اُن کی انفرادیت ہمیشہ قائم رہی۔

جذبیؔ نے ماضی کی صالح ادبی روایات کو بھی ملحوظ رکھا اور نئے ادبی رجحانات سے بھی متاثر ہوئے اور اپنے ذاتی تجربات واحساسات کی پاس داری اور ترجمانی بھی کرتے رہے۔زندگی اور اُس سے حاصل شدہ تجربات کو اُنھوں نے ہمیشہ خاص اہمیت دی۔وہ پختہ فکری و فنی شعور کے شاعر ہیں۔اُن کے اِس اقتباس سے اُن کی طرزِ فکر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

''ایک شاعر کی حیثیت سے ہمارے لئے جو سب سے اہم ہے وہ زندگی کے تجربات ہیں لیکن کوئی تجربہ اس وقت تک موضوعِ سخن نہیں بنتا جب تک اس میں شاعر کو جذبات کی شدّت اور احساس کی تازگی کا یقین نہ ہو جائے۔یہی دونوں چیزیں شاعر کو قلم اُٹھانے پر مجبور کرتی ہیں۔''

معین احسن جذبیؔ نے جس وقت اپنی شعر گوئی کا آغاز کیا اُس وقت اقبالؔ، فانیؔ، جگرؔ، جوشؔ، فراقؔ، اصغرؔ، یگانہؔ، حسرتؔ اور اخترؔ شیرانی وغیرہ کا طوطی بول رہا تھا۔ایک جانب اگر کلاسیکی اور روایتی شاعری کا چلن تھا تو دوسری جانب رومانیت کا جادو بھی اپنا اثر دکھا رہا تھا۔جذبیؔ نے اِنھی دونوں رنگوں کے زیرِ اثر اپنی شاعری کا آغاز کیا اور ترقی پسند تحریک کے اثرات کو بھی ایک توازن کے ساتھ قبول کرکے معاصرین میں اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے زندگی اور سماج کے حالات کی عکّاسی سادگی اور تاثیر کے ساتھ کرنے کی کوشش کی۔کیوں کہ اُن کے ذاتی حالات اور اطراف کا ماحول سازگار اور موافق نہ تھا اس لئے غزل ہو یا نظم اُن کے کلام میں سوز و ملال، گہرائی اور سنجیدگی کی لہر موج زَن نظر آتی

ہے۔ جذبیؔ کے کلام میں نعرے بازی، انتہا پسندی اور بے جا جوش وخروش اس لئے نظر نہیں آتا کہ اُنہوں نے ترقی پسند ادب کے صحت مند اصولوں کی ہی پیروی کی اور جب ترقی پسند ادب میں نعرے بازی اور غلو پیدا ہونے لگا تو خود کو اس سے علیحدہ کر لیا۔

ترقی پسند تحریک سے متعلق اُن کا یہ اقتباس اُن کی طرزِ فکر کا ترجمان ہے:

''کبھی کبھی نعروں، کھری کھری باتوں، یہاں تک کہ دشنام طرازیوں کو ترقی پسندی سمجھ لیا گیا۔ کبھی صرف تکنیک پر اتنا زور دیا گیا کہ یہ ترقی پسندی کی علامت بن گئی۔ ہم میں سے اکثر ترقی پسندی کی رَو میں ادبی تقاضے بھول گئے۔ چناں چہ اِس دوران جو ادب پیدا ہوا اُسے ہم مشکل سے ادب کہہ سکتے ہیں۔''

(ماخوذ: ''فروزاں'' دوسرا ایڈیشن، ص ۳)

ترقی پسند شعرا کی بھیڑ میں جن شعرا نے اِس نوع کی نعرے بازی اور شدّت پسندی سے خود کو بچائے رکھا اور اپنے حالات، ذہن، فکر اور مزاج کے اعتبار سے انفرادی انداز میں شعر گوئی کو جاری رکھا اور اپنی علیحدہ یا منفرد پہچان قائم کی اُن میں ایک نام معین احسن جذبیؔ کا بھی ہے۔ وہ گوشہ نشین، کم گو، سنجیدہ، حق پسند اور خود دار شاعر تھے اس لئے ابتداً اُنہیں وہ شہرت حاصل نہ ہو سکی جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے لیکن چوں کہ اُن کا کلام حقیقی تجربوں اور سچے سیاسی اور سماجی حالات کا ترجمان ہونے کے سبب ایک خاص رنگ واثر کا حامل تھا اِس لئے رفتہ رفتہ اُن کی شاعرانہ حیثیت اور اہمیت کو تسلیم کیا جانے لگا اور وہ اپنی عمر کے اہم شاعروں میں شمار کیے جانے لگے۔

جذبیؔ نے غزل گوئی سے شعر گوئی کا آغاز کیا تھا۔ ۱۹۳۴ء کے آس پاس وہ نظم گوئی کی جانب متوجہ ہوئے اور اِس صنف میں بھی اُنہوں نے اپنی انفرادیت کو قائم رکھا۔ اُن کی غزلوں کی طرح اُن کی نظمیں بھی اُن کی زندگی اور عہد وسماج کے حالات کی مؤثر ترجمانی کرتی ہیں۔ غزل ہو یا نظم جذبیؔ کو اپنی بات اپنے انداز میں کہنے کا ہنر آتا تھا۔ اُن کا فن اُن کے اِس قول کی تصدیق کرتا ہے:

''تجربہ، تخلیق کی منزل تک پہنچنے کے لئے صرف تحلیل وتجزیے کے مراحل سے نہیں گزرتا بلکہ شاعر کے مزاج سے بھی ہم آہنگ ہوتا ہے۔''

(''گدازِ شب'' 'پیش گفتار' انور صدیقی ص ۱۱)

فن، موضوع اور پیش کش کے اعتبار سے معیاری اور موزوں ہونے کے سبب جذبیؔ کی غزلوں کی طرح اُن کی نظموں کو بھی ادبی حلقوں میں خوب سراہا گیا اور وہ اچھے غزل گو کی طرح کامیاب نظم گو شاعر سمجھے جانے لگے۔ اُن کا کلام مقدار کے اعتبار سے کم سہی لیکن معیار کے اعتبار سے کم نہیں ہے۔ جذبیؔ نے غزلوں کی طرح نظمیں کم ہی کہیں لیکن فکر وفن اور موضوع واُسلوب وآہنگ کے سبب اُن کی کئی نظمیں اردو کی نمائندہ نظموں میں شمار کی جاتی ہیں۔ اُن کی مقبول ومعیاری نظموں میں ''ہلالِ عید، موت، طوائف، میرے سوا، نیا سورج، تقسیم، مجاز اور میری شاعری اور نقاد'' وغیرہ اُن کی ایسی شاہ کار نظمیں ہیں جن کے سبب اردو ادب میں وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

''میری شاعری اور نقاد'' جذبیؔ کی فکر انگیز، طویل نظم ہے۔ جوشؔ ملیح آبادی نے بھی ایک نظم ''نقاد کے نام سے'' لکھی تھی جو خاصی مقبول ہوئی تھی لیکن جذبی کی یہ نظم جوشؔ کی نظم سے الگ رنگ وآہنگ رکھتی ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن نے اپنے مضمون بعنوان ''جذبی'' میں اِس نظم پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اُسے سات مختلف حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

- ☆ پہلے حصّے میں نقّاد کی طرف سے شاعر سے احساس کی سرمستی اور کیف کے فقدان کا شکوہ ہے۔
- ☆ دوسرے حصّے میں شاعر کی طرف سے اس کا جواب ہے۔
- ☆ تیسرے حصّے میں شاعر اپنے شب و روز کا عالَم دکھاتا ہے۔
- ☆ چوتھے حصّے میں کارگہِ دہر کا نظارہ ہے جو جنگِ عظیم اور عالمی کرب کا بیان ہے۔
- ☆ پانچویں حصّے میں آزادی کے بعد کا منظر ہے۔
- ☆ چھٹے حصّے میں حسّاس شہری کی حالتِ زار ہے۔
- ☆ ساتویں حصّے میں انقلاب کی آرزو اور مستقبل کا پرکیف منظر ہے۔

07.05 نظم ''میری شاعری اور نقّاد'' متن

﴿پہلا حصہ﴾

اے مرے شعر کے نقّاد ! تجھے ہے یہ گلہ
کہ نہیں ہے مرے احساس میں سرمستی و کیف
کہ نہیں ہے مرے انفاس میں بُوے مئے جام
چمنِ دہر کی تقدیر کہ میں ہوں وہ گھٹا
جس نے سیکھا ہی نہیں ابرِ بہاری کا خرام
رات تاریک ہے اور میں ہوں وہ اک شمعِ حزیں
جس کے شعلے میں نہیں صبحِ درخشاں کا پیام
میرے پھولوں میں صباؤں نہ بہاروں کا گزر
میری راتوں میں ستاروں نہ شراروں کا گزر
میری محفل میں نہ مطرب ، نہ مغنّی کا سرود
میرے مَے خانے میں موجِ مئے اُمید حرام
میں وہ نقاش ہوں ، کھویا ہوا بھٹکا نقاش
جس کے ہر نقش میں ، تخئیل کے ہر پیکر میں
مسکراتی ہے بڑے ناز سے روحِ آلام

﴿دوسرا حصہ﴾

اے مرے دوست ! مرے غم کے پرکھنے والے
بس چلے میرا تو لادوں تجھے روحِ گلِ تر
بخش دوں اپنی تڑپ ، اپنا جنوں ، اپنی نظر
پھر تجھے اپنے شب و روز کا عالم دِکھلاؤں
ہر تبسّم میں تجھے شائبۂ غم دِکھلاؤں
خونِ نا حق پہ جو ہوتا ہے وہ ماتم دِکھلاؤں
پرتوِ خور سے جو بے جاں ہے وہ شبنم دِکھلاؤں
تجھ کو دِکھلاؤں کہ بے رنگ ہے کس درجہ سحر
تیرہ و تار سی یہ رات ، بھیانک سی فضا
ڈگمگاتے ہوئے قدموں کو مِرے دوست! بڑھا
اک ذرا اور بلندی پہ خدارا آجا

﴿تیسرا حصہ﴾

دیکھ اِس وسعت تاریک کے سنّاٹے کو
دیوتا موت کا کھولے ہوئے جیسے شہ پر
اور اِس وسعت تاریک کے سنّاٹے میں
کوئی چھینے لیے جاتا ہے ستاروں کی دَمک
کوئی بے نور کیے دیتا ہے شعلوں کی لپک
کوئی کلیوں کو مسلتا ہے تو پھر کیا کی جے
زخمِ گُل تجھ کو مہکنا ہے تو ہنس ہنس کے مہک
کون صیّاد کی نظروں سے بھلا بچتا ہے
طائرِ گوشہ نشیں! خوب چہک! خوب چہک!
جاگتی زرد سی آنکھیں نہ کہیں لگ جائیں
دردِ افلاس! ذرا اور چمک! اور چمک!
لعل و گوہر کے خزانے بھی کہیں بھرتے ہیں
عرقِ محنتِ مجبور! ٹپک اور ٹپک!

ہے ترے ضعف پہ کچھ مستیِ صہبا کا گماں
اے قدم! اور بہک! اور بہک! اور بہک!
وہ چمکتی ہوئی آئی ترے سر پر شمشیر
مژۂ طفلکِ معصوم! جھپک! جلد جھپک!
سینۂ خاک میں بے کار ہوا جاتا ہے جذب
رُخِ بے داد پہ اے خون جھلک! آہ جھلک!
قطرہ قطرہ یوں ہی ٹپکاتا رہے گا کوئی زہر
تو بھی اے صبر کے ساغر! یوں ہی تھم تھم کے چھلک!
موت کا رقص بھی کیا چیز ہے اے شمعِ حیات!
ہاں ذرا اور بھڑک! اور بھڑک! اور بھڑک!

﴿چوتھا حصہ﴾

ہر طرف کارگہِ دہر میں اُٹھتا ہے دھواں
ہر طرف موت کے آثار ، تباہی کے نشاں
سرد اجسام بتاتے نہیں منزل کا پتا
راہیں ویران ہیں ، ملتے نہیں راہی کے نشاں
ظلمتِ غم ہے کہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے
ہاں مگر کس نے جلائے ہیں یہ حکمت کے دِیے
آنکھیں چیخیں کہ نکل آیا وہ اُمید کا چاند
چونکا دیوانہ کہ دامانِ دَریدہ کو سیے
دوڑا مَے خوار کہ اِک جامِ مَئے تُند پیے
خواہشِ مرگ مِرے سینے میں ہونے لگی ذبح
ڈوبتے دل نے دعا مانگی کہ کچھ اور جیے

﴿پانچواں حصہ﴾

یک بہ یک آندھیاں اُٹھنے لگیں ہر جانب سے
آن کی آن میں گہنا گیا اُمید کا چاند
آن کی آن میں گُل ہو گئے حکمت کے دِیے
نہ تو دیوانے کا دامانِ دریدہ ہی سِلا
نہ تو مے خوار کو اک قطرۂ صہبا ہی ملا
بدلیاں چھٹنے نہ پائی تھیں کہ پھر چھانے لگیں
بجلیاں سر پہ اُسی طَور سے لہرانے لگیں
جس کے سینے میں ہوں اے دوست! ہزاروں ناسور
جیتے جی اُس نے بھلا چین کبھی پایا ہے؟
آہ آئی ہے مرے لب پہ تو کیوں کر روکوں؟
کیا کروں اشک اگر پلکوں پہ ڈھل آیا ہے

﴿چھٹا حصہ﴾

لیکن اے دوست ! مِرے درد کے بے حِس نقّاد!
میرے آنسو ، مری آہیں بھی تو کچھ کہتی ہیں
میری افسردہ نگاہیں بھی تو کچھ کہتی ہیں
اور داغِ دلِ ناکام دِکھاؤں کیسے؟
دلِ خوں گشتہ کا پیغام سناؤں کیسے؟
یوں تو کہنے کو یہ آنسو ہیں بس اک قطرۂ آب
جن میں سرخی دلِ پُر خوں کی نہ سوز و تب و تاب
پر کوئی نرم سا جب راگ سنا دیتے ہیں
یہی آنسو ہیں کہ اِک آگ لگا دیتے ہیں
چین کب دیتی ہیں افسردہ نگاہیں میری
آندھیاں سینوں میں بھر دیتی ہیں آہیں میری
صبر اے دوست ! ابھی سرد کہاں غم کی آگ
لب تک آئے بھی تو جل جائیں گے سب عیش کے راگ

﴿ساتواں حصہ﴾

صبر اے دوست! کہ اک ایسا بھی دن آئے گا
خاص اک حد سے گزر جائے گا پستی کا شعور
سینۂ خاک سے پھر اُٹھے گا وہ شورِ نشور
گنبدِ تیرۂ افلاک بھی تھرّائے گا
وہ اسیرانِ بلا کا درِ زنداں پہ ہجوم
کانپتی ، ٹوٹتی زنجیروں پہ رقصِ بے ربط
رقصِ بے ربط میں پھر ربط سا آجائے گا
غیر کے ساغرِ زر پاش کا پھر جو بھی ہو حشر
اپنا ہی جامِ سفالیں کوئی چھلکائے گا
گیسوئے شاہدِ گیتی میں پرو کر موتی
کوئی دیوانہ بہت دادِ جنوں پائے گا
صبر اے دوست! کہ اک ایسا بھی دن آئے گا
انجمن بدلے گی ، سب ساز بدل جائیں گے
گانے والوں کے بھی انداز بدل جائیں گے

07.06 نظم ’’میری شاعری اور نقّاد‘‘ تجزیہ

معین احسن جذبی کی نظم ’’میری شاعری اور نقاد‘‘ کا کینوس بہت وسیع ہے۔ اِس نظم میں شاعر نے صرف اپنی داخلی کیفیات کو ہی پیش نہیں کیا ہے بلکہ وہ خارجی حالات اور واقعات کو پیش کرنے میں بھی کامیاب نظر آتا ہے۔ اِس نظم کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنے عہد کے قومی اور بین الاقوامی واقعات، حالات اور زندگی کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ شاعر نے بیش تر واقعات کے مضر اثرات کو نہ صرف محسوس کیا ہے بلکہ فن کارانہ سلیقے سے اپنے قلبی تاثرات کا اظہار بھی کیا ہے۔ اِس نظم کا اصل نشانہ یا مخاطب نقّاد ہے۔

نقّاد سے متعلق جوشؔ ملیح آبادی نے بھی نظم کہی ہے لیکن جذبی کی نظم کا کینوس، مقصد اور انداز زیادہ پر اثر، پروقار اور وسیع تر ہے۔ اِس نظم میں ایک سچے تخلیقی فن کار کی آوازِ احتجاج سنائی دیتی ہے اور نقّاد پر طنز بھی اِس طرح کیا گیا ہے کہ تخلیقی کرب، دردمندی، انسان دوستی، وضع داری، اخلاص، فن کار کا زندگی اور سماج کے تئیں ہمدردانہ لگاؤ، جاں سوزی اور جاں نثاری سبھی پہلو سمٹ کر نظم کو اعلیٰ پایے کی تخلیق بنا دیتے ہیں۔ اِس نظم کو پڑھ کر زندگی، انسان، دنیا اور سماج سے متعلق شاعر کی وابستگی اور دل بستگی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور ڈاکٹر محمد حسن کی یہ رائے بھی سچ ثابت ہوتی نظر آتی ہے کہ:

''جذبی سلگتی ہوئی آتشِ رفتہ کے شاعر ہیں.....وہ ستاروں پر کمندیں ڈالنے والے شاعر نہیں، زندگی کو بھوگنے اور بھگتنے والے دردمند دل کے شاعر ہیں جو لفظوں سے کھیلنے کے بجائے اُن کے احترام اور اُن کے باہمی رشتوں کے تقدس اور اُن کے پیچھے نغمے اور رنگ کے دروبست کے شیدائی ہیں۔''

نظم ''میری شاعری اور نقاد''،تسلسل اور ارتقائے فکر کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ جذبات و احساسات کے رَچاؤ کے اعتبار سے بھی ایک بلند معیار کی تخلیق کہی جا سکتی ہے جس میں شاعر کی دردمندی، نغمگی، سلیقہ مندی اور محاکاتی انداز نمایاں نظر آتا ہے۔ اِس نظم کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر نے اِس نظم میں ایک منفرد انداز اختیار کر کے ایک عنوان کے تحت کئی موضوعات کو فن کارانہ چابک دَستی کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ الگ الگ ہوتے ہوئے بھی یہ مختلف موضوعات ایک دوسرے سے مربوط نظر آتے ہیں۔ اگرچہ نظم کے عنوان سے ایسا لگتا ہے کہ اِس نظم میں جوش ملیح آبادی کی نظم ''نقاد'' کی طرح صرف نقاد کو مخاطب کیا گیا ہوگا لیکن نہ تو یہ نظم جوش کی نظم کی طرح براہِ راست اندازِ تخاطب کی حامل ہے اور نہ ہی اس کا انداز و آہنگ اتنا سخت و ثقیل ہے۔ اِس میں نقاد سے خطاب تو ہے لیکن اِس طرح کہ زندگی کی سچائیاں، شاعر کے احساسات، اُس کی مجبوریاں، نارسائیاں، درد و کرب اور دلِ دردمند کی آواز سبھی کچھ اِس نظم میں اس طرح سمٹ آئی ہیں کہ اس نظم کو پڑھ کر شاعر کی حسّاس طبیعت، حق گوئی اور شرافتِ نفس کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ نظم میں شامل مختلف باتوں اور تأثرات کو شاعر نے سات حصوں میں تقسیم ضرور کیا ہے لیکن یہ عمل اِس طرح انجام دیا گیا ہے کہ نظم کے سبھی حصے آپس میں مربوط و منسلک نظر آتے ہیں اور اِسے پڑھ کر ایک ایسا خاص مجموعی تاثر اور ایسی فضا قاری کے ذہن میں پیدا ہو جاتی ہے جو اُسے شاعر کا ہم نوا اور ہم خیال بنا دیتی ہے۔

شاعر نے اِس نظم میں براہِ راست اپنی بات نہ کہہ کر بھی اپنے مافی الضمیر کا اظہار اِس فنّی سلیقے سے کیا ہے کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نظم کی ایک بڑی خوبی سلاست، روانی اور اثر پذیری بھی ہے اور متن میں شامل زندگی اور تجربات سے متعلق شاعر کے احساسات اور جذبات کا وہ خوب صورت اظہار بھی ہے جو شاعر کی قدرتِ کلام، بلاغت اور فکرِ بلیغ کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ شاعر نے نظم کے سات مختلف حصّوں کو اس طرح مربوط کیا ہے کہ اُنہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ مختلف موضوعات پر مشتمل ہونے کے باوجود نظم کے ساتوں حصے باہم مربوط و ہم آہنگ ہیں۔

جیسا کہ ابتدا ہی میں کہا جا چکا ہے کہ نظم کے پہلے حصّے میں شاعر نے نقاد کے اُن اعتراضات کو بیان کیا ہے جو کہ عام طور پر ناقدین کی جانب سے شاعروں اور اُن کی شاعری پر کیے جاتے رہے ہیں۔ عام روش کی طرح نقاد کو شاعر یعنی جذبی سے بھی یہی شکایت ہے کہ اُس کے کلام میں سرمستی اور کیف کا فقدان ہے کیوں کہ یہ شاعر کا مزاج، انداز اور فکر و خیال کے ساتھ اظہار کا طریقہ ہوا کرتا ہے۔ 'شعر برائے شعر گفتن' ادب برائے تفریح و تفنن ایک علیحدہ معاملہ ہے۔ جو شعرا اِس اصول پر عمل پیرا ہیں اُن کے کلام میں سرور و سرمستی اور کیف و لطف و انبساط کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔ ہر شاعر اِس روش کا قائل نہیں ہو سکتا۔ حالات کی مجبوری، مزاج کی مناسبت، نامساعدت اور ذہنی سنجیدگی ہر شاعر کو رنگینی اور کیف و سرور کے اظہار پر مجبور نہیں کر سکتی۔

بڑے شاعر کا کلام اُس کے حالاتِ زندگی اور افتادِ طبع کا عکّاس و ترجمان ہوتا ہے۔ جذبی بھی ایک حسّاس دل اور سنجیدہ مزاج شاعر تھے۔ اُنہوں نے زندگی کو قریب سے دیکھا، سمجھا اور برتا بلکہ بھوگا تھا۔ اِس لئے اُن کے کلام میں زندگی کے تلخ و تند پہلو کا عکس اور لہجے میں سوز

وسنجیدگی کی لے پائی جاتی ہے۔ اُنھوں نے تلخیِ دَوراں کو یا غمِ زمانہ اور غمِ جاناں کو مرثیہ تو بننے دیا لیکن اپنی دھیمی اور نرم آواز میں اُن حقائق کو پیش کرنے کی سعی کی جن سے وہ نبرد آزما رہے ہیں۔ جذبی کے کلام میں سوز و اَلَم کی ایک زیریں لہر محسوس کی جا سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نظم کے دوسرے حصّے میں شاعر نے ایک حسّاس فن کار اور ذمّہ دار تخلیق کار کے بطور، نقّاد کے اعتراضات کے جوابات معروضی اور معقول انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ نظم کے پہلے حصّے میں نقّاد، شاعر پر یہ اعتراض کرتا ہے کہ اُس کی تخلیقات میں سرمستی و کیف کے عناصر نظر نہیں آتے۔ اُس کے انفاس میں بوئے مَے نہیں ہے۔ وہ ابرِ بہاری کے خرام کے لطف سے عاری ہے۔ اُس کی حیثیت ایک شمعِ حزیں کی سی ہے۔ اُس کے کلام میں صباؤں اور بہاروں کا گزر نہیں ہے نہ ہی مُغنّی کا سرود ہے اور نہ ہی پُر امیدی کی لے۔ وہ ایک ایسا کھویا اور بھٹکا ہوا نقّاش ہے جس کے ہر نقش میں روحِ آلام نمایاں ہے۔

یہ اعتراضات محض جذبی کے کلام سے ہی تعلق نہیں رکھتے ہیں بلکہ دیگر سنجیدہ شعرا کے کلام پر بھی اِن کا انطباق ہوسکتا ہے کیوں کہ جذبی کی شاعری ایک خاص پس منظر اور لب و لہجے کی آئینہ دار ہے اور بعض ناقدین نے اُن پر اعتراضات بھی کیے ہیں لہٰذا وہ اپنی شاعری اور طرزِ فکر وفن کو ظاہر کرتے ہوئے نظم کے دوسرے حصّے میں اعتراضات کے جوابات اِس طرح دیتے ہیں کہ اگر میرا بس چلے تو میں روحِ گلِ تر تیرے لئے پیش کر دوں لیکن میرے حالات، میرے شب و روز کا عالَم، میری تڑپ، میرا جنون، میری فکر و نظر مجھے ایسا کرنے سے باز رکھتی ہے۔ یہ بات عذرِ لنگ نہیں بلکہ ایک سچے اور اچھے فن کار کے دلِ دردمند کی آواز ہے۔

جذبی کی شاعری آورد نہیں بلکہ آمد کا نتیجہ ہے۔ اِس لئے بھی کوئی مصنوعی فضا اُس میں شامل نہیں ہوسکتی۔ وہ اُجاڑ منظر، خزاں رسیدہ چمن، بے رنگ سحر، تاریک رات اور بھیانک فضا کو اپنے سامنے محسوس کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے نامساعد حالات میں کوئی بھی حسّاس اور ذمّہ دار شاعر خوشی کے نغمے کس طرح گا سکتا ہے؟ جذبی نے اِنہی باتوں کو نظم کے اِس حصّے میں نقّاد کو مخاطب کرتے ہوئے بڑے سلیقے سے بیان کیا ہے۔

نظم کے دوسرے حصّے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر نقّاد کے اعتراضات سے بددِل اور بدظن نہیں ہے لیکن وہ احوالِ واقعی کو بطورِ اظہار اپنے دل کی بات کر کے اپنے دل کے بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ نقّاد کو دشمن نہیں سمجھتا اور اُسے ''دوست'' کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ شاعر نے بڑے سلیقے سے نقّاد کو اپنی شاعری کی تہ تک پہنچنے اور سمجھنے کے لئے فضا ہموار کی ہے۔ شاعر نے نقّاد کو اپنے تخلیقی تجربے میں شامل کرنے اور پیش منظرِ واقعات سے واقف کرانے کی کوشش کی ہے۔ شاعر کا اصرار ہے کہ جب پورے معاشرہ کے افراد ہی درد و اَلَم کی اذیتوں میں مبتلا ہیں اور حالات موافق وسازگار نہیں ہیں تو پھر سرور و کیف کا نغمہ کس طرح گایا جاسکتا ہے؟ شاعر نقّاد کو یہ بھی بتانا چاہتا ہے کہ وہ قنوطی اور یاس پسند شاعر نہیں ہے بلکہ سچے حالات و احساسات کا ترجمان ہے۔ اُس نے زندگی اور سماج سے جو کچھ حاصل کیا ہے اُن تجربات و احساسات کو وہ اپنے کلام میں ظاہر کرنے پر مجبور ہے لہٰذا اُس سے لطف و سرور و کیف و انبساط کے اظہار کا مطالبہ کرنا مناسب نہیں ہے۔

وہ حقیقی حالات سے منہ نہیں موڑ سکتا۔ مسائل اور مصائب سے رُوگردانی نہیں کرسکتا۔ وہ وہی کہے گا جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے، سمجھ رہا ہے اور سوچ رہا ہے۔ اُس کا ضمیر اُسے حق گوئی پر اُکساتا ہے اور وہ ذمّہ داری کے ساتھ اپنی بات اپنے کلام میں پیش کر دیتا ہے۔ اُسے یہ فکر یا یہ غم

نہیں ہے کہ اُس کے کلام سے متعلق عوام وخواص کی رائے کیا ہے؟ وہ تو ایک ذمّہ دار اور حسّاس تخلیقی فن کار کی طرح اپنے فرائض کو انجام دے رہا ہے۔ نظم کے دوسرے حصّے میں شاعر نے معتدل ومتوازن انداز اور پر اثر لب و لہجے میں اپنی بات اپنے اُس نقاد دوست سے کہی ہے جو کہ تخلیق کے کرب، تخلیقی عمل اور اُن کے مخصوص حالات سے واقف نہیں ہے کہ جن سے ایک حسّاس فن کار گزرتا ہے اور جن سے متاثر ہو کر وہ اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتا ہے۔

اِس دوسرے حصّے کے ذریعے شاعر نقّاد سے یہ کہنا چاہتا ہے کہ میرے لئے حقائق سے گریز ممکن نہیں ہے اور میں وہی کہتا ہوں جو دیکھتا اور محسوس کرتا ہوں۔ جذبی نے خوش سلیقگی کے ساتھ نقّاد کو اُن نکات کی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے جن سے ایک بیدار ذہن تخلیق کار دوچار ہوتا ہے۔ جذبی چاہتے ہیں کہ نقّاد بھی اُن حالات، واقعات، معاملات اور حادثات ومراحل کو جانے اور سمجھے جن سے ایک فن کار گزرتا ہے یا جن کے سبب فن کار کا فن سنورتا اور نکھرتا ہے یا جو حالات شاعر کو اظہار پر اُکساتے اور مجبور کرتے ہیں۔ اِس حصّے میں شاعر، نقاد کو اپنے فن کارانہ منصب اور تخلیقی فرائض سے واقف کرانا چاہتا ہے اور اُس کا یہ عمل عین فطری اور مبنی بر حقیقت ہے۔

اِس نظم کے دوسرے حصّے کے بیش تر اشعار میں شاعر نے حیات وکائنات سے متعلق حالات پر اور شاعر کی فکر وبصیرت سے متعلق بلیغ اشارے کیے ہیں اور وہ یہ بھی کہنا چاہتا ہے کہ ایک حسّاس، ذمّہ دار اور فرض شناس شاعر کے لئے حقیقی حالات کی ترجمانی نہایت ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر اُس پر غفلت اور غیر ذمّہ داری کے اعتراضات کیے جاسکتے ہیں۔ لہٰذا وہ ایسا کوئی بھی کام نہیں کرسکتا جو کہ اُس کے منصب ومرتبے کے منافی ہو۔ شاعر چاہتا ہے کہ نقّاد بھی اُسی کی نظر سے دنیا اور اُس کے معاملات کا مشاہدہ کرے اور اُسی کی طرح مسائلِ زندگی کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ شاعر کی تخلیق کی روح اور طریقۂ اظہار کو سمجھنے کے لئے نقّاد کو بھی شاعر کے حالات، مزاج، ماحول اور اندازِ فکر ونظر کو جاننا اور سمجھنا ضروری ہوگا ورنہ وہ شاعر اور اُس کے فن اور فکر کے ساتھ انصاف نہیں کرسکے گا۔

نظم کا تیسرا حصّہ اِس لئے اہم اور متاثر کن ہے کہ اُس میں شاعر نے اپنی زندگی کے اُن حالات وواقعات کا اظہار کیا ہے جن سے وہ دوچار رہا ہے یا جن حالات پر اُس نے اپنے فکر وفن کی بنیاد رکھی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ شاعر نے محض ذاتی زندگی کے ماحول اور حالات کو ہی موضوع نہیں بنایا ہے بلکہ اپنے پورے عہد کے انسان کی زندگی، اُس کی محرومیوں، ناآسودگیوں اور مسائل کو بھی پیش کیا ہے تاکہ اندازہ ہوسکے کہ شاعر کن حالات سے نبرد آزما رہا ہے اور اُس کی شاعری کے موضوعات کیا ہیں؟ اور اُس کے کلام میں جو بھی انداز نظر آتا ہے وہ کہاں سے آیا ہے؟ کن حالات نے شاعر کے لہجے اور طرز کو متاثر کیا ہے؟ نظم کا تیسرا حصّہ قدرے طویل اس لئے ہوگیا ہے کہ اُس میں شاعر نے محض اپنی زندگی اور اپنے ذاتی احساسات کو ہی پیش نہیں کیا بلکہ اپنے عہد کے انسانوں کی فکری اور نفسیاتی کش مکش کو ظاہر کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔

شاعر کو اپنے ماحول پر چھائی ہوئی اُداسی کا شدید احساس ہے۔ اُسے لگتا ہے کہ اِس وسعتِ تاریک کے سنّاٹے میں ستاروں کی چمک ماند پڑ رہی ہے۔ شعلوں کی لپک بے نور ہورہی ہے۔ کوئی کلیوں کو مَسَل رہا ہے۔ ہر شے صیّاد کے نشانے پر ہے اور زندگی کا چہرہ اُداس اور زرد ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے نامساعد حالات میں کسی فن کار سے خوشی کے نغمے سنانے اور لطف وسرور کی باتیں کرنے کی توقع کیوں کرکی جاسکتی ہے؟ نظم کے تیسرے حصّے میں شاعر کی دردمندی، انسان دوستی اور ترقی پسندی نقطۂ عروج پر نظر آتی ہے۔ وہ ماحول کی اُداسی، اندوہ ناکی، کرب و اضطراب اور حالات کی ستم ظریفی سے صرفِ نظر کس طرح کرسکتا ہے؟ شاعر نے اپنے عہد کی ہول ناکی کو جن شعری تلازموں کے ذریعے

اُجاگر کیا ہے وہ محض اُس کے کمالِ فن کی دلیل ہی نہیں ہے بلکہ حق پسندی اور حق گوئی کی علامت بھی ہے۔ آزادی سے قبل ہندوستان اور ہندوستانیوں کی بدحالی اور بے بسی کو اِس حصّے میں نہایت موٴثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ شاعر نے آزادی کے متوالوں کی حسرت ویاس کو بھی بیان کیا ہے اور درد وغم کے مارے انسان کی کسک کو بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اُن میں حالات کو سمجھنے اور اُس سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت پیدا ہوجائے۔ وہ باطل قوّتوں کا مقابلہ کرکے حق کی فتح حاصل کرسکیں۔

نظم کا چوتھا حصّہ آفاقی حیثیت اختیار کرگیا ہے جس میں شاعر نے زندگی کو وسیع تر تناظر میں دیکھنے، دِکھانے، سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اِس حصّے میں عالمی جنگ کی تباہ کاریوں اور انسان دشمنی کو موضوع بنا کر زندگی کی بقا اور احترامِ آدمیّت کی بات کہی گئی ہے۔ جذبؔی اُن انسانوں کے ماضی کی زندگی پر اظہارِ افسوس کرتے ہیں جو زندگی کی دوڑ سے باہر ہوچکے ہیں۔ یادِ رفتگاں بن چکے ہیں۔ ظلم وتشدّد کے اِس ماحول میں درد وغم، کرب والَم کے سلسلے تھمنے کا نام نہیں لیتے لیکن اُن تمام تباہ کاریوں اور بدحالیوں کے باوجود شاعر نا اُمید نہیں ہے۔ نظم کے اِس چوتھے حصے کے آخر میں وہ خوش گوار حالات کی نشان دہی کرتا ہے۔ شاعر کے اِس خوش گوار رویّے سے زندگی سے بے زاری کا رجحان کم ہوتا نظر آتا ہے۔ اِس حصّے میں شاعر نے ہم وطنوں کے جذبات کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

نظم کا پانچواں حصّہ بھی حقائق کا حامل ہے لیکن اِس سے شاعر کے جذباتی ردِّعمل کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ اِس حصّے میں شاعر نے قومی حالات پر اپنے ردِّعمل کا اظہار کیا ہے۔ حصولِ آزادی ایک بڑا اور اہم مسئلہ تھا۔ عرصۂ دراز کی جدوجہد، کوششوں اور قربانیوں کے بعد بالآخر ملک آزاد ہوگیا لیکن آزادی کی اِس خوشی اور خواب سے متعلق دانش وَروں اور فن کاروں نے جو توقعات وابستہ کی تھیں وہ پوری نہ ہوسکیں۔ تقسیمِ وطن کے المیے نے نہ صرف لاکھوں انسانوں کو ہجرت پر مجبور کردیا بلکہ بے شمار بے قصور انسانوں کو اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ بدامنی، فتنہ وفساد، قتل وغارت گری، تعصب اور نفرت کی آندھی نے آزادی کی خوشیوں اور جشن کو مدھم کردیا۔

ہر حسّاس فن کار نے اِن نازک اور اہم واقعات وحالات کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اپنے ردِّعمل کا اظہار بھی کیا ہے۔ جذبؔی نے اِن حالات کو نظم کے پانچویں حصّے میں پوری ذمّے داری اور سچائی کے ساتھ دردمندانہ لہجے میں بیان کیا ہے۔ وہ داغ داغ اُجالا اور شب گزیدہ سحر کا شکوہ بھی کرتے ہیں۔ حالات کی سنگینی اور شدّت بھی بیان کرتے ہیں اور شکستہ خواب اور اُمیدوں کے پورے نہ ہونے کا اظہار کرتے ہوئے آخر میں اپنی بات اِس طرح کہتے ہیں:

؎ آہ آئی ہے مِرے لب پہ تو کیوں کر روکوں؟ کیا کروں اشک اگر پلکوں پہ ڈھل آتا ہے

اِس حصّے کے اشعار میں شاعر کے دلِ دردمند کی آواز، وطنِ عزیز سے محبت اور انسانیت سے لگاؤ کے جذبات کو بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ جذبات سے پُر اِن اشعار کو پڑھ کر سنگ دل انسان بھی پگھل اُٹھتا ہے۔ اِن اشعار کی لفظیات، مصطلحات، تشبیہات بڑی پُر اثر اور معنی خیز ہیں۔ اِس حصے میں شاعر نے آزادی کے بعد کی صورتِ حال کو بڑی فن کاری اور دل سوزی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

نظم کے چھٹے حصّے میں ایک حسّاس شہری کی نفسیات کو کامیابی کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شاعر کو گلہ ہے کہ حالات کی سنگینی اور شاعر کے دردمندانہ جذبات کو سمجھنے والا کوئی نہیں۔ وہ نقّاد کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ حالات کی ستم ظریفی کے سبب میری آنکھوں میں

اُمنڈ نے والے آنسوؤں اور میرے دل میں پیدا ہونے والے درد کو سمجھنے والا کوئی نہیں۔ کوئی بھی میرے غم میں شریک نہیں۔ چھٹے حصّے کے یہ اشعار شاعر کی اُداسی، غم انگیزی، حساسیت اور کرب کو بخوبی ظاہر کرتے ہیں:

چین کب دیتی ہیں افسردہ نگاہیں میری آندھیاں سینوں میں بھر دیتی ہیں آہیں میری
صبر اے دوست! ابھی سرد کہاں غم کی آگ لب تک آئے بھی تو جل جائیں گے سب عیش کے راگ

جذبؔی کا یہ وفور اور غم و الَم کا یہ اظہار فطری ہے۔ اِس عمل سے شاعر اپنے تمام مخاطبین خصوصاً نقّاد دوست کو صورتِ حال سے واقف کرانا چاہتا ہے تاکہ وہ سمجھ سکے کہ ایک حسّاس شاعر کے دل پر اُس کے اطراف کے حالات کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں اور وہ کس طرح سوچتا، محسوس کرتا اور اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ نظم کے اِس حصّے کے اشعار کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر نہ صرف اپنی فکر و احساس اور دلِ راز کی حالت کو بیان کرنا چاہتا ہے بلکہ وہ اُن حالات سے نقّاد کی بے حسی، بے توجہی اور سرد مہری پر بھی طنز کرنا چاہتا ہے یا یہ بتانا چاہتا ہے کہ ہر ادب اپنے اطراف کے حالات کا ترجمان ہوتا ہے۔ ادیب کے حالات جیسے ہوتے ہیں وہ ویسے ہی جذبات و احساسات کا اظہار کرتا ہے۔

لہٰذا ہر فن کار کے فن کا جائزہ لینے سے قبل اُس کے عہد و سماج اور زندگی کے حالات اور ماحول کو سمجھنا اور جاننا ضروری ہے۔ تب ہی کوئی نقّاد کسی فن کار کے فن سے انصاف کر سکے گا۔ جذبؔی نے اِس نظم میں بار بار یہی کوشش کی ہے اور نقّاد کو یہ بتانا چاہا ہے کہ ایک حسّاس اور ذمّہ دار تخلیق کار کا فرض کیا ہے؟ اور اُس کا تخلیقی عمل کس طرح اپنے جذبات و خیالات سے متاثر ہوتا ہے؟ اور وہ کس طرح اپنے جذبات و خیالات و احساسات کو پیش کرتا ہے؟ یہ نظم نقّادوں کی بالا دستی اور ہٹ دھرمی کے خلاف ایک ادبی احتجاج بھی ہے۔

نظم کا آخری بند اس لئے بھی خاص اہمیت کا حامل ہے کہ اُس میں شاعر نے پُر امیدی کا اظہار کرتے ہوئے حالات کی تبدیلی کا مژدہ سنایا ہے اور طبقاتی کش مکش کے حوالے سے اپنی بات کو پُر اثر انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ''درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا'' والی بات اِس حصّے میں بھی خوب صورتی سے بیان کی گئی ہے۔ ہر مسئلے کا بہر حال ایک حل ہوتا ہے اور جب کوئی بات یا مسئلہ حد سے سوا ہو جاتا ہے تو اُس کا حل بھی نکل آتا ہے۔ ہر رات کے بعد سویرا ایک فطری نظام کا حصّہ ہے۔ اِس لئے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ شاعر اِنہی جذبات کے زیرِ اثر کہتا ہے:

صبر اے دوست کہ اک ایسا بھی دن آئے گا خاص اک حد سے گزر جائے گا پستی کا شعور
سینۂ خاک سے پھر اُٹھے گا وہ شورِ نشور گنبدِ تیرۂ افلاک بھی تھرّائے گا

شاعر کو اسیرانِ بلا کی کاوشوں پر بھی بھروسہ ہے اور جامِ سفالیں پر بھی! آخری حصّے کے اشعار کے مطالعے سے شاعر کے عزم و یقین کا اندازہ ہوتا ہے۔ اُسے یہ کامل یقین ہے کہ ظلم و ستم و جور و جفا کا یہ سلسلہ تا دیر جاری نہیں رہ سکتا۔ اچھے دن ضرور آئیں گے اور حق داروں کو اُن کا حق مل کر رہے گا۔ نظم کے آخری بند میں شاعر کے ترقی پسندانہ اور حق پسندانہ جذبات و خیالات پوری شدّت کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔ اِن اشعار میں وہ ایک ایسے آدرش سماج کا تصوّر بھی پیش کرتا ہے جہاں سبھی انسانوں کو یکساں انسانی حقوق میسر آئیں گے اور برابر جینے کا حق ملے گا۔ جب فرسودہ نظام تبدیل ہوگا تو نیا نظام پیدا ہوگا اور جب ساز بدلے گا تو راگ کے ساتھ گانے والوں کے انداز بھی بدل جائیں گے۔

جذبی کی یہ نظم مجموعی اعتبار سے حقائق کے عرفان کا ایک خوب صورت نمونہ ہے جس میں شاعر نے احوالِ واقعی کی ترجمانی، اندیشہ ہائے دُور دراز کا اظہار، اپنی دردمندی وفکرمندی ظاہر کرتے ہوئے، اُمید، یقین، عمل اور جہدِ مسلسل کا پیغام پیش کیا ہے اور یہ بتانا چاہا ہے کہ یقینِ محکم اور عملِ پیہم کے ذریعے بڑے سے بڑے مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے اور اپنے وجود کو منوایا جاسکتا ہے۔ اِس اعتبار سے جذبی کی یہ نظم 'میری شاعری اور نقاد'، زندگی کی طرح ایک وسیع ترکینوس کی حامل ہے جس میں ملکی، قومی، بین الاقوامی، سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ذاتی حالات و واقعات و معاملات کو موضوع بنا کر نہایت سلیقے اور فن کاری کے ساتھ شاعر نے اپنے دل کی بات نقاد کے حوالے سے عوام تک پہنچانے کی سعی کی ہے۔ یہ نظم شاعر کے احتجاج کی آواز اور اپنے عہد کے حالات کی ترجمان بھی ہے۔ یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ یہ نظم جذبی ہی کی نہیں بلکہ اردو ادب کی بھی نمائندہ نظموں میں شامل کیے جانے کے لائق ہے۔ اِس نظم سے محض جذبی ہی کی شعری عظمت قائم نہیں ہوتی بلکہ اردو کی نمائندہ نظموں میں ایک اور اچھی نظم کا اضافہ ہوتا ہے۔ بقولِ شہاب جعفری:

> ''میری شاعری اور نقاد'' جو اُن کے تجرباتِ زندگی اور تجرباتِ فن کا نچوڑ ہے اس کی بہت اچھی مثال ہے۔ اِس میں اُنھوں نے ''ناآزمودہ کاروں'' کی رجائیت پسندی کا موازنہ اپنے سے خوب کیا ہے۔ یہ نظم جذبی کی شاعری کا مقدمہ ہے۔''

جذبی کی یہ شاہ کار نظم ہے جس میں زبان و بیان اور ہر اعتبار سے شاعر نے اپنی بہترین تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔

07.07 خلاصہ

معین احسن جذبی کا شمار اردو کے نمائندہ اور اہم ترقی پسند شعرا میں ہوتا ہے۔ جذبی نے غزل اور نظم میں اپنی انفرادیت قائم کی ہے۔ نثر خصوصاً تحقیق میں بھی اُن کے تحقیقی مقالے ''حالی کا سیاسی شعور'' کو ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا۔ وہ بنیادی طور پر شاعر تھے۔ اگرچہ ترقی پسند تھے لیکن صالح کلاسیکی روایات کو اُنھوں نے ترک نہیں کیا اور ترقی پسندی میں شدّت پسندی اور نعرے بازی کو قبول نہیں کیا۔ حق پسندی، معقولیت، اعتدال اور سوز والم کی کیفیت اُن کے کلام میں نمایاں نظر آتی ہے جس کے سبب وہ معاصرین میں ایک اہم منفرد وممتاز مقام حاصل کر لیتے ہیں۔

جذبی کم گو شاعر تھے۔ اُنھوں نے طویل عمر پائی۔ اس لحاظ سے اُن کے مجموعوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے لیکن معیار کے اعتبار سے اُن کا شمار اردو کے اہم شعرا میں کیا جاتا ہے۔ معین احسن جذبی نے یوں تو مختلف اہم موضوعات پر کئی نظمیں لکھیں ہیں لیکن اُن کی سب سے زیادہ مقبول اور منفرد نظم ''میری شاعری اور نقاد'' ہے۔ یہ نظم سات مختلف حصوں میں تقسیم کی گئی ہے جس میں شاعر نے ملکی، وطنی، قومی، بین الاقوامی، سیاسی و سماجی، تہذیبی اور ادبی صورتِ حال کو ایک خاص انداز سے پیش کر کے ایک تخلیقی فن کار کے تخلیقی عمل کو بیان کرنے اور اُس کے درد و کرب کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔

اِس نظم کا اصل مخاطب وہ نقاد ہے جو کہ حالات کی سنگینی اور مسائل کی سنجیدگی پر غور و فکر کیے بغیر تخلیقی فن کار کے فن پر اظہارِ رائے کر کے اعتراضات کرتا ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ وقت، سماج، ادب اور ادیب کے تقاضے کیا ہیں؟ کسی فن کار کے فن کا خمیر کس طرح تیار ہوتا ہے؟ اِن باتوں کا احساس کرانے کی خاطر شاعر نے نقاد کو مخاطب کر کے اپنے عہد کے انسانوں، ملک اور دنیا کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے اپنی ذمے داری، فرض شناسی اور انسانی دوستی کو ظاہر کیا ہے۔

07.08 فرہنگ

آتشِ رفتہ	:	بھڑکتی ہوئی آگ، تیز تر آگ
آلام	:	الم کی جمع، مصیبتیں
آمد	:	غیر شعوری کوشش، فطری انداز
آورد	:	شعوری کوشش، مصنوعی انداز
اجسام	:	جسم کی جمع
احتجاج	:	ردِ عمل، غصّہ، ناراضی
احوالِ واقعی	:	سچّے حالات
اسیر	:	قیدی
اصرار	:	تقاضا
افتادِ طبع	:	طبعیت کا میلان، مزاج
اِفلاس	:	غریبی
انفاس	:	نفس کی جمع، سانسیں
بدظن	:	بددل، خفا
بے حس	:	بغیر احساس والا
پرکیف	:	پرلطف
پستی	:	گراوٹ، نیچے کی طرف
پیکر	:	جسم، شکل
تاریک	:	اندھیری
تقدس	:	پاکیزگی
تقلید	:	نقل، پیروی
تُند	:	تیز، کڑوی
تیرہ وتار	:	تاریک، اندھیری، سیاہ
جامِ سفالیں	:	مٹّی کا پیالا
حالتِ زار	:	بری حالت، خستہ حالت
حُزن	:	یاس، غم
شورِ نشور	:	قیامت کا شور
شہ پر	:	اُڑنے والے پرندے کا وہ خاص پر جس کی مدد سے وہ اُڑان بھرتا ہے
کم سنی	:	بچپن، کم عمری
صہبا	:	شراب
عرفان	:	علم، احساس
عذرِ لنگ	:	بہانہ بنانا
عکاس	:	ترجمان
عمیق	:	گہرا
غُلو	:	مبالغہ
فُقدان	:	کمی
کارگہِ دہر	:	دنیا کا کاروبار یعنی دنیا
کرب	:	بے چینی، اضطراب
کینوس	:	دائرہ
گلہ	:	شکایت
گنبدِ تیرۂ افلاک	:	سیاہ آسمان
گوشہ نشین	:	کونے میں رہنے والا، تنہائی پسند
متوازن	:	توازن والا
مثبت	:	تعمیری
مرگ	:	موت
مژہ	:	پلک
مُضر	:	نقصان دہ
مطرب	:	گانے والا
معاصرین	:	ساتھی، ہم عصر، معاصر کی جمع
معتبر	:	اعتبار والا

حزیں	:	غم	معتدل	:	اعتدال والا
حکمت	:	فلسفہ	معروف	:	جانا مانا، پہچان رکھنے والا
خرام	:	چال، رفتار	منافی	:	خلاف
درخشاں	:	روشن، پرنور	منسلک	:	جڑا ہوا، وابستہ
دریدہ	:	پھٹا ہوا	منصب	:	عہدہ، ذمے داری، مرتبہ
دشنام طرازی	:	الزام طرازی	منہمک	:	انہماک، مشغول، مصروف
زیریں لہر	:	اندرونی لہر	مئے جام	:	شراب کا پیالہ
ساغر	:	پیالا، جام	نارسائی	:	مجبوری
سبک دوش	:	ریٹائر	نقطۂ عروج	:	بلندی کی بلند سطح
سرد مہری	:	پرواہی، بے توجہی	نکات	:	نکتہ کی جمع
سرمستی	:	سرور، نشہ، لذت	وفور	:	جوش و خروش، اُبال

07.09 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبرا : جذؔبی کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

سوال نمبر۲ : جذؔبی نے شاعری کا آغاز کب کیا؟

سوال نمبر۳ : جذؔبی نے پہلا تخلص کیا اختیار کیا تھا؟

تفصیلی سوالات

سوال نمبرا : جذؔبی کی نظم ’میری شاعری اور نقاد‘ کا تجزیہ کیجیے؟

سوال نمبر۲ : معین احسن جذؔبی کے سوانحی حالات پر روشنی ڈالیے؟

سوال نمبر۳ : معین احسن جذؔبی کی مجموعی ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے؟

معروضی سوالات

سوال نمبرا: معین احسن جذؔبی کا آبائی وطن کون سا ہے؟

(الف) رام پور (ب) بلرام پور (ج) مبارک پور (د) سلطان پور

سوال نمبر۲: جذؔبی نے بی۔اے کی سند کس کالج سے حاصل کی تھی؟

(الف) اینگلو عربک کالج، دہلی (ب) علی گڑھ کالج (ج) سینٹ جانس کالج، آگرہ (د) لکھنؤ یونی ورسٹی

سوال نمبر۳: جذبی نے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری کب حاصل کی؟

(الف) ۱۹۶۶ء (ب) ۱۹۶۵ء (ج) ۱۹۶۹ء (د) ۱۹۶۲ء

سوال نمبر۴: جذبی بنیادی طور پر کیا تھے؟

(الف) ڈرامانگار (ب) ناول نگار (ج) نثرنگار (د) شاعر

سوال نمبر۵: جذبی کا انتقال کتنی عمر میں ہوا؟

(الف) ۹۰سال (ب) ۹۲سال (ج) ۸۰سال (د) ۷۵سال

سوال نمبر۶: جذبی کا کلام عبارت ہے ؟

(الف) رنگینی ورعنائی سے (ب) سرور و کیف سے (ج) سوز والم وغم سے (د) خوشی وانبساط سے

سوال نمبر۷: جذبی کس ادبی تحریک سے متاثر تھے؟

(الف) رومانی تحریک (ب) ترقی پسند ادبی تحریک (ج) سرسیّد تحریک (د) وہابی تحریک

سوال نمبر۸: جذبی نے شعر گوئی کا آغاز کس صنف سے کیا؟

(الف) غزل گوئی (ب) مرثیہ گوئی (ج) رباعی (د) مثنوی

سوال نمبر۹: جذبی کی نظم ''میری شاعری اور نقاد'' کو کتنے حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے؟

(الف) دس (ب) نو (ج) سات (د) آٹھ

سوال نمبر۱۰: آفاقی حیثیت کی حامل جذبی کی کس نظم کو کہا جاسکتا ہے؟

(الف) ہلالِ عید (ب) میری شاعری اور نقّاد (ج) مجاز (د) طوائف

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱	: (ج) مبارک پور	جواب نمبر۶	: (ج) سوز والم وغم سے
جواب نمبر۲	: (الف) اینگلو عربک کالج، دہلی	جواب نمبر۷	: (ب) ترقی پسند ادبی تحریک
جواب نمبر۳	: (ب) ۱۹۶۵ء	جواب نمبر۸	: (الف) غزل گوئی
جواب نمبر۴	: (د) شاعر	جواب نمبر۹	: (ج) سات
جواب نمبر۵	: (ب) ۹۲/سال	جواب نمبر۱۰	: (ب) میری شاعری اور نقّاد

07.10 حوالہ جاتی کتب

۱۔ گدازِ شب از جذبی

۲۔ فروزاں از جذبی

۳۔ سخنِ مختصر از جذبی

۴۔ حالؔی کا سیاسی شعور از جذبؔی
۵۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک از خلیل الرّحمٰن اعظمی
۶۔ علی گڑھ میگزین جذبی نمبر
۷۔ ماہ نامہ نقوس، لاہور شخصیات نمبر

اکائی 08 : علی سردار جعفریؔ ''نئی دنیا کو سلام''

ساخت :

08.01 : اغراض ومقاصد

08.02 : تمہید

08.03 : علی سردار جعفریؔ کے حالاتِ زندگی

08.04 : علی سردار جعفریؔ کی نظم نگاری

08.05 : نظم ''نئی دنیا کو سلام'' متن

08.06 : نظم ''نئی دنیا کو سلام'' تجزیہ

08.07 : خلاصہ

08.08 : فرہنگ

08.09 : سوالات

08.10 : حوالہ جاتی کتب

08.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعے سے آپ علی سردار جعفری کی شخصیت، حالاتِ زندگی اور اُن کی شاعری سے روشناس ہوں گے۔اردو ادب میں اُن کی نظم نگاری کی قدر و قیمت اور اُن کے بیش قیمت افکار و خیالات سے آگہی حاصل کریں گے اور اُن کی ایک اہم نظم ''نئی دنیا کو سلام'' کا مطالعہ کریں گے اور اس کے ساتھ ہی تشریح و تجزیہ کرنے کا ہنر سیکھیں گے۔اکائی کے آخر میں اکائی کا خلاصہ،فرہنگ،سوالات اور حوالہ جاتی کتب کی فہرست پڑھیں گے۔

08.02 تمہید

بیسویں صدی کی عظیم ادبی شخصیات میں علی سردار جعفری کا بھی نام آتا ہے۔علی سردار جعفری کا تعلق ترقی پسند تحریک سے تھا۔علی سردار جعفری نہ صرف ایک عظیم شاعر اور نظم نگار تھے بلکہ ایک عظیم مفکّر ،بہترین نقاد،ممتاز مقرر اور ٹی.وی پروڈیوسر بھی تھے۔وہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔اُنہوں نے افسانہ،ڈرامہ،صحافت،غزل،مرثیہ اور ہدایت کاری سب میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے اور اپنی برتری ثابت کی۔چوں کہ اس اکائی میں ہمیں علی سردار جعفری کی نظم نگاری کا مطالعہ کرنا ہے اس لئے ہم نے صرف اُن کی ایک نظم ''نئی دنیا کو سلام'' اور اس کے ضمن میں اُن کی نظم نگاری کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔

08.03 علی سردار جعفری کے حالاتِ زندگی

﴿۱﴾ بچپن: علی سردار جعفری ۲۹ نومبر ۱۹۱۳ء کو ضلع بلرام پور، اُتر پردیش کے ایک زمین دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والدِ محترم کا نام سید جعفر طیار اور ماں کا نام زاہدہ خاتون جعفری تھا۔ ان کا خاندان شیعہ مذہب کا پیروکار تھا۔ ان کا شجرۂ نسب ۳۷ واسطوں سے حضرت علی تک پہونچتا ہے۔ علی سردار جعفری کو ایک زمین دار گھرانے میں آنکھ کھولتے ہی وہ سب کچھ نصیب ہوا جو عام طور پر زمین دار گھرانوں میں ہوتا ہے مثلاً جاہ وجلال، شان وشوکت، کرّ وفر اور عیش وآرام وغیرہ وغیرہ۔ اس کے ساتھ ہی شیعہ خاندان کی وجہ سے علم وتہذیب اور ادب سے بھی وافر حصہ نصیب ہوا تھا۔

علی سردار جعفری خود اپنے خاندان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''خاندان میں بڑا اطمینان تھا۔ بلرام پور سے باہر کی دنیا ہمارے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ یہیں بچے پیدا ہوتے تھے، جوان ہوتے تھے۔ بلرام پور کے بعد علی گڑھ تعلیم حاصل کرتے تھے اور پھر شادی ہو جاتی تھی اور ریاست میں ملازمت مل جاتی تھی۔ دن ہنسی خوشی گزر جاتا تھا اور رات کو سب بھائی بہن بستروں پر لیٹ جاتے تھے۔ کوئی ایک بہن شرلک ہومز کی کہانیاں، راشد الخیری کے ناول یا عظیم بیگ چغتائی کی کوئی کتاب پڑھ کر سناتی۔ اس سے تھک جانے کے بعد جنّاتوں کے قصے شروع ہوتے جو انتہائی دل چسپ ہونے کے بعد بھی دل میں دہشت پیدا کر دیتے تھے۔''

(لکھنؤ کی پانچ راتیں)

﴿۲﴾ تعلیم: بچپن میں گھر پر ہی بہار کے ایک مولوی صاحب سے قرآن مجید کی تعلیم حاصل کی اور ساتھ ہی فارسی اور قصص الانبیا کا بھی درس لیا۔ سات یا آٹھ سال کی عمر میں سلطان المدارس، لکھنؤ میں داخلہ کرا دیا گیا لیکن علی سردار جعفری کی طبیعت مدرسے میں نہیں لگی اور وہاں سے راہِ فرار اختیار کی۔ بلرام پور میں ہی درجہ چھ تک ریاضی کے اسباق منشی بدری پرساد سے پڑھے جب کہ انگریزی کی تعلیم ماسٹر شبیر سے حاصل کی۔ اس کے بعد بلرام پور کے انگریزی اسکول ''لائل کالجیٹ اسکول'' میں داخلہ لے لیا۔

۱۹۳۳ء میں تقریباً بیس سال کی عمر میں ہائی اسکول مکمل کر لیا اور پھر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا۔ البتہ ہڑتال میں حصہ لینے اور ۱۹۳۶ء میں انگریزوں کے خلاف سیاسی سرگرمیوں کے جرم میں یونی ورسٹی سے خارجہ کر دیا گیا۔ علی سردار جعفری نے اینگلو عربک کالج (دہلی یونی ورسٹی) سے بی.اے کیا پھر والد کی خواہش پر لکھنؤ یونی ورسٹی میں ایل.ایل.بی میں داخلہ لیا لیکن درمیان میں ہی چھوڑ دیا۔ پھر ایم.اے انگریزی میں داخلہ لیا مگر پہلے ہی سال شاعری میں مخالفِ جنگ پروپیگنڈہ کرنے پر امتحان سے ممنوع قرار دیے گئے اور اُنہیں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔

علی سردار جعفری کے اساتذہ میں پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر محمد اشرف، خواجہ منظور حسین، پروفیسر محمد حبیب اور پروفیسر سدھانت وغیرہ جیسی علمی اور ادبی شخصیات ہیں۔ علی سردار جعفری نے اپنی زندگی میں جن مشاہیرِ ادب سے ملاقاتیں کیں اُن میں رابندر ناتھ ٹیگور، سروجنی نائیڈو، جواہر لال نہرو، پبلو نرودا، جولو کیوری، ایلیا، اہرن برگ، پال رابسن، لوئی آراگاں، فدئیف، ترسون زادہ، یوری گگارین، ناظم حکمت،

شیخ محمد عبداللہ، اوما شنکر جوشی، اندرا گاندھی، پنڈت روی شنکر، استاد اللہ رکھا، پنڈت اُوم کارناتھ ٹھاکر، ایم۔اے حسین، جیمنی رائے، ستیہ جیت رے، یوسف خان عرف دلیپ کمار، پرتھوی راج کپور، نرگس، شالوخوف اور پاسترناک قابلِ ذکر ہیں۔

ڈاکٹر ملک راج آنند، پنڈت سمترا نندن پنت، ڈاکٹر رشید جہاں، مجاز رُدَولوی، سبطِ حسن، معین احسن جذبی، جاں نثار اختر، سجاد ظہیر، عصمت چغتائی، فیض احمد فیضؔ، احمد ندیم قاسمی، خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، وامق جون پوری، حیات اللہ انصاری، علی جواد زیدی، مخدوم محی الدین، کیفی اعظمی، مجروحؔ سلطان پوری، سعادت حسن منٹو، ساحر لدھیانوی، ن۔م۔راشد، اختر الایمان، سکندر علی وجد، زہرہ نگاہ، ماجد علی، احمد فراز، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، ڈاکٹر محمد حسن اور قمر رئیس وغیرہ سے اُن کے دوستانہ مراسم اور تعلّقات رہے۔

علی سردار جعفری نے اپنی زندگی میں قید و بند کی مصیبتیں بھی برداشت کیں۔ ۴ر دسمبر ۱۹۴۰ء کو لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل اور بنارس سینٹرل جیل میں ۸ر مہینے تک جیل کی صعوبتیں برداشت کیں۔ ۲۰ر جنوری ۱۹۴۹ء کو بمبئی آرتھر روڈ جیل میں قید کیا گیا۔ ۱۹ر اپریل ۱۹۴۹ء کو آرتھر روڈ جیل اور سینٹرل جیل ناسک میں تقریباً پندرہ مہینے کی قید ہوئی۔

علی سردار جعفری نے شاعری کی ابتدا کب کی؟ یہ بتا پانا تو مشکل ہے مگر انہوں نے کم عمری ہی میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اسی تعلق سے ستارہ جعفری لکھتی ہیں:

> ''شاید لوگوں کو یقین نہ آئے لیکن ہمارے بزرگ بتاتے تھے کہ اُنھوں نے شاعری کی ابتدا دو سال کی عمر سے ہی کر دی تھی۔ سردار بھائی کی پیدائش کے دو سال بعد ایک اور بہن پیدا ہوئی تھی۔ اس کے پیدا ہونے کے بعد بھائی سے ماں کی گود چھوٹ گئی تھی۔ سردار بھائی کو اپنی ماں سے علیحدگی بڑی ناگوار گزری۔ ہر وقت کہتے رہتے تھے۔
>
> بھائی کو اِسی مُنّی نے گودی سے نکالا : اُوپر سے گری ٹھیکری، بادام چھوہارا

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی لکھتی ہیں کہ اس بیان کی روشنی میں اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہر شاعر کو شعر گوئی کا ملکہ قدرت کے گھر سے ملتا ہے اور شاعری ایک خداداد صلاحیت ہوتی ہے۔ علی سردار جعفری نے پندرہ سال کی عمر میں ۱۹۳۰ء میں پہلا مرثیہ لکھا جس کا پہلا بند یہ ہے:

آتا ہے کون شمعِ امامت لیے ہوئے اپنی جلو میں فوجِ صداقت لیے ہوئے
ہاتھوں میں جامِ سرخ شہادت لیے ہوئے لب پر دُعائے بخششِ اُمت لیے ہوئے
اللہ رے حُسن، فاطمہ کے ماہ تاب کا

علی سردار جعفری کی پہلی نظم کا بند کچھ یوں تھا:

نکال دوں تمہیں اِس طرح دل کے گوشے سے
کہ جیسے کھلتا ہوا پھول توڑ لے کوئی
مری حسین ثریا! یہ ہو نہیں سکتا

جب کہ ان کی غزل کا پہلا شعر تھا:

دامن جھٹک کے منزلِ غم سے گزر گیا اُٹھ اُٹھ کے دیکھتی رہی گردِ سفر مجھے

علی سردار جعفری نے اپنا پہلا مشاعرہ اٹاوہ میں ۱۹۳۶ء میں پڑھا۔ آل انڈیا لکھنؤ کے مشاعرے ۱۹۴۱ء میں اپنی آزاد نظم سنائی۔ اس مشاعرے کی صدارت شبیر حسن خاں جوشؔ ملیح آبادی نے کی۔ ان کی پہلی نثری تصنیف افسانوں کا مجموعہ ''منزل'' ہے جو ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ علی سردار جعفری نے غزل، نظم، مرثیہ، افسانہ، ڈراما، خاکہ اور تنقید وغیرہ ہر میدان میں اپنی فکری جولانیاں دِکھائی ہیں۔ تدوین، ترتیب اور ترجمہ نگاری میں بھی اُن کے نمایاں کارنامے ہیں۔

کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری، کیفی اعظمی، عشرت آفریں اور عرفانہ عزیز جیسی ادبی شخصیات کی تخلیقات پر دیباچے لکھے۔ زہرا نگاہ، افتخار عارف، رفیعہ شبنم عابدی کی تخلیقات پر تقاریظ رقم کیں۔ پابلو نرودا، ایلس ایرن برگ، جگرؔ مراد آبادی، جوشؔ ملیح آبادی، ویرا بکووا، کیفی اعظمی اور سجاد ظہیر وغیرہ پر خاکے لکھے۔ تین مختصر ڈرامے ۱۹۴۲ء، یہ خون کس کا ہے ۱۹۴۳ء اور پیکار ۱۹۴۴ء ان کے ڈراموں کے مجموعے ہیں۔ ترقی پسند ادب ۱۹۵۳ء، اقبال شناسی ۱۹۶۹ء اور پیغمبرانِ سخن ۱۹۷۰ء ان کے تنقیدی خیالات کے مجموعے ہیں۔ علی سردار جعفری کے خطبات کی تعداد بھی بہت ہے جو انہوں نے مختلف اکیڈمی، سوسائٹی اور یونی ورسٹیز میں دِیے۔ علی سردار جعفری کو ان کی ادبی تخلیقات پر بہت سارے انعامات واعزازات سے نوازا گیا۔

جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

﴿۱﴾ ۱۹۶۵ء میں اُن کے شعری مجموعے 'ایک خواب اور' کے لئے ''سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔

﴿۲﴾ ۱۹۶۷ء میں ''پدم شری'' سے نوازا گیا۔

﴿۳﴾ ۱۹۷۴ء میں شاعری کے لئے ''سجاد ظہیر ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔

﴿۴﴾ ۱۹۷۷ء اقبال شناسی کے لئے اُنہیں ''اتر پردیش اکیڈمی ایوارڈ'' عطا کیا گیا۔

﴿۵﴾ ۱۹۷۸ء میں پاکستان کی جانب سے ''اقبالؔ میڈل'' دیا گیا۔

﴿۶﴾ ۱۹۷۹ء میں ''لہو پکارتا ہے'' کے لئے ''اتر پردیش اکیڈمی ایوارڈ'' حاصل ہوا۔

﴿۷﴾ ۱۹۸۰ء میں حیدر آباد اکیڈمی کی جانب سے ''مخدومؔ ایوارڈ'' شاعری کے لئے دیا گیا۔

﴿۸﴾ ۱۹۸۲ء میں بھوپال اردو اکیڈمی کی جانب سے ''میر تقی میرؔ ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔

﴿۹﴾ ۱۹۸۳ء میں نظم ''ایشیا جاگ اُٹھا'' کے لئے کمار آسن ایوارڈ (ملیالم) موصول ہوا۔

﴿۱۰﴾ ۱۹۸۴ء میں ''ہند روس دوستی میڈل'' دیا گیا۔

﴿۱۱﴾ ۱۹۸۷ء میں عالمی اردو کانفرنس، نئی دہلی کی طرف سے ''فیض احمد فیضؔ ایوارڈ'' شاعری کے لئے دیا گیا۔

ان سب کے علاوہ سمبل پور یونی ورسٹی کی جانب سے ''گنگا دھر مہر ایوارڈ'' سمبل پور ۱۹۹۲ء میں، اتر پردیش اکیڈمی کی جانب سے ''مولانا آزاد ایوارڈ''، لکھنؤ ۱۹۹۴ء میں، میرا کادمی لکھنؤ کی جانب سے ۱۹۹۲ء میں ''میر ایوارڈ لکھنؤ''، ۱۹۹۵ء میں مہاراشٹر اکیڈمی کی جانب

سے ''ظ.انصاری ایوارڈ''،ممبئی،۱۹۹۷ء میں بہار گورنمنٹ کی جانب سے'' مولانا مظہرالحق ایوارڈ'' اور ۱۹۹۹ء میں ''ہارورڈ یونی ورسٹی ایوارڈ'' جیسے عظیم انعامات واعزازات سے نوازا گیا۔علی سردار جعفری کو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نے ''ڈی۔لٹ'' کی اعزازی سند عطا کی۔

۱۹۷۱ء سے ۱۹۹۰ء تک کل ہند انجمن ترقی مصنفین کے صدر رہے۔مختلف اکیڈمیوں کے صدر و نائب صدر رہے۔جموں اور علی گڑھ یونیورسٹی کے وزیٹنگ پروفیسر بھی رہے۔علی سردار جعفری آل انڈیا ریڈیو سے بحیثیت شاعر، مقرر، فیچر نگار اور بحیثیت رکن بورڈ آف ڈائریکٹرز برائے بزمِ اردو منسلک رہے۔رفعت سروش لکھتے ہیں:

> ''براڈ کاسٹنگ کے لئے ضروری ہے کہ آواز دل کش ہو،تلفّظ درست ہو، زبان سلیس ہو اور سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ اسکرپٹ وقت پر مل جائے۔سردار میں یہ سب خوبیاں موجود تھیں اس لئے وہ آئے دن پروگرام نشر کرتے تھے۔ایک بار تو میں نے ان کی بارہ تقریریں دو دن میں نشر کیں۔تین تقریریں کالی داس پر، تین تقریریں غالبؔ پر، تین اقبالؔ پر اور تین نیا ادب پر، اس سے سردار کی زود نویسی اور تبحرِ علمی کا پتہ چلتا ہے۔''

(کتاب نما، سردار جعفری، خصوصی شمارہ، از رفیعہ شبنم عابدی)

علی سردار جعفری نے ''نیا ادب، قومی جنگ، گفتگو، کتاب نما اور نیشنل بک ٹرسٹ'' جیسے رسالوں کی ادارت کے فرائض بھی بخوبی انجام دیے۔یکم اگست ۲۰۰۰ء کو ممبئی میں علم وادب کا یہ نیّرِ تاباں غروب ہو گیا اور اپنے پیچھے علم وادب کا ایک بہت بڑا ذخیرہ بطور وراثت چھوڑ گیا۔جس سے نوعِ انسانی قیامت تک فیض یاب ہوتی رہے گی۔علی سردار جعفری کی دو بار نمازِ جنازہ پڑھی گئی۔پہلی نمازِ جنازہ شیعہ قبرستان رحمت آباد میں اور دوسری نمازِ جنازہ سنی قبرستان جوہو میں ادا کی گئی۔آخر الذّکر قبرستان میں اُن کی تدفین عمل میں آئی۔علی سردار جعفری لکھتے ہیں:

> ''ہم ہمیشہ کہتے ہیں کہ موت کی حکمرانی ہے دنیا پر لیکن یہ واقعہ نہیں ہے کیوں کہ اگر موت کی حکمرانی ہوتی تو یہ دنیا قبرستان ہوتی۔آبادی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔اس لئے زندگی موت پر حاوی ہے۔''

08.04 علی سردار جعفریؔ کی نظم نگاری

علی سردار جعفری کی شاعری کی ابتدا مرثیے سے ہوئی تھی پھر غزل کہنے لگے۔انہوں نے کلاسیکی روایت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے غزل گوئی کی مگر جب وہ ترقّی پسندی اور مارکسیت کی طرف متوجہ ہوئے تو اُنہوں نے اپنی مذہبی وراثت (مرثیہ) اور غزل گوئی کو خیر آباد کہہ دیا اور پھر نظم کی طرف متوجہ ہو گئے۔عظمتِ انسانی اور اُس کے مسائل کو سمجھنے کے لئے مذہب کی قیود کو توڑتے ہوئے مارکسی فلسفے کا سہارا لیا اور عظمتِ انسانی کو سمجھتے ہوئے وہ یہاں تک پہنچے:

مِری افسردہ نظروں میں نہاں دنیا کی قیمت ہے مری چینِ جبیں پر نقش تاریخِ حقیقت ہے
حقیقت سے مری کیوں بے خبر دنیائے فانی ہے بغاوت میرا مسلک ہے، مرا مذہب جوانی ہے
بغاوت میرا مذہب ہے، بغاوت دیوتا میرا بغاوت میرا پیغمبر، بغاوت ہے خدا میرا

اور پھر علی سردار جعفری مارکسیت واشتراکیت کے علم بردار بن گئے لیکن اُن کا کہیں نہ کہیں رومانی رنگ برقرار رہا۔''لکھنو کی ایک شام، انتظار نہ کر، محبت کا افسوں اور حُسنِ تمام'' جیسی رومانی نظمیں لکھیں۔قدرت نے علی سردار جعفری کی فطرت میں نظم گوئی کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اور اظہارِ تکلّم کے مختلف طریقوں سے اُنہیں روشناس کیا تھا۔جب علی سردار جعفری نے مارکسیت واشتراکیت کا عقیدہ اختیار کرلیا اور لینن اور اسٹالن کو اپنا رہبر تسلیم کیا تو وہ ایک مارکسی ترجمان اور عظیم الشان انقلابی شاعر بن کر اُبھرے۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دوستوں کے لئے اُلفت کی زباں ہے لینن　　دشمنوں کے لئے شمشیر و سناں ہے لینن
رگِ مزدور میں خوں بن کے رواں ہے لینن　　دل پہ سرمائے کے اک سنگِ گراں ہے لینن
جس کی ہر بات ہے تفسیرِ حیاتِ ابدی　　جس کو ہر شخص نے سمجھا، وہ زباں ہے لینن

انہوں نے انقلابی ترانے کچھ یوں گائے:

رُخِ حیات کو بخشیں تجلیاں تُو نے　　بکھیر دی ہیں فضاؤں میں سرخیاں تُو نے
شگاف ڈال دیا تاجِ شہر یاری میں　　گرائیں ظلم کے خرمن پہ بجلیاں تُو نے

کوثر مظہری لکھتے ہیں:

''سردار جعفری کی شاعری میں کمیونزم کا صرف پرچار نہیں بلکہ وہ حقائق کو بھی سامنے لاتے ہیں۔ انہوں نے دیکھا ہے کہ کسان اِس دھرتی سے سنہری بالیاں اُگاتے ہیں مگر اُنہی کے بچے بھوک سے بلک بلک کر سو جاتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ سردار جعفری پر اِس استحصال کا گہرا اثر پڑا اور ایک طرح سے حکومت اور امیر طبقے کے تئیں اُن کے اندر نفرت کے شعلے بھڑک اُٹھے۔''

اُن کی نظم ''جمہور'' میں یہ احساس بہت تیز ہے مگر خود کو جذبات سے مغلوب ہونے سے بچالیا ہے۔تہذیبی وثقافتی انسلاکات کی دبیز پرت ہٹانے کی کوشش کی گئی ہے:

یہ ہندوستاں، رشکِ خلد بریں　　اُگلتی ہے سونا وطن کی زمیں
کہیں کوئلے اور لوہے کی کان　　کہیں سرخ پتھر کی اُونچی چٹان
یہ گنگا کا آنچل، یہ جمنا کا ریت　　یہ دھان اور گیہوں کے شاداب کھیت
ہمارے مقدّر میں افلاس ہے　　غلامی کی ہر جسم میں باس ہے
کہیں ماؤں بہنوں کا ہے مول تول　　کہیں بے حیائی کے بجتے ہیں ڈھول

علی سردار جعفری نے اپنی شاعری میں جس انسان کی پیکر تراشی کی ہے اور اُن کے یہاں جس انسان کا تخیل ہے وہ صالح روایات کا اَمین ہے۔اخوّت، انسانیت اور محبت وہم دَردی کا مجسّمہ ہے۔وہ جس انسان کی بات کرتے ہیں وہ تقدیر کے برخلاف محنت، مشقت، عملِ پیہم اور جہدِ مسلسل پر یقین رکھتا ہے۔اُن کا جو نظریہ ہے وہ اِس پیراگراف سے ظاہر ہوتا ہے:

''دنیا کی تاریخ میں کوئی دَور ایسا نہیں آیا جس میں انسان کی شکست ہوئی ہو۔ افراد اور طبقات کو شکست ہوتی رہی ہے اور ہوگی لیکن انسان ناقابلِ شکست ہے کیوں کہ اُس کی محنت عمل اور جدّ و جہد اُس کے اپنے شعور ہی کی نہیں بلکہ بڑی حد تک اُس ماحول کی بھی خالق ہے .... یہ عقیدہ جواندھا عقیدہ نہیں ہے، میرا سب سے بڑا اِنسپریشن ہے۔ میں اِس کو ادب اور فن کا ابدی موضوع سمجھتا ہوں۔ سب سے زیادہ شان دار سب سے زیادہ عظیم المرتبت، سب سے زیادہ حسین انسان ہے۔''

علی سردار جعفری انسان دوستی اور اُس کی بقا کی بات کرتے ہیں۔ اُن کے اِس فلسفے میں مارکسزم کے ساتھ ساتھ تصوّف کا بھی رنگ نظر آتا ہے۔ وہ انسان دوستی، حق پرستی اور اتحاد کا پرچم اُٹھائے نظر آتے ہیں مثلاً یہ لہو کا بند اُس کی مثال ہے:

یہ لہو کافر نہیں ، مرتد نہیں ، مسلم نہیں
کلمۂ حق کا اُجالا، یہ تجلّی ، یہ ظہور
یہ لہو میرا لہو ، تیرا لہو ، سب کا لہو

مزید کہتے ہیں:

یہ دنیا گمراہ ہے اب تک پھر بولو اے سنت کبیر! ایک ہی سونے کے سب گہنے، ایک ہی مٹی کے برتن
ایک ہی نور ہے سب شمعوں میں، ایک ہی رَس سب میووں میں
اپنے مُنہ کو میٹھا کرلو! کرلو آنکھوں کو روشن

دوسرے شعرا کی طرح علی سردار جعفری نے بھی عورت کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ اُن کے یہاں جس عورت کا تصوّر رہے اُس میں زندگی کی رَمق ہے، جینے کی اُمنگ ہے اور اُس کے سینے میں انقلاب کا اُبلتا ہوا لاوا ہے لیکن اِس کے ساتھ ساتھ کوثر مظہری کے الفاظ میں: ''اُس کے اندر خود ضبطی، خودشناسی اور خود حفاظتی کا مادہ بھی موجود ہے''۔ ''نئی دنیا کو سلام'' میں جس عورت کا تصوّر پیش کیا گیا ہے وہ عورت اِنہی خصوصیات کا مجموعہ ہے۔ اِس نظم میں وہ عورت انگریزوں سے یوں مخاطب ہوتی ہے:

جب سے تم آئے ہو! گھر کی سب برکتیں اُٹھ گئیں ہے
تم نے ہندوستاں کی لہکتی ہوئی کھیتیوں سے
اُن کی زرخیزیاں چھین لی ہیں
تم نے اِس ملک کے سبزہ زاروں کی شادابیاں چھین لی ہیں
تم نے پھولوں کو کھلنے، ہواؤں کو چلنے سے روکا
تم نے چشموں کو بہنے سے، فوّاروں کو رقص کرنے سے روکا
اور دریاؤں میں زہر گھولا

(نئی دنیا کو سلام)

علی سردار جعفری نے ماں کا روپ بھی پیش کیا ہے۔ اُس کا تقدّس اُن کے یہاں خدا اور پیغمبر سے بھی بڑھ کر ہے۔ کہتے ہیں:

مری ماں
اپنے آنچل میں چھپا لیتی تھی
ننھے سے کھلونے کو، مری حیرت کی آنکھیں
اُس محبت سے بھرے چہرے کو تکتی تھیں
جس آئینے میں پہلی بار میں نے
اپنا چہرا آپ دیکھا تھا
وہ چہرہ کیا تھا؟ سورج تھا؟ خدا یا پیمبر تھا؟
وہ چہرہ جس سے بڑھ کر خوب صورت کوئی چہرہ ہو نہیں سکتا
کہ وہ اک ماں کا چہرا تھا
جو اپنے دل کے خوابوں، پیار کی کرنوں سے روشن تھا

(نومبر میرا گہوارہ)

علی سردار جعفری مشترکہ تہذیب و ثقافت کی بات کرتے ہیں۔ اس مشترکہ تہذیب میں حضرت محمدﷺ اور مسیح بھی ہیں، گوتم بھی ہیں، قرآن و انجیل بھی ہیں، وید بھی ہیں، یہاں موہن جوداڑو کا ذکر ہوتا ہے اور چین و اہرامِ مصر کی بات بھی ہوتی ہے۔ اس تہذیب میں کسان اور اس کے کھیت اور باغات بھی ہیں۔ اُن کی نظم ''ایشیا جاگ اُٹھا'' جو انھوں نے ۱۹۵۰ء میں سینٹرل جیل ناسک میں لکھی تھی۔ اس نظم میں بڑی وسعت ہے اور یہ نظم مشترکہ تہذیبی و ثقافتی رنگ کی علامت و امین ہے:

یہ ایشیا کی زمیں، تمدّن کی کوکھ، تہذیب کا وطن ہے
یہیں پہ سورج نے آنکھ کھولی
اِسی بلندی سے وید نے زمزمے سنائے
یہیں سے گوتم نے آدمی کو سمانتا کا سبق پڑھایا
یہیں سے مزدک نے عدل، انصاف اور محبت کے راگ چھیڑے
ہماری تاریخ کی ہوائیں مسیح کے بول سن چکی ہیں
ہمارا سورج محمد مصطفیٰﷺ کے سر پر چمک چکا ہے
ہمارا وَرثہ موہن جوداڑو سے لے کے دیوارِ چین تک ہے

ہماری تاریخ تاج اور سیکری سے اہرامِ مصر تک ہے
ہمیں روایات کے خزانوں سے بابل و نینوا ملے ہیں
زبان کھولی تو وید، انجیل، اور قرآن بن کے بولے

علی سردار جعفری کو کھیتوں، باغوں، جانوروں، فصلوں، کسانوں اور موسموں سے بے حد لگاؤ ہے۔ مزدوروں اور کسانوں کا استحصال اور اُن کے بچوں کا ناخواندہ رہ جانا اُن کی نظر میں ایک المیہ ہے۔ کیا یہ ننھے غریب بچے دیش کا مستقبل سنوارنے میں معاون نہیں ہو سکتے؟ نظم کا وہ حصہ بھی خاص طور پر اہم ہے جس کے اندر ایشیا بالخصوص ہندوستان کی تہذیب و ثقافت کا عکس ہے:

غریب مزدور، جلتی آنکھیں، اُچاٹ نیندوں کی تلخ راتیں
تھکے ہوئے ہاتھ، بھاپ کا زور، گرم فولاد کی روانی
جہاز، ملاح، گیت، طوفاں، کمہار، لوہار، چاک، برتن،، گوالنیں دودھ میں نہائی
الاؤ کے گرد بوڑھے افسانہ گو، کہانی
جوان ماؤں کی گود میں ننھے ننھے بچوں کے بھولے چہرے
لہکتے میدان، گائیں، بھینسیں، فضاؤں میں بانسری کا لہرا
ہری بھری کھیتیوں میں شیشے کی چوڑیاں کھنکھنا رہی ہیں
اُداس صحرا پیمبروں کی طرح سے خاموش اور گمبھیر
کھجور کے پیڑ بال کھولے
دَفوں کی آواز، ڈھلکیوں کی گُمک
سمندر کے قہقہے، ناریل کے پیڑوں کی سرد آہیں

(ایشیا جاگ اُٹھا)

اِسی کی ترجمانی کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیمان اظہر نے کہا ہے کہ جعفری کی شاعری رنگ و نسل، مذہب و قوم تمام تعصّب سے پاک ہے۔ اُن کی شاعری میں ہندوستان کی عظمت اور اُس کے تقدّس کے نغمے ہیں۔

۱۹۴۳ء میں اُن کا پہلا مجموعہ 'پرواز' کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔ اس مجموعے میں سماج، بغاوت، انگڑائی، مزدور لڑکیاں، اشترا کیت، نیا زمانہ، تاریخِ سحر، ارتقا و انقلاب اور جنگ و انقلاب جیسی نظمیں شامل ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ علی سردار جعفری کے خیال میں ابتدا ہی سے پختگی جڑ پکڑ چکی تھی۔ سارے عنوانات سے ہی انقلابیت کا ظہور ہوتا ہے۔ اُن کی جو نظمیں رومانی ہیں اُن میں انقلاب کا عنصر زیادہ ہے۔

۱۹۴۸ء میں اُن کی طویل تمثیلی نظم ''نئی دنیا کو سلام'' منظرِ عام پر آئی۔ یہ ایک انقلابی نظم ہے۔ آثر لکھنوی نے اس نظم کو 'اشترا کیت کا رزمیہ'' قرار دیا ہے۔ سردار جعفری نے اس نظم میں نظریۂ حیات اور نظریۂ آزادی کو پیش کیا ہے۔ جاوید اور مریم اس نظم کے دو اہم کردار ہیں۔ دونوں کے درمیان محبت ہے لیکن یہ محبت ہوس نہ ہو کر ایک پاکیزگی، تقدّس اور انقلاب کی علامت ہے۔

نظم کی ابتدا اِن مصرعوں سے ہوتی ہے:

سیہ دُوپٹوں کے آنچل سیہ جبینوں پر سیہ لباس سیہ جسم کو چھپائے ہوئے
سیاہ دودھ ہے ماں کے سیاہ سینے میں سیاہ بچوں کو آغوش میں سُلائے ہوئے
سیاہ جبر ، سیہ عصمتیں ، سیہ چیخیں سیاہ عدل ، سیہ کلغیاں لگائے ہوئے

۱۹۵۰ء میں ''امن کا ستارہ'' شائع ہوا پھر اُن کی نظم ''ایشیا جاگ اُٹھا'' شائع ہوئی۔ پھر اُن کے مجموعے ''پتھر کی دیوار، ایک خواب اور، پیراہنِ شرر اور لہو پکارتا ہے'' بالترتیب ۱۹۵۳ء، ۱۹۶۴ء، ۱۹۶۵ء اور ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئے۔ ''نومبر میرا گہوارہ'' اُن کی نامکمل خودنوشت ہے۔ ''پتھر کی دیوار'' جو جیل کی نظموں کا مجموعہ ہے، اس مجموعے میں اُن کی شاعری میں سنجیدگی اور گہرائی کے عناصر بڑھ جاتے ہیں جو بعد کے مجموعے میں بھی موجود ہیں۔ ان میں فلسفیانہ تفکّرات نظر آتے ہیں۔ ہر چیز نئے چولے میں نظر آتی ہے۔ حقیقت، سماجیت، محبت اور اشتراکیت وغیرہ سب میں نیا پن اور نئے نئے خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔ اس دَور میں سردار جعفری کی شاعری جدّت کے اعلیٰ معیار پر فائز ہوتی ہے۔

سردار جعفری نے غالبؔ و اقبالؔ سے بھرپور فیض اُٹھایا ہے۔ اُن کے اسلوب کی پیروی کی ہے۔ پُرشکوہ الفاظ اور تراکیب کا بھی استعمال کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنا اندازِ بیان سلیس اور صاف ستھرا رکھا ہے۔ وہ اپنی شاعری کو عوام کی شاعری کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں میں چاہتا ہوں کہ میری شاعری زیادہ سے زیادہ مزدور اور کسان پڑھیں اسی لئے بول چال کی زبان استعمال کرتا ہوں۔

سردار جعفری نے استعارات و تشبیہات اور کنایات کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ جہاں وہ پرانی تشبیہات و استعارات کو مخزن و ذخیرہ مانتے اور ان کو استعمال کرتے ہیں وہیں وہ نئے نئے استعارات و تشبیہات اور تراکیب کی ایجاد بھی کرتے ہیں۔ دراصل اُن کی شاعری انسان دوستی، مشترکہ تہذیب اور مزدور و مظلوم کی ہم دَردی سے عبارت ہے۔ وہ نظم کے شاعر ہیں اور بالخصوص آزاد نظم کے۔ اس ہیئت کے جتنے خوب صورت، دل کش، البیلے اور رواں نمونے سردار جعفری کے یہاں ملتے ہیں ویسے دوسروں کے یہاں بہت مشکل سے ہی ملتے ہیں۔

08.05 نظم ''نئی دنیا کو سلام'' متن

﴿حرفِ اوّل﴾

سیاہ رنگ پھریرے ہوا میں اُڑتے ہیں کھڑی ہوئی ہے سیہ رات سر اُٹھائے ہوئے
سیاہ زلفوں سے لپٹے ہوئے ہیں مارِ سیاہ سیاہ پھن ہیں، سیہ پھول مسکرائے ہوئے
سیاہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے ہل رہی ہے زمین سیہ عقاب، سیہ آسماں پہ چھائے ہوئے
سیاہ سینوں کو تانے ہوئے سیاہ پہاڑ سیاہ لوہے کی دیوار سی بنائے ہوئے
سیاہ وادی و صحرا، سیاہ دریا ہیں سیاہ دشت ، سیہ کھیت لہلہائے ہوئے
سیاہ فیکٹری کی سیاہ چمنی پر سیہ دھوئیں کے سیہ ابر تھرتھرائے ہوئے
سیہ چراغ ، سیہ روشنی ، سیاہ لویں سیاہ گھر میں سیہ جال سا بچھائے ہوئے
سیاہ کیڑوں کی مانند رینگتی مخلوق سیاہ بھوت اندھیرے میں بلبلائے ہوئے

سیہ دوپٹوں کے آنچل سیہ جبینوں پر سیہ لباس سیہ جسم کو چھپائے ہوئے
نشاں سیاہ لبوں پر سیاہ بوسوں کے سیہ نشاط کی بد مستیاں چُرائے ہوئے
سیاہ دودھ ہے ماں کے سیاہ سینے میں سیاہ بچوں کو آغوش میں سلائے ہوئے
سیہ فضا میں سیہ تیر سنسناتے ہیں سیاہ تیر سیہ زہر میں بجھائے ہوئے
سیاہ دار ، سیہ پھانسیاں ، سیہ پھندے سیاہ ہاتھ ، سیہ گردنیں دبائے ہوئے
سیہ نشان بدن پر سیاہ کوڑوں کے سیاہ زخم سیہ درد کو جگائے ہوئے
سیاہ جبر ، سیہ عصمتیں ، سیہ چیخیں سیاہ عدل ، سیہ کلغیاں لگائے ہوئے
سیاہ رنگ کے ساحر سیہ لبادوں میں سیہ حصار ، سیہ تیوریاں چڑھائے ہوئے
ضمیرِ عہدِ غلامی کی تیرگی ہے یہ رات جو پھر رہی ہے اُجالے سے منہ چھپائے ہوئے
کہاں ہے روشنیِ صبحِ انقلاب کہاں؟ ضمیرِ حضرتِ انساں کا آفتاب کہاں؟

﴿پہلی تصویر﴾

محبت نے کاڑھا ہے ظلمت سے نور☆نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور (میرؔ)

(اندھیرے سے دو شکلیں اُبھرتی ہیں۔ جاوید دُولھا بنا ہوا اور مریم دُلھن)

نہاں ابر میں چاند کب تک رہے گا بھلا عشق سے حُسن کب تک چھپے گا
تو شرمائی جاتی ہے میری نظر سے حجاب اور گل کو نسیمِ سحر سے؟
تو کیا میری فطرت کی محرم نہیں ہے؟ تو کیا میرے بچپن کی مریم نہیں ہے؟
گزاریں جو راتیں تری آرزو میں سمٹ آئی ہیں کاکلِ مشک بو میں
جو پلکیں حیا سے جھکی جارہی ہیں وہ کچھ اور دل میں چُبھی جارہی ہے
ترے رُخ پہ حُسن و محبت کا ہالہ یہی ہے مری زندگی کا اُجالا
یہ شفاف آنکھیں، یہ آنکھوں کے ڈورے چھلک جائیں جیسے گلابی کٹورے
جو ہاتھوں کو رنگِ حنا مِل گیا ہے ہتھیلی پہ گویا کنول کِھل گیا ہے
محبت کی راتوں کی قندیل تو ہے جوانوں کے خوابوں کی تکمیل تو ہے
تمناؤں کے باغ کی تازگی ہے خوشی کی چمکتی ہوئی تیتری ہے
ہے اک آنچ سی تیری نیچی نظر میں ترے حُسن سے روشنی میرے گھر میں
تکلّم سے نغموں کی دنیا جگا دے تبسّم سے پھولوں کو ہنسنا سکھا دے

مریم زیرِلب مسکراتی ہے

تری مسکراہٹ میں کیا دل کشی ہے   یہ پھولوں پہ سوئی ہوئی چاندنی ہے
مگر روح کی پیاس کیوں کر بُجھے گی؟   سمندر سے کیا صرف شبنم ملے گی؟
محبت ہے، نغمہ ہے، مَے ہے، سبُو ہے   مِرے واسطے جو بھی کچھ ہے وہ تو ہے
تِری خامشی کہہ رہی ہے فسانہ   تجاہل ہے تیرا بڑا عارفانہ
ہمارے دلوں کی ہے حسرت پرانی   ہماری شرابِ محبت پرانی
وہ گزری ہوئی شام ہے یاد اب تک   وہ ہے میرے سینے میں آباد اب تک
دن آہستہ آہستہ ڈھلنے لگا تھا   فضاؤں میں سونا پگھلنے لگا تھا
دھندلکے کی پرچھائیاں ناچتی تھیں   ہر اک سمت انگڑائیاں ناچتی تھیں
اُفق پر کرن خواب سا بُن رہی تھی   دوپٹے کو اپنے شفق چُن رہی تھی
تِری روح و دل پر تھے بادل سے چھائے   کھڑی تھی میرے پاس گردن جھکائے
مگر نکہتیں اپنی برسا رہی تھی   تِرے پیرہن سے مہک آرہی تھی
تِرے سر سے آنچل جو ڈھلکا ہوا تھا   مِرے خون میں ساز سا بج رہا تھا
اسی رات کی طرح پلکیں جھکی تھیں   دھڑکتا تھا دل اور نبضیں رُکی تھیں
کیا پیار سورج نے جھک کر زمیں کو   سجایا ستاروں سے شب نے جبیں کو
پھسل کر سیہ زلف شانوں پر آئی   ترے رُخ پر اک شمع سی جھلملائی
مجھے تو نے دیکھا نگاہیں اُٹھا کر   کہا پھر اشاروں میں کچھ مسکرا کر
سمجھ کر نگاہوں کا پیغام ہم نے   محبت کا پہلا پیا جام ہم نے
اسی جام نے ہم کو سر شار رکھّا   ہماری تمنّا کو بیدار رکھّا
جدائی میں بھی صبر کرنا سکھایا   ہمیں آگ پر سے گذرنا سکھایا
مرادوں کی مانگی ہوئی رات ہے یہ   کہ بچھڑے ہوؤں کی ملاقات ہے یہ

مریم، جاوید کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتی ہے اور پھر پلکیں جھکا لیتی ہے۔ اس کی آنکھوں سے دو چمکتے ہوئے آنسو ٹپک پڑتے ہیں اور چمپئی رُخساروں پر چاندی کی دو لکیریں سی کھنچ جاتی ہیں۔

مریم: مری ساری دولت محبت کے آنسو

جاوید: محبت کے آنسو، مسرّت کے آنسو

یہ آنسو ہیں ٹوٹے دلوں کے سہارے یہ تقدیرِ آدم کے روشن ستارے
تِری ساری ہستی تِری چشمِ نم میں مِرے گھر کی برکت ہے تیرے قدم میں
ہراک رنج و راحت کی ساتھی ہے عورت جہنم کو جنت بناتی ہے عورت
جبیں پر تجلّی کی انجم فشانی نظر میں زلیخا کی ہنستی جوانی
وہ مطلوب بھی ہے ، طلب گار بھی ہے وہ غم خوار بھی اور دِل دار بھی ہے
وہ ہے ساز بھی ، نغمہ بھی ، نغمہ گر بھی گلستاں بھی ، گل بھی ، نسیمِ سحر بھی

مریم:

مجھے بھی تو ہے یاد وہ رات اب تک ہیں مٹھی میں میری وہ لمحات اب تک
کلی کی طرح جو کِھلے جا رہے تھے جو گھُل کر لہو میں مِلے جا رہے تھے
تمنائیں لہراتی تھیں خواب بن کر برستے تھے جگنو اندھیرے سے چھن کر
حجاب اُٹھ گئے تھے زمان و مکاں کے دریچے تھے وا لذّتِ جاوداں کے
رگوں میں مری دوڑتے تھے شرارے مِرے گرد تھے رقص میں چاند تارے
وہ رات آئی تھی ایک طوفان بن کر سمندر کے سینے کا ہیجان بن کر
محبت کی کیف آفریں رات تھی وہ جوانی کی سب سے حسیں رات تھی وہ

جاوید:

وہ رات آج تک حُسن برسا رہی ہے وہ رات آج کی رات لہرا رہی ہے

﴿دوسری تصویر﴾

باغ کے آغوش میں گل چاہیے: زندگانی میں تسلسل چاہیے (جعفری)

جاوید کا گیت:

زمیں پہ رات کی پلکوں کی چھاؤں پڑتی ہے اندھیرا سخت خموشی کا بار اُٹھائے ہوئے
ہوا میں اُڑتے ہیں لمحات جگنوؤں کی طرح فضا کے سینے میں اک آگ سی لگائے ہوئے
سرک رہے ہیں اندھیرے کے مخملی پردے نکل رہا ہے کوئی جسم کو چرائے ہوئے
اُبھر رہا ہے کوئی وقت کے تلاطم سے جبیں پہ قوسِ قزح کی کماں جھکائے ہوئے
خمارِ نیم شبی کا ہے آنکھ میں کاجل ہتھیلیوں پہ حنا کے کنول جلائے ہوئے
مری جوان تمنا کے شوخ پھولوں سے سیاہ زلف کو گوندھے ہوئے، سجائے ہوئے
وہ دھندلے دھندلے ستاروں کے نرم جھرمٹ میں کنارے سرخ دوپٹے کے جگمگائے ہوئے

سڈول اور سبک بازوؤں کی لرزش میں — شباب و شعر کی انگڑائیاں دبائے ہوئے
کھڑی ہے خواب وفسانہ کی سرحدوں کے قریب — اندھیری رات کے دل میں چمن کھلائے ہوئے
وفاکے جوش سے چہرے پہ روشنی دل کی — حیا کے رنگ سے رُخسار تمتمائے ہوئے
بھوؤں پہ کتنی ہے انکار کی حسیں شکنیں — لبوں پہ کتنے ہی اقرار مسکرائے ہوئے

مریم: (بستر سے کہنیوں کے بل اُٹھتی ہے)

یہ مانا محبت کی منزل ہے عورت — تڑپتا، مچلتا ہوا دل ہے عورت
''پر اس کے زمان و مکاں اور بھی ہیں — 'ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں'
اُبھرتی ہوئی وقت کے ساحلوں سے — گزرتی ہے وہ کتنی ہی منزلوں سے
کبھی جام بن کر چھلکتی ہے عورت — کبھی اشک بن کر چمکتی ہے عورت
وہ بس چند لمحوں کی ہم دَم نہیں ہے — کہ عورت فقط شہد و شبنم نہیں ہے
تبسّم نہیں صرف ، تلوار بھی ہے — وہ نغمہ نہیں صرف ، جھنکار بھی ہے
محبت کی مسند پہ حُسن و جوانی — شجاعت کے میداں میں جھانسی کی رانی
وہ شمعِ شبستاں ہے، نورِ سحر ہے — وہ ہر گام پر مرد کی ہم سفر ہے
مگر سب سے بڑھ کر تو یہ ہے کہ ماں ہے — وہ تخلیق کے دل کا سوزِ نہاں ہے
صدف کی چمک میں ہے موجِ گہر بھی — کلی میں نہاں گُل بھی ہے اور ثمر بھی
نگاہوں میں شوخیِ دل بَرانہ — جبیں پر مگر عظمتِ مادرانہ
وہ عورت کی جسمانیت کی چمک ہے — یہ عورت کی روحانیت کی جھلک ہے
جوانی کو شاداب کرتی ہے عورت — محبت کو سیراب کرتی ہے عورت
ہے انسان کی کائنات اس کے دَم سے — فروزاں ہے شمعِ حیات اس کے دَم سے
جس آنچل کو بچے پہ وہ ڈالتی ہے — جس آغوش میں طفل کو پالتی ہے
اس آنچل میں ہے زندگی کا شرارہ — وہ آغوش تہذیب کا گاہ وَارہ
محبت کی راتوں کی شیرینیوں کو — جوانی کی پُر کیف رنگینیوں کو
نگاہوں کے رَس کو، لبوں کی شکر کو — مہکتے تبسّم کے گل ہائے تر کو
نیا رنگ اور روپ دیتی ہے عورت — نئی شکل میں ڈھال لیتی ہیں عورت

جاوید:

جو کونپل تھی کل اب ہے پھولوں کی ڈالی   تو ہے میرے بچے کی ماں بننے والی

مریم:

کوئی پہلوؤں میں پھڑکتا ہے جیسے   مِری سانس میں دل دھڑکتا ہے جیسے
رگ و پے میں کوئی سمایا ہوا ہے   مِری روح پر رنگ چھایا ہوا ہے
کوئی دل میں انگڑائیاں لے رہا ہے   مِرے خون میں کشتیاں کھے رہا ہے
بدن میں ستاروں کی ہے سنسناہٹ   رگوں میں ہے ہلکی سی اک گنگناہٹ
مرے ذہن میں چل رہی ہیں ہوائیں   اُمنڈتی ہوں جیسے سنہری گھٹائیں
بگڑتی ہیں ، بنتی ہیں ، شکلیں فضا میں   مہکتے ہیں لاکھوں شگوفے ہوا میں
یہ اک موجِ طوفاں ہے جو بڑھ رہی ہے   ندی دَم بہ دَم دَم بہ دَم چڑھ رہی ہے
نگاہوں پہ نشہ سا چھانے لگا ہے   ہراک چیز پر پیار آنے لگا ہے
زمیں ، آسماں ، چاند ، سورج ، ستارے   مجھے دُور سے کر رہے ہیں اشارے
بہاریں مِری رازداں ہوگئی ہیں   ہوائیں مِری ہم زباں ہوگئی ہیں
نسیمِ سحر گد گداتی ہے مجھ کو   کلی دیکھ کر مسکراتی ہے مجھ کو
اک ارمان آغوش میں پَل رہا ہے   تصور میرا گھٹنیوں چل رہا ہے
لہو ناچتا ہے، رگیں ٹوٹتی ہیں   مِرے جسم سے کونپلیں پھوٹتی ہیں

جاوید:

حیاتِ بشر ہے بڑی شاعرانہ   محبت ہے جس کی بقا کا بہانہ
وہ نغمہ جو بنتا ہے سرگوشیوں سے   جو ہوتا ہے پیدا ہم آغوشیوں سے
لرزتی ہے پلکیں ، سمٹتے ہیں ابرو   پھڑکتے ہیں پہلو ، مچلتے ہیں بازو
تڑپتے ہیں دل اور دھڑکتے ہیں سینے   جوانی نکلتی ہے لے کر سفینے
چمکتے ہیں ماتھے دَمکتے ہیں سہرے   مہکتے ہیں پھولوں کے شاداب سہرے
نکھرتا ہے صندل ، جھلکتی ہے افشاں   لچکتی ہیں شاخیں ، چٹکتی ہیں کلیاں
اُبھرتے ہیں جلوے ، بکھرتے ہیں جلوے   بکھرتے ہیں جلوے ، سنورتے ہیں جلوے
ڈھلکتے ہیں گیسو ، سرکتے ہیں آنچل   اُمنڈتے ہیں بادل ، برستے ہیں بادل

یوں ہی اُڑ رہا ہے نشاں زندگی کا ٹھٹکتا نہیں کارواں زندگی کا
تسلسل حقیقت ، تسلسل فسانہ تسلسل ہی ہے زندگی کا ترانہ
تسلسل ہے دریائے جاں کی روانی تسلسل سے انسان ہے جاودانی
کرن سے کرن اِس طرح پھوٹتی ہے کہ جس طرح سے پھلجھڑی چھوٹتی ہے

08.06 نظم ''نئی دنیا کو سلام'' تجزیہ

''نئی دنیا کو سلام'' علی سردار جعفری کی ایک تمثیلی نظم ہے۔آثر لکھنوی نے اسے ''اشتراکیت کا رزمیہ'' قرار دیا ہے۔ یہ ایک طویل نظم ہے جو کہ ایک مقدمے(حرفِ اوّل)، چھ تصاویر اور ایک خاتمے(حرفِ آخر) پر مشتمل ہے۔

﴿حرفِ اوّل﴾ سے اس نظم کی ابتدا سے ہوتی ہے۔ جو بعد کی چھ تصاویر کے لئے ایک مقدمے کی حیثیت رکھتا ہے۔ حرفِ اوّل جس میں ہندوستان کے دورِ ابتلا وافلاس وغلامی کو ایک مہیب رات یا ڈراوَنی دیوی سے تعبیر کیا ہے مثلاً کالے رنگ کے پھریرے ہوا میں اُڑ رہے ہیں، کالی رات سر اُٹھائے کھڑی ہے، رات کی زلفوں کے سائے کالے سانپوں کی مثل ہیں، کالے پھن، کالے پھول ہیں، کالے گھوڑوں کی ٹاپوں سے زمیں ہل رہی ہے، کالے عقاب کالے آسمان پر چھائے ہوئے ہیں، کالے پہاڑ سینوں کے اُبھار کی طرح تنے ہوئے اور دیوار سی بنائے ہوئے ہیں، کالی وادی، کالا جنگل، کالے دریا ہیں، کالے کھیت ہیں، کالے کارخانوں کی کالی چمنیوں کے کالے دھوئیں کے کالے ابر کانپتے پھر رہے ہیں، کالے چراغ کی کالی روشنی اور لویں ہیں، کالے گھر میں کالا سا جال بچھا ہوا ہے اور مخلوق کالے کیڑوں کی طرح رینگ رہی ہے۔

کالا بھوت اندھیرے میں بلبلایا ہوا ہے۔ کالی پیشانیوں پہ کالے دوپٹوں کے آنچل اور کالا ہی لباس اُن کے کالے بدن کو چھپائے ہے۔ کالے ہونٹوں پہ کالے بوسوں کے نشان ہیں، کالی خوشی میں بدمستیاں ہو رہی ہے۔ اتنی سیاہی ہے کہ ایک ماں کے سینے میں موجود دودھ سیاہ ہو گیا ہے۔ بچے بھی سیاہ ہیں، کالی فضا میں کالے تیر سنسنا رہے ہیں، کالے تیر کالے زہر میں بجھے ہوئے ہیں۔ کالی پھانسیاں، کالے پھندے، کالے تختہ دار، کالے ہاتھ، کالی گردنیں دَبائے ہوئے ہیں۔ کالے کوڑوں کے کالے بدن پر کالے نشان ہیں۔ کالے درد، کالے زخم کو جگا رہے ہیں، کالے جبر، کالی عزتیں اور کالی چیخیں ہیں، کالا انصاف اور کالی کلغیاں لگائے ہوئے ہیں۔ کالے رنگ کے جادوگر کالے لباسوں میں کالی تیوریاں چڑھائے ہوئے کالے حصار کھینچ رہے ہیں۔ غلامی کے عہد کا ضمیر یہ رات کی تیرگی (کالا پن) ہے جو اب اُجالے سے منہ چھپائے ہے کیوں کہ اس تاریکی کا پردہ چاک کرنے کو انقلاب ضروری ہے، ایسا انقلاب جس کا سرچشمہ ضمیرِ انسان کی نورانیت ہے۔ اس کا منشا محض مجنونانہ تخریب نہیں ہے بلکہ نظامِ نو کی تعمیر ہے جس کا خاکہ ذہن میں ہے۔ مستقبل کے لئے اُنہیں اُٹھا رکھا گیا ہے۔

پھر آخر میں شاعر سوال کرتا ہے:

کہاں ہے روشنیِ صبحِ انقلاب کہاں؟ ضمیرِ حضرتِ انساں کا آفتاب کہاں؟

پہلی تصویر کا آغاز میرؔ کے اس شعر سے ہوتا ہے:

محبت نے کاڑھا ہے ظلمت سے نور نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور

یعنی ظلمت کے پنجے سے محبت نے نور کو آزادی دلائی ہے۔ اگر محبت نہیں ہوتی تو دنیا میں روشنی کا وجود نہیں ہوتا۔

﴿پہلی تصویر﴾ اس میں جس تاریکی اور سیاہی کا ذکر ہے۔ اسی تاریکی وسیاہی سے دو انقلابی شخصیتوں کا ظہور ہوتا ہے جو کہ انقلاب کی نقیب ہیں۔ ایک مرد اور ایک عورت ہے۔ مرد کا نام جاوید ہے اور وہ دولھا بنا ہوا ہے۔ جب کہ عورت کا نام مریم ہے اور وہ دُلھن بنی ہوئی ہے۔ پہلی تصویر مشرقیت نواز عورت کی ہے جو شرمائی اور لجائی ہوئی جاوید کے سامنے موجود ہے۔ جاوید، مریم کی تعریف کرتا ہے کہ یہ چاند کب تک ابر میں چھپا رہے گا؟ بھلا عشق سے حُسن کب تک چھپا رہے گا؟ اور آپ میری نظروں سے کب تک شرماتی رہیں گی۔ پھول کا بادِنسیم سے پردہ کیسا؟ تو کیا میری فطرت کی محرم نہیں ہے؟ اور کیا تو میرے بچپن کی دوست مریم نہیں ہے؟ میں نے تو راتیں تیری آرزو واُمید میں گزاری ہیں اور تو سمٹ کر کالِ مشک بو میں آ گئی ہے اور تیری پلکیں جو کہ شرم سے جھکی جا رہی ہیں وہ حقیقت میں میرے دل میں چبھی جا رہی ہیں۔

تیرے چہرے پر حسن ومحبت کا جو ہالہ (گھیرا) ہے حقیقت میں وہی میری زندگی کا اُجالا ہے۔ یہ صاف وشفاف آنکھیں کہ جن کے ڈورے صاف دیکھ رہے ہیں، ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ یہ چھلکنے کے قریب ہیں اور جو تیرے ہاتھوں کو مہندی کا رنگ چڑھا ہے، ایسا لگ رہا ہے کہ تیری ہتھیلی پر کنول کا پھول کِھل گیا ہے۔ محبت کی رات کی قندیل ہے اور شباب کے خوابوں کی تکمیل کرنے والی ہے، تیری نیچی نظر میں ایک آنچ سی ہے اور تیرے حُسن سے میرے گھر میں روشنی ہے۔ اپنے تکلّم سے نغموں کی دنیا کو جگا دے اور تبسم سے پھولوں کو ہنسنا سکھا دے۔ (مریم اندر ہی اندر مسکراتی ہے) پھر جاوید کہتا ہے کہ تیری مسکراہٹ میں ہی دل کشی ہے اور یہ پھولوں میں سوئی چاندنی کی طرح ہے۔ کیا میری روح کی پیاس بجھ سکے گی؟ کیا مجھے سمندر سے صرف شبنم ملے گی؟ محبت ہے، نغمہ ہے، مَے ہے، سبو ہے مگر میرے لئے جو کچھ بھی ہے وہ تو ہی ہے۔ تیری خاموشیا فسانہ کہہ رہی ہے، جان بوجھ کر انَ جان بننے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہمارے دلوں کی حسرت پرانی اور محبت کی شراب بھی پرانی ہے۔

میرے سینے میں اُس گزری ہوئی شام کی یاد اب تک آباد ہے جب کہ دن دھیرے دھیرے ڈھلنے لگا تھا اور شام کے وقت ایسا لگتا تھا کہ فضاؤں میں سونا پگھلنے لگا تھا۔ دھندلکے میں پرچھائیاں ہر سمت انگڑائیاں لے کر ناچتی تھیں۔ اُفق کی شعائیں خواب سا بُن رہی تھیں اور شفق اپنے دوپٹے کو چُن رہی تھی۔ تیری روح ودل پر بادل چھائے تھے جب کہ تو میرے پاس گردن جھکائے کھڑی تھی مگر نکہتیں تجھ سے برس رہی تھیں اور تیرے کپڑوں سے خوشبو آ رہی تھی۔

جب تیرے سر سے دوپٹے کا آنچل ڈھلکا تھا تو میرے خون میں ساز سا بجنے لگا تھا۔ اسی رات کی طرح پلکیں جھک رہی تھیں، دل دھڑک رہا تھا اور نبضیں رُکی رُکی سی لگ رہی تھیں تب سورج نے جھک کر زمیں کو پیار کیا اور شب کی پیشانی کو ستاروں سے سجایا۔ تب پھسل کر کالی زلف شانوں پر آ گئی۔ تیرے چہرے کے سامنے اک شمع سی جھلملانے لگی۔ جب تو نے نگاہیں اُٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر اشاروں میں کچھ مسکرا کر کہا، نگاہوں کے اُس پیغام کو ہم نے سمجھ لیا پھر محبت کا پہلا جام ہم نے پی لیا۔ اسی جام نے ہم کو مست کر دیا اور ہماری تمناؤں کو بیدار کر دیا۔ جدائی میں صبر کرنا اور آگ پر سے گزرنا سکھا دیا اور یہ رات منّتوں مرادوں کی رات ہے، بچھڑے ہوؤں کی ملاقات کی رات ہے۔

مریم، جاوید کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتی ہے اور پھر پلکیں جھکا لیتی ہے۔ اس کی آنکھوں سے دو چمکتے ہوئے آنسو ٹپک پڑتے ہیں اور چمپئی رخساروں پر چاندی کی دو لکیریں سی کھنچ جاتی ہیں۔

مریم کہتی ہے: میری ساری دولت محبت کے آنسو ہیں۔ جاوید کہتا ہے: محبت کے آنسو مسرت وشادمانی کے آنسو ہیں۔ یہ میرے آنسو ٹوٹے ہوئے دلوں کا سہارا اور تقدیرِ آدم کا روشن ستارہ ہیں۔ تیری ساری ہستی تیری چشمِ نم میں اور میرے گھر کی جو برکت ہے وہ بھی تیرے دَم قدم سے ہے۔ عورت ہر دُکھ، سکھ کی ساتھی ہوتی ہے۔ عورت ہی جہنم کو جنت بناتی ہے۔ عورت پیشانی پہ ایک تجلی کا نام ہے۔ نظر میں زلیخا کی ہنستی جوانی کا نام عورت ہے۔ عورت ہی مطلوب وطلب گار اور غم خوار ودل دار بھی ہے۔ عورت ساز ونغمہ اور نغمہ گر ہونے کے ساتھ ساتھ پھول، چمن اور بادِ سحر بھی ہے۔

(مریم اپنے لب کھولتی ہے اور گزشتہ رات کا تذکرہ یوں کرتی ہے:)

ہاں ہاں مجھے وہ رات اب تک یاد ہے اور میری مٹھی میں وہ لمحات اب تک قید ہیں جو کلی کی طرح کھل کر لہو میں گھلے ملے جا رہے تھے۔ تمنائیں خواب بن کر لہرا رہی تھیں، جگنو اندھیرے میں نور کی بارش کر رہے تھے۔ اس رات زمان ومکان کے پردے اُٹھ گئے تھے اور ہم زمان و مکان کی قید سے آزاد تھے۔ ہمیشگی کے لئے لذّت کے دروازے کھل گئے تھے۔ شرارے میری رگوں میں دوڑتے تھے اور میرے آس پاس چاند تارے ناچتے تھے۔ وہ رات میرے لئے ایک طوفان کی مانند تھی جس میں سمندر کے سینے جیسا ہیجان مخفی تھا۔ وہ رات محبت کی سب سے پر کیف رات اور جوانی کی سب سے حسین رات تھی۔

(مریم اتنا کہہ کر خاموش ہو جاتی ہے اور جاوید یوں لب کھولتا ہے)

وہ رات آج تک حُسن برسا رہی ہے وہ رات آج کی رات لہرا رہی ہے

یعنی اس رات کا حُسن آج رات تک برس رہا ہے اور وہ رات زمان ومکان کی قید سے آزاد ہو کر آج پھر آ چکی ہے۔ یہاں پہلی تصویر کا اختتام ہوتا ہے۔ دوسری تصویر کا آغاز علی سردار جعفری کے ہی ایک شعر سے ہوتا ہے:

باغ کے آغوش میں گل چاہیے زندگانی میں تسلسل چاہیے

جاوید کا گیت: دراصل یہ حصہ تسلسل سے عبارت ہے۔ تسلسل ہی حقیقت ہے۔ اس تصویر میں جاوید اور مریم کے مابین رشتۂ ازدواج قائم ہو چکا ہے۔ اور مریم کی کوکھ میں ایک ننھی سی جان پل رہی ہے۔ اس حصے میں اسی سے متعلق جذبات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

(دوسری تصویر کی ابتدا میں جاوید گیت گنگناتا ہوا ظاہر ہوتا ہے)

رات کی پلکیں زمین پر سایہ فگن ہیں اور اندھیرا سخت خاموشی کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہے۔ زندگی کے لمحات جگنوؤں کی طرح ہوا میں اُڑ رہے ہیں۔ فضا کے سینے میں ایک آگ سی لگی ہوئی ہے۔ تاریکی کے مخملی پردے ایسے سُکڑ رہے ہیں جیسے کوئی اپنے جسم کو چراتے ہوئے نکل رہا ہے۔ کوئی وقت کے بھنور سے پیشانی پر قوسِ قزح کی کمانیں جھکائے ہوئے اُبھر رہا ہے۔ آنکھوں میں نیم شی کا کاجل لگا ہوا ہے، ہتھیلیوں پر حنا کے کنول روشن ہیں۔ میری جوان آرزوؤں کے چنچل پھولوں سے اپنی زلفوں کو گوندھ کر سجائے ہوئے ہے۔ دھندلے دھندلے ستاروں کے لطیف جھرمٹ میں سرخ دوپٹے کے کنارے جگمگا رہے ہیں۔ دوپٹے کی ریشمی شکنوں کے ذریعے گزشتہ رات کی خوب صورت چاندنی چھپائے ہوئے ہے اور سڈول وسبک بازوؤں کے درمیان شعر وشباب کی انگڑائیاں دبائے ہوئے ہے۔ خواب وافسانے کی سرحدوں کے قریب کھڑی ہے اور اندھیری رات کے دل میں چمن کو وجود بخش رہی ہے۔ وفا کے جوش سے دل کی روشنی چہرے پر آ گئی ہے اور حیا کے رنگ میں اس کے رُخسار (گال) تمتمائے ہوئے ہیں۔ اس کی بھوؤں پر انکار کی جتنی حسین شکنیں ہیں اتنے ہی ان حسین ہونٹوں پہ مسکراتے ہوئے اقرار ہیں۔

(اب مریم،عورت کے بارے میں یوں گویا ہوتی ہے:)

مریم: یہ امر مسلّم ہے کہ عورت محبت کی منزل ہے،عورت کے اندر ایک تڑپتا اور مچلتا ہوا دل ہے مگر اس کے علاوہ بھی عورت بہت کچھ ہے اور اس کے علاوہ بھی اس کے بہت سے زمان ومکان اور جہان ہیں اور اس کی مختلف شکلیں ہیں۔وقت کے ساحلوں سے ٹکراتی ہوئی کتنی ہی منزلوں سے گزرجاتی ہے۔عورت کبھی جام بن کر چھلکتی تو کبھی اشک بن کر ٹپکتی ہے۔عورت فقط چند لمحات کی رفیق نہیں ہے، وہ محض شہد و شبنم نہیں ہے، وہ تبسم ہی نہیں بلکہ تلوار بھی ہے اور صرف نغمہ ہی نہیں بلکہ اس میں جھنکار بھی ہے۔عورت جب مسندِ محبت پر ہوتی ہے تو وہ حُسن و جوانی کا مجسمہ ہے اور جب بہادری کے میدان میں ہو تو جھانسی کی رانی ہوتی ہے۔وہ شبستان کی روشنی اور سحر کا نور ہے اور وہ ہر موڑ پر مرد کی ہم سفر ہے مگر جو روپ عورت کا سب سے مقدّس اور پاکیزہ ہے وہ ماں کا روپ ہے، وہ تخلیق کے دل کا پوشیدہ سوز ہے۔

وہ صدف کی چمک میں، گوہر کی موج میں، کلی میں چھپا ہوا پھول اور پھل بھی ہے۔نگاہوں میں دل بَرانہ شوخی ہے جو کہ عورت کی جسمانیت کی چمک ہے اور پیشانی پر مادرانہ عظمت جھلکتی ہے جو کہ عورت کا روحانی روپ ہے۔عورت جوانی کو شاداب اور محبت سے سیراب کرتی ہے۔انسان کی کائنات اسی کے دَم سے ہے اور اسی کے دَم سے زندگی کا چراغ روشن ہے۔جس آنچل کو وہ بچے پر ڈالتی ہے اور جس آغوش میں وہ بچے کو پالتی ہے اسی آنچل میں زندگی کا شرارہ اور اسی آغوش میں تہذیب کا گہوارہ موجود ہے۔

محبت کی راتوں کی شیرینیوں، جوانی کی پُر کیف رنگینیوں، نگاہوں کے رَس، لبوں کی مٹھاس، مہکتی ہوئی مسکراہٹ سے تر و تازہ پھولوں کو نئے رنگ، روپ اور نئی شکل میں ڈھال دیتی ہے، اس شخصیت کا نام عورت ہے۔

(اب جاوید فرطِ مسرّت میں یوں گویا ہوتا ہے:)

جاوید: کل تک تو ایک کونپل تھی مگر آج تو پھولوں کی شاخ بن چکی ہے یعنی تو اب ایک بچے (میرے بچے) کی ماں بننے والی ہے۔

(پھر مریم اپنے مادرانہ جذبات کی عکّاسی کرتی ہے:)

مریم: کوئی میرے پہلوؤں میں ایسے پھڑکتا ہے جیسے میری سانس میں میرا دل دھڑکتا ہو۔رگ و پے میں کوئی ایسے سمایا ہوا ہے کہ اس کا رنگ میری روح پر چھایا ہوا ہے۔کوئی ہے جو میرے دل میں انگڑائی لے رہا ہے اور میرے خون میں کشتیاں چلا رہا ہے۔میرے بدن میں ستاروں جیسی سنسناہٹ ہے اور میری رگوں میں ایک عجیب سی گنگناہٹ ہے۔میرے ذہن میں ہوائیں چلنے سے سنہری گھٹائیں اُمڈ رہی ہیں، ان سنہری گھٹاؤں سے بنتی اور بگڑتی ہوئی لاکھوں کلیاں ہوا میں مہکتی ہیں۔یہ سب ایک طوفان کی موج کے مانند ہے جو مسلسل بڑھ رہی ہے اور ایک ندی کی طرح لگاتار چڑھ رہی ہے۔اب تو میرا حال یہ ہے کہ میری نگاہوں میں نشہ سا چھانے لگا ہے اور ہر ایک چیز پر پیار آنے لگا ہے۔ زمین،آسمان چاند،سورج مجھے دُور سے اشارے کر رہے ہیں، بہاریں میری رازداں اور ہوائیں میری ہم زباں ہوگئی ہیں۔مجھ کو بادِ نسیم گدگداتی اور کلی دیکھ کر مسکراتی ہے۔ایک ارمان ہے جو میری گود میں پل رہا ہے اور میرا تصوّر گھٹنیوں میں چل رہا ہے۔اب تو حالت یہ ہے کہ خون رقص کرتا ہے، رگیں ٹوٹتی ہیں اور میرے جسم سے کلیاں پھوٹتی ہیں۔

(دوسری تصویر کے آخر میں جاوید یوں گویا ہوتا ہے:)

جاوید: انسان کی زندگی ایک شاعرانہ زندگی ہے جس کی بقامیں محبت کا ہونا ضروری ہے۔وہ محبت ایک نغمہ ہے جو سر گوشیوں سے جنم لیتا ہے اور ہم آغوشیوں سے اس کا وجود ہوتا ہے، پلکیں لرزتی ہیں، ابرو سمٹتے ہیں، پہلو پھڑکتے ہیں، بازو مچلتے ہیں، دل تڑپتے ہیں، سینے دھڑکتے ہیں، جوانی سفینے لے کر نکلتی ہے۔ ماتھے چمکتے ہیں، چہرے دمکتے ہیں، پھولوں کے شاداب سہرے مہکتے ہیں، صندل نکھرتا ہے، افشاں جھلکتی ہے، شاخیں لچکتی اور کلیاں چٹکتی ہیں، جلوے اُبھرتے، نکھرتے اور سنورتے ہیں، زُلفیں ڈھلکتی ہیں، آنچل سرکتے ہیں، بادل اُمنڈتے اور برستے ہیں۔ یہ سب محبت کی کارفرمائیاں ہیں جس کا بہانہ زندگی کی بقا کے لئے اہم ہے اور زندگی کا نشان اُڑتا جا رہا ہے۔ زندگی کا کارواں رواں دواں ہے جو ٹھہرنے کا نام نہیں لیتا۔ درحقیقت تسلسل ہی زندگی ہے، تسلسل ہی افسانہ ہے، تسلسل ہی زندگی کا ترانہ ہے اور تسلسل ہی کرن کے مانند ہے کہ اس سے شعائیں پھوٹتی ہیں جس طرح سے پھلجھڑی چھوٹتی ہے۔

نوٹ: یہ نظم ایک طویل نظم ہے۔ نظم کے ابواب کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے کہ نظم کے شروع میں حرفِ اوّل، پہلی تصویر، دوسری تصویر، تیسری تصویر، چوتھی تصویر، پانچویں تصویر، چھٹی تصویر اور حرفِ آخر ہے مگر اس اکائی میں حرفِ اول، پہلی اور دوسری تصویر کو شامل کیا گیا ہے اور اُنھی پر ذہن کو مرکوز کیا گیا ہے لیکن یہاں پر اُن آٹھوں ابواب کا مختصراً جائزہ پیش ہے:

حرفِ اوّل: اِس میں ہندوستان کی غلامی کے دَور کو ایک خوف ناک رات یا ڈراوَنی دیوی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس تاریکی کا پردہ چاک کرنے کے لئے انقلاب ضروری ہے جس میں انسان کے ضمیر کی روشنی کا سرچشمہ ہو۔ اس کا منشا محض مجنونانہ تخریب نہیں ہے بلکہ نظامِ نَو کی تعمیر ہے جس کا خاکہ موجود ہے۔

﴿**پہلی تصویر**﴾ تاریکی سے دو شکلیں اُبھرتی ہیں جو انقلاب کی نقیب ہیں۔ ایک مرد ہے اور ایک عورت۔ اس میں یہ رمز ہے کہ مردوں اور عورتوں کے اتفاق واتحاد کی کوششوں سے مکمل آزادی اور فراغت حاصل ہوسکتی ہے۔

عورتوں کی سعیِ عمل کا نمائندہ جھانسی کی رانی کی روح کو بنایا گیا ہے۔ رُندھی ہوئی فضا اور غمگین موضوع میں رنگینی ورعنائی کی ایک جھلک دکھانے کو نیز اس امر پر زور دینے کو کہ انقلاب کے حامیوں کو اخلاقی حیثیت سے آدمیت اور ایثار کا مجسمہ ہونا چاہیے۔ جاوید اور مریم کے باہمی ارتباط اور معاشقے کا ذکر ہے۔ ان کی محبت صاف وشفاف ہے۔ حالاں کہ عام طور پر ترقی پسند لوگ ایسی محبت کے قائل نہیں بلکہ تند و تیز رومان کی تلاش میں رہتے ہیں۔ چاہے وہ محبت کتنی ہی بے ثبات اور نتائج کے لحاظ سے مہلک ہو۔ مریم عفت وحیا کی پتلی ہے جب کہ جاوید کا عشق ہوس کاری کی بھٹی نہیں ہے۔

﴿**دوسری تصویر**﴾ مریم اور جاوید میں رشتۂ ازدواج قائم ہو چکا ہے اور مریم ''دو جی'' سے ہے۔ اس کی حالت کے متعلق جذبات کی مصوری سردار جعفری نے جس نفاست اور چابک دستی سے کی ہے وہ آپ اپنی مثال ہی نہیں بلکہ اردو میں ایک نئی چیز ہے۔

﴿**تیسری تصویر**﴾ کوڑی کوڑی کو محتاج مریم اپنے ہونے والے بچے کے لئے کُرتا سی رہی ہے، کپڑا میسر نہیں ہے، پھٹے پرانے چیتھڑے جوڑ رہی ہے مگر ہائے ممتا کا تقاضا کہ مختلف رنگوں کے ٹکڑوں میں تال میل پیدا کرنے کی دُھن سوار ہے۔

﴿**چوتھی تصویر**﴾ انقلاب کے آثار نمایاں ہیں۔ جاوید اور مریم اس تحریک میں پیش پیش ہیں۔ حکومت کے خلاف بغاوت کا جرم لگا کر دونوں کو فرنگی عدالت کے سامنے لایا جاتا ہے۔ حاکمِ عدالت کے سوالات، جاوید اور مریم کے جوابات، ان کا تیور اور لب ولہجہ اس حصۂ نظم کی

جان ہے۔بعض دوسرے ''شاعرانِ انقلاب'' کے برخلاف سردار جعفری نے ''عفریتِ انقلاب'' کو خون کی ندیاں بہاتے، بوڑھے اور بچوں کی ٹانگیں چیرتے، لاشوں کے ڈھیر پر ناچتے، کلکاریاں مارتے، بغلیں بجاتے، شلنگیں بھرتے، انسانوں کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھاتے، ڈکاریں لیتے اور خون آلود داڑھوں سے گوشت کے ریشے نکالتے نہیں دِکھایا ہے۔

جاوید اور مریم کی تقریر ذاتی نفرت، بغض وعناد اور کینہ پروری کی تلخیوں سے یکسر پاک ہے۔ان کی جنگ ایک خاص نظامِ حکومت اور ایک خاص تمدّن سے ہے جس کی بنیاد جبر واستبداد پر ہے اور جس میں دولت کی تقسیم غیر مساوی اور غیر منصفانہ ہے۔جس میں غریب کچلے جاتے ہیں اور اُن کے جائز حقوق پامال کیے جاتے ہیں۔اس جنگ میں ذاتی پرخاش کو مطلق دخل نہیں۔جاوید باغی قرار پاتا ہے اور اس کو سزائے موت کا حکم سنایا جاتا ہے۔مریم بظاہر آزاد کردی جاتی ہے مگر اس کی سزا موت سے سخت تر ہے:

ع ....''عمر بھر صرف رویا کرو''

﴿پانچویں تصویر﴾ پھانسی پانے سے پہلے جاوید صبحِ نو کے طلوع ہونے کی پیشین گوئی کرتا ہے بلکہ بشارت دیتا ہے۔اس نظم کے اکثر مقامات نہایت اہم ہیں۔

﴿چھٹی تصویر﴾ مریم پھر بھی عورت ہے۔نوحہ اور گریہ وزاری کرتی ہے۔نامہ بر مریم کو جاوید کا آخری پیغام سناتا ہے۔اس پیغام میں پوری نظم کا نچوڑ ہے۔جذبات کا سیلاب ہے کہ اُمڈا آرہا ہے۔

﴿حرفِ آخر﴾ علی سردار جعفری حرفِ آخر میں نئی دنیا کو سلام پیش کرتے ہوئے اِن اشعار پر اختتام کرتے ہیں:

نئے اُفق سے نئے قافلوں کی آمد ہے ۔۔۔ چراغِ وقت کی رنگین لَو بڑھائے ہوئے
قدم بڑھائے ہوئے اے مجاہدانِ وطن! ۔۔۔ مجاہدانِ وطن! ہاں، قدم بڑھائے ہوئے

08.07 خلاصہ

علی سردار جعفری ۲۹ نومبر ۱۹۱۳ء کو ضلع بلرام پور، اُتر پردیش کے ایک زمین دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ان کے والدِ محترم کا نام سید جعفر طیار اور ماں کا نام زاہدہ خاتون جعفری تھا۔ان کا خاندان شیعہ مذہب کا پیروکار تھا۔ان کا شجرۂ نسب ۳۷ واسطوں سے حضرت علی (کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم) تک پہنچتا ہے۔علی سردار جعفری کو ایک زمین دار گھرانے میں آنکھ کھولتے ہی وہ سب کچھ نصیب ہوا جو عام طور پر زمین دار گھرانوں میں ہوتا ہے مثلاً جاہ وجلال، شان وشوکت، کرّ وفر اور عیش وآرام وغیرہ۔اس کے ساتھ ہی شیعہ خاندان کی وجہ سے علم وتہذیب اور ادب سے بھی وافر حصہ نصیب ہوا تھا۔ بہار کے ایک مولوی صاحب سے قرآنِ پاک اور فارسی کتابیں پڑھیں۔منشی بدری پرساد سے چھٹی جماعت تک ریاضی کے اسباق پڑھے۔ماسٹر بشیر سے انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔بیس سال کی عمر میں ہائی اسکول مکمل کرلیا۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا جہاں انگریزوں کے خلاف سیاسی سرگرمیوں کے جرم میں خارجہ کردیا گیا۔دہلی یونی ورسٹی سے بی۔اے کیا۔اپنی زندگی میں کئی بار جیل گئے۔

۱۷ سال کی عمر میں پہلا مرثیہ لکھا۔غزلیں کہیں لیکن پھر نظم کے دامن سے وابستہ ہوگئے۔''پرواز، پتھر کی دیوار، ایک خواب اور، پیراہنِ شرر اور لہو پکارتا ہے'' ان کے شعری مجموعے ہیں جب کہ ''نئی دنیا کو سلام، خون کی لکیر اور امن کا ستارہ'' ان کی طویل نظمیں ہیں۔اس

کے علاوہ انہوں نے افسانے، ڈرامے، تبصرے اور تنقیدی مضامین بھی لکھے۔انہوں نے بہت سی کتابوں کی ترتیب و تدوین بھی کی۔ دوسروں کی تخلیقات پر دیباچے اور تقاریظ بھی لکھیں۔ آل انڈیا ریڈیو سے منسلک رہے۔ کہانیاں اور مکالمے بھی لکھے۔علی سردار جعفری نے اپنی زندگی میں کئی مشاہیرِ ادب سے ملاقاتیں کیں۔علی سردار جعفری نے ''نیا ادب، قومی جنگ، گفتگو، کتاب نما اور نیشنل بک ٹرسٹ جیسے رسالوں کی ادارت کے فرائض بھی بخوبی انجام دِیے۔یکم اگست ۲۰۰۰ء کو ممبئی میں علم و ادب کا یہ نیّرِ تاباں غروب ہو گیا اور اپنے پیچھے علم و ادب کا ایک بہت بڑا ذخیرہ بطورِ وراثت چھوڑ گیا جس سے نوعِ انسانی قیامت تک فیض یاب ہوتی رہے گی۔علی سردار جعفری کی نمازِ جنازہ دوبار پڑھی گئی۔ پہلی نمازِ جنازہ شیعہ قبرستان رحمت آباد میں اور دوسری نمازِ جنازہ سنی قبرستان ''جوہو'' میں ادا کی گئی مگر تدفین سنی قبرستان ''جوہو، ممبئی'' میں عمل میں آئی۔

08.08 فرہنگ

پیکر تراشی	:	لفظی شکل بنانا	قوسِ قزح	:	دھنک
تخریب	:	خراب کرنا، بگاڑنا	کاکل	:	بالوں کی لٹ
تدفین	:	دفن کرنا	کلغی	:	طرّہ
تدوین	:	جمع کرنا	کیف آفریں	:	سرور پیدا کرنے والی
خداداد	:	خدا کی دی ہوئی	مارِ سیاہ	:	کالا سانپ
دبیز	:	موٹی	مکالمہ	:	بات چیت، گفتگو
رزمیہ	:	جنگی	ملکہ	:	مہارت
رمق	:	تھوڑی سی جان	مجنونانہ	:	مجنوں کی طرح
ریاضی	:	حساب	ناگوار	:	نامناسب
سبو	:	مٹکا	وراثت	:	میراث
شرارہ	:	چنگاری	وافر	:	بہت، زیادہ
شفق	:	افق کی سرخی	ہالہ	:	چاند کا گھیرا
قندیل	:	شمع	ہیجان	:	جوش و خروش

08.09 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ : ''نئی دنیا کو سلام'' کے حرفِ اوّل پر اظہارِ خیال کیجیے؟

سوال نمبر۲ : علی سردار جعفری کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم کے بارے میں بتائیے؟

سوال نمبر۳ : علی سردار جعفری کی شاعری میں انقلاب کے عنوان پر ایک مضمون لکھیے؟

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ : علی سردار جعفری کی نظم نگاری پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے؟

سوال نمبر۲ : ''نئی دنیا کو سلام'' سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیجیے؟

سوال نمبر۳ : علی سردار جعفری کے حالاتِ زندگی پر ایک مفصل مضمون لکھیے؟

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ نظم ''نئی دنیا کو سلام'' میں کتنی تصویریں ہیں؟

(الف) ۴ (ب) ۶ (ج) ۸ (د) ۱۰

سوال نمبر۲ علی سردار جعفری کا پہلا مجموعہ ''پرواز'' کس سنہ میں منظرِ عام پر آیا؟

(الف) ۱۹۴۰ء (ب) ۱۹۴۱ء (ج) ۱۹۴۳ء (د) ۱۹۴۵ء

سوال نمبر۳ علی سردار جعفری کس سنہ میں پیدا ہوئے؟

(الف) ۱۹۱۳ء (ب) ۱۹۱۲ء (ج) ۱۹۱۰ء (د) ۱۹۱۴ء

سوال نمبر۴ علی سردار جعفری نے بی۔اے کس یونی ورسٹی سے کیا؟

(الف) جامعہ ملیہ اسلامیہ (ب) لکھنؤ یونی ورسٹی (ج) عثمانیہ یونی ورسٹی (د) دہلی یونی ورسٹی

سوال نمبر۵ علی سردار جعفری کی تدفین کس شہر میں ہوئی؟

(الف) بارہ بنکی (ب) ممبئی (ج) بلرام پور (د) لکھنؤ

سوال نمبر۶ نظم ''نئی دنیا کو سلام'' کس سنہ میں منظرِ عام پر آئی؟

(الف) ۱۹۴۳ء (ب) ۱۹۴۵ء (ج) ۱۹۴۸ء (د) ۱۹۵۰ء

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (ب) ۶ جواب نمبر۴ : (د) دہلی یونی ورسٹی

جواب نمبر۲ : (ج) ۱۹۴۳ء جواب نمبر۵ : (ب) ممبئی

جواب نمبر۳ : (الف) ۱۹۱۳ء جواب نمبر۶ : (ج) ۱۹۴۸ء

08.10 حوالہ جاتی کتب

۱۔ علی سردار جعفری ایک مطالعہ از پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی

۲۔ سردار جعفری اور ادب کی سماجی معنویت از خواجہ محمد شاہد، وہاج الدین علوی

۳۔ جدید نظم: حالؔی سے میرا جی تک از کوثر مظہری

۴۔ کلیاتِ علی سردار جعفری از علی احمد فاطمی

۵۔ جدید شاعری از عبادت بریلوی

اکائی 09 : جاں نثار اختر ''روشنیاں، زندگی کے موڑ پر''

ساخت :

09.01 : اغراض و مقاصد

09.02 : تمہید

09.03 : جاں نثار اختر کے حالاتِ زندگی

09.04 : جاں نثار اختر کی شاعری

09.05 : نظم ''روشنیاں'' متن

09.06 : نظم ''روشنیاں'' تجزیہ

09.07 : نظم '''زندگی کے موڑ پر'' متن

09.08 : نظم ''زندگی کے موڑ پر'' تجزیہ

09.09 : خلاصہ

09.10 : فرہنگ

09.11 : سوالات

09.12 : حوالہ جاتی کتب

09.01 اغراض و مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ جاں نثار اختر کے حالاتِ زندگی سے واقف ہوسکیں گے۔ جاں نثار اختر کے ہم عصروں کی عمومی جان کاری حاصل کرسکیں گے۔ جاں نثار اختر کے شعری مجموعوں پر تبصرہ کرسکیں گے۔ اُن کی کائناتِ شاعری کا عمومی جائزہ لے سکیں گے۔ جاں نثار اختر کی نظمیہ اور غزلیہ شاعری کا بخوبی مطالعہ کرسکیں گے۔ جاں نثار اختر کی نظموں کی خصوصیات بیان کرسکیں گے۔ اُن کی دو معروف نظموں ''روشنیاں'' اور ''زندگی کے موڑ پر'' کا تجزیہ کرسکیں گے۔ اُن کی نظموں کی فنّی، جمالیاتی اور عصری خصوصیات بیان کرسکیں گے۔

09.02 تمہید

شاعری ایک فنِ لطیف ہے اور نظم لکھنا مزید لطیف ترین فن ہے۔ وہ اس لئے کہ اردو ادب میں فی زمانہ اس کے ہیئت و معنویت میں تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ نظیرؔ سے لے کر حالیؔ اور حالیؔ سے اب تک نظموں میں کئی نہج پر تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ کچھ تبدیلیاں عصری تقاضوں کی وجہ سے اور کچھ شعرا کی فکر و نظر میں جدیدیت کے رجحان کی وجہ سے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد بالعموم اور پہلی جنگِ عظیم کے بعد بالخصوص اردو نظموں کا کینوس وسیع اور گردشِ زمانہ کے ساتھ وسیع تر ہوتا گیا۔

۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند تحریک کا باضابطہ عمل دخل ادب کے دونوں زمروں نثر و نظم میں عیاں ہوجاتا ہے۔زمانے کے سیاسی رجحانات، بین الاقوامی سطح پر سماجی و معاشی تبدیلیاں، اشتراکی اور سوشلسٹ نظریات کا فروغ اور متعدد ایشیائی وافریقی ممالک کی جدّ وجہدِ آزادی اِن سب واقعات وحالات کا اثر اُدباوشعرا پر پڑا لیکن سب سے زیادہ متاثر جدید اور ترقی پسند شعرا ہوئے۔ترقی پسند شعرا نے اردو شاعری کو کئی عظیم نظموں سے مالا مال کیا۔گوکہ نظم کے نمائندہ شعرا جنہوں نے جدید نظم نگاری کو خاطر خواہ تقویت بخشی اُن میں ڈاکٹر محمد اقبالؔ، جوشؔ ملیح آبادی، اخترؔ شیرانی اور جمیلؔ مظہری وغیرہ کے نام بطورِ خاص لیے جاسکتے ہیں لیکن آگے کی صف میں ترقی پسند اور حلقۂ اربابِ ذوق کے شعرا نے جدید نظم کو مزید تقویت بخشی۔

اِس صف میں مخدومؔ محی الدین، فیض احمد فیضؔ، اسرار الحق مجازؔ، علی سردار جعفری، اختر الایمان، ساحر لدھیانوی، ن۔م۔راشد، میراجی، یوسف ظفر، قیوم نظر اور ضیا جالندھری کے وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔اِنہی معروف شعرا میں ایک اہم نام جاں نثار اختر کا بھی ہے جنہوں نے جدید اردو نظم کو سمت ورفتار عطا کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

09.03 جاں نثار اختر کے حالاتِ زندگی

جاں نثار اختر کا پورا نام جاں نثار حسین اختر تھا۔اُن کی پیدائش ۱۸/فروری ۱۹۱۴ء کو گوالیار، مدھیہ پردیش میں ہوئی۔جاں نثار کا آبائی وطن اُتر پردیش کے ضلع سیتاپور کا مردم خیز قصبہ خیرآباد ہے۔اُن کا سلسلۂ نسب سادات گھرانے سے ملتا ہے۔جاں نثار اختر کے پردادا کا نام علامہ تفضّل حسین تھا جو خیرآباد کے خدارسیدہ بزرگ تھے اور شاہ صاحب کے نام سے معروف تھے۔جاں نثار اختر کے دادا کا نام سید احمد حسین تھا جن کے دو فرزند سید محمد حسین بسملؔ اور سید محمد افتخار حسین مضطرؔ تھے۔یہی سید افتخار حسین مضطرؔ، مضطرؔ خیرآبادی کے نام سے معروف ہیں اور جاں نثار اختر کے والدِ ماجد بھی ہیں۔

جاں نثار اخترؔ کا قد میانہ، رنگ گندمی، پیشانی کشادہ، آنکھیں چمک دار اور ناک ستواں لمبی تھی۔ہونٹوں پر ہمیشہ مسکراہٹ اور طبیعت میں سادگی کے ساتھ ساتھ نزاکت ونفاست، عادتوں میں لاپرواہی، باتوں میں نرمی وشگفتگی، لمبے لمبے بکھرے بال جنہیں وہ دورانِ گفتگو بار بار اُنگلیوں سے سنوارتے رہتے تھے۔جاں نثار اختر کے لباس میں قناعت پسندی کا پرتو دیکھا جاسکتا تھا۔لباس کے طور پر سفید کرتا پاجامہ، پاؤں میں چپل اور کبھی کبھی کھلے بٹنوں والی نہرو کٹ واسکٹ۔اُن کا رویہ بڑوں کے ساتھ عزت واحترام کا اور دوستوں کے ساتھ بے تکلّفی وخوش مذاقی کا تھا جب کہ چھوٹوں کے ساتھ شفقت ومحبت اور ہمدردی کا تھا۔

جاں نثار اختر کی شادی ۲۵/دسمبر ۱۹۴۳ء کو صفیہ سے ہوئی۔شادی کے تقریباً چار سال بعد تک ملازمت کی مجبوری کی وجہ سے جاں نثار اختر گوالیار میں اور صفیہ علی گڑھ میں الگ الگ رہے۔یہ دَور دونوں کے ازدواجی زندگی کا بہت ہی نازک دَور تھا۔جاں نثار اختر اور صفیہ کے خطوط سے دونوں کی والہانہ الفت ومحبت اور ملازمت کی مجبوری کی تصدیق ہوتی ہے۔صفیہ کا پورا نام صفیہ سراج الحق تھا۔یہ اسرار الحق مجازؔ لکھنوی کی سگی بہن تھیں۔صفیہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں۔مسلم یونی ورسٹی کے گرلس کالج میں ملازمت اختیار کی۔وہ کالج میں اقتصادیات کی لیکچرار مقرر ہوئیں۔شوہر کی طرح صفیہ بھی اردو ادب میں ایک خاص مقام رکھتی تھیں۔صفیہ کے ادبی ذوق کا اندازہ اُن کے مضامین کے مجموعے ''اندازِ نظر'' سے ہوتا ہے۔

﴿۱﴾ **تعلیم وتربیت:** جاں نثار اختر کی ابتدائی تعلیم گوالیار میں ہوئی۔ اُنہوں نے وکٹوریہ ہائی اسکول گوالیار سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اُس کے بعد علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں ایف۔ ایس۔ سی میں داخلہ لیا اور فزکس، کیمسٹری، بائیولوجی مضامین کا انتخاب کیا۔ ۱۹۳۴ء میں انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد بی۔اے میں داخل ہوئے جہاں اُن کے مضامین انگریزی اور فلسفہ تھے۔ بی۔اے آنرس کے لئے جاں نثار اختر نے اردو کا انتخاب کیا اور ۱۹۳۷ء میں بی۔اے آنرس کی ڈگری حاصل کی۔

۱۹۳۹ء میں اُنہوں نے ایم۔اے اردو کا امتحان فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا۔ جاں نثار اختر مسلم یونی ورسٹی سے ہی پی ایچ۔ ڈی کرنا چاہتے تھے۔ اُنہوں نے اپنے تحقیقی مقالے کا عنوان ''اردو ناول اور اُس کا ارتقا'' بھی منتخب کرلیا تھا لیکن اُسی دوران وکٹوریہ کالج گوالیار میں اُن کا انتخاب بحیثیتِ لیکچرار ہوگیا اور تحقیق کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔

﴿۲﴾ **شخصیت:** جاں نثار اختر کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ بظاہر وہ سنجیدہ مزاج اور خاموش طبیعت تھے لیکن واقعتاً نازک مزاجی اُن میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ چند ملاقاتوں میں ہی وہ دوستوں سے اِس قدر مانوس ہوجاتے تھے جیسے اُنہیں برسوں سے جانتے ہوں۔ کبھی وہ مفکّر نظر آتے تو کبھی خالص شاعر۔ اُن کی شخصیت کا ظاہر و باطن ایک جیسا تھا۔ ''سلاسل'' کے پیش لفظ میں جوشؔ ملیح آبادی نے لکھا ہے:

''اُن کا چہرہ بھی اُجلا ہے، دل بھی اُجلا ہے، ذہن بھی اُجلا ہے''۔

جاں نثار اختر کی شخصیت پر اُن کے آباواجداد کی علمی وراثت کا عکس نمایاں تھا۔ علی سردار جعفری نے جاں نثار اختر کی شخصیت پر اپنی رائے پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اور یہ جاں نثار اختر ہے۔ نَو واردشعرا کے ہجوم میں تنہا جسے شاعری اپنے والد مضطرؔ خیر آبادی سے ورثے میں ملی ہے۔ اپنے ہی آپ سے اُلجھا ہوا خود ہی سنجیدہ ہوجاتا ہے اور خود ہی مسکرا دیتا ہے۔''

(لکھنؤ کی پانچ راتیں: ص/۷۹۔۷۸)

جاں نثار اختر کا ایک بڑا کارنامہ اردو شاعری کا وہ ۳۰۰ رسالہ انتخاب ہے جو دو جلدوں میں ''ہندوستان ہمارا'' کے نام سے شائع ہوا۔ اردو شاعری کا یہ انتخاب جواہر لال نہرو کی فرمائش پر پیش کیا گیا تھا۔ جاں نثار اختر اپنے پورے ادبی سفر میں فلموں سے بھی جڑے رہے۔ اُنہوں نے تقریباً ڈیڑھ سَو فلموں کے لئے گیت لکھے۔ اُن کے کئی گیت اب بھی مقبولِ خاص و عام ہیں مثلاً ''یہ دل اور اُن کی نگاہوں کے سائے، اے دلِ ناداں! غریب جان کے ہم کو نہ تم مٹا دینا'' وغیرہ۔ جاں نثار اختر نے لکھنؤی تہذیب کی عکاسی کرنے والی فلم ''بہو بیگم'' پروڈیوس کی۔ اپنے ہم عصر ترقی پسند خصوصاً ملک راج آنند، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر اور عصمت چغتائی وغیرہ کے ساتھ مل کر 'بمبئی گروپ آف رائٹرس' کے لئے کام کیا۔

کسی بھی انسان کی شخصیت کا بہتر سے بہتر اندازہ اُس کے قریبی رشتے دار لگا سکتے ہیں اور اس سے زیادہ بلکہ سب سے زیادہ قربت تو شریکِ حیات سے ہوتی ہے لہٰذا جاں نثار اختر کی شخصیت کا اندازہ اُن کی دیرینہ محسنہ بیگم فاطمہ زبیری کی باتوں سے تو لگایا ہی جاسکتا ہے لیکن سب سے زیادہ اُن کی دونوں اہلیہ صفیہ اختر اور خدیجہ اختر کی تحریروں سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اختر بظاہر سیدھے سادھے آدمی تھے۔ ہر ایک بات پر ہلکا سا تبسم جس کی شیرینی پر ہزاروں قہقہے قربان جائیں لیکن اُن کی نازک مزاجی کے ناز اُٹھانے کے لئے بڑے قلب وجگر کی ضرورت ہے۔ صفیہ اختر نے جاں نثار اختر کی نازک مزاجی کے متعلق اپنے احساسات اِن الفاظ میں بیان کیے ہیں۔

وہ لکھتی ہیں:

''اختر کی نازک مزاجی کو گوارا بنانے کے لئے گاندھی جی کے انسانی قلب وجگر کی ضرورت ہے۔ خود اپنا دل شیشے کے سے نازک کیوں نہ ہو لیکن خُوے دوست کے نازک تر ہونے کا سوال ہے''۔ اِس لئے اگر بلاے جاں سے نبھائے رکھنی ہے تو کسی موقعے پر لہجے میں یا گفتگو میں تندی پیدا نہیں ہونی چاہیے ورنہ معاملات تخریب کی حد تک ایک جست میں پہنچ سکتے ہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ فطرت نے معاوضے کے طور پر اُن میں بچوں کی سی معصوم مسرّت کی صلاحیت بھی رکھ دی ہے جس سے شاید وہ زندگی بھر محروم نہ ہو سکیں گے۔''

(جاں نثار اختر۔حیات وفن،ص/۸۱)

آپ یہ جان چکے ہیں کہ جاں نثار اختر اپنی اہلیہ صفیہ سے دُور گوالیار میں تھے اور صفیہ علی گڑھ میں۔صفیہ کے خطوط سے جس طرح اپنے شوہر سے والہانہ محبت کا پتہ چلتا ہے اُسی طرح جاں نثار اختر کی ذات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ کس طرح ٹوٹ کر صفیہ کو چاہتے تھے لیکن اُنہوں نے کبھی اِس کی تشہیر نہیں کی۔بیگم فاطمہ زبیر کے لفظوں میں:

''کبھی اپنی بیماری کی اطلاع صفیہ کو نہیں دیتے تھے اور نہ دینے دیتے تھے اور اگر وہ پندرہ دن بھی بیمار رہیں تو وہ (صفیہ) بے چاری خط لکھ لکھ کر تھک جاتی۔یہ جب اچھے ہوتے تو ایک جملے میں اُس کی تمام شکایتوں کا جواب لکھ دیتے کہ بیمار تھا اِس لئے خط نہیں لکھا کہ تم خواہ مخواہ فکر مند ہوگی۔''

(بحوالہ فاطمہ زبیر۔پیش لفظ ''حرفِ آشنا'' ص/۱۱)

جاں نثار اختر نے بھی ایک خط میں صفیہ کے متعلق لکھا ہے۔صفیہ نے ایک بار لکھا تھا کہ:

''اختر مجھے اِس درجہ نہ چاہو۔تمہاری محبت سے آج مجھے ڈر معلوم ہو رہا ہے۔تم اپنے کو مجھے چاہنے دو۔ مجھے تمہیں چاہنے میں ہمیشہ راحت ملی ہے۔''

صفیہ کے خطوط سے جاں نثار اختر کی مالی پریشانیوں کا پتہ چلتا ہے۔چناں چہ ایک عرصے تک بھوپال سے صفیہ اُن کی مالی مدد کرتی رہیں۔اُسی درمیان شاہین پکچر میں جاں نثار اختر کو بحیثیتِ نغمہ نگار تین سو روپیے ماہانہ نوکری مل گئی۔کمپنی بند ہونے پر ملازمت ختم ہوگئی۔مختلف فلموں کے لئے تھوڑا بہت کام کیا۔یہ جاں نثار اختر کی زندگی کا سب سے پرآشوب زمانہ تھا۔صفیہ بیمار ہو کر لکھنؤ چلی گئیں۔اپنے خطوط سے اپنی بیماری کا حال بھیجتی رہیں۔جاں نثار اختر جو بھی بن پڑا صفیہ کے پاس پیسے بھیجتے رہے تا کہ علاج وقت پر ہو۔صفیہ کے بے حد اصرار کے باوجود مالی پریشانیوں کی وجہ سے وہ لکھنؤ نہ جاسکے یہاں تک کہ ۱۷ر جنوری ۱۹۵۳ء کو صفیہ کا انتقال ہوگیا۔جاں نثار کو اطلاع ہوئی لیکن اُن کے پاس سفر کے پیسے نہ تھے کسی طرح قرض لے کر وہ لکھنؤ روانہ ہوئے لیکن اُس وقت تک صفیہ منوں مٹی کے نیچے ڈھکی جا چکی تھیں۔صفیہ کی موت نے جاں نثار اختر کا سب سے بڑا نقصان کیا لیکن وہ حالات کا جواں مردی سے مقابلہ کرتے رہے اور اپنی ادبی زندگی کو اس سے متاثر نہیں ہونے دیا۔

09.04 جاں نثار اختر کی شاعری

جاں نثار اختر دَورِ جدید کے معروف ترقی پسند شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ بعض ترقی پسند شعرا نے اپنی گھن گرج اور صدائے احتجاج سے وقتی طور پر مقبولیت حاصل کی لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ہی اُن کی مقبولیت زمانے کی گرد کی موٹی چادر سے ڈھک گئی۔ جاں نثار اختر اُن ترقی پسند شعرا میں سے ہیں جنھوں نے نہ تو گھن گرج سے کام لیا اور نہ کرخت صدائے احتجاج بلند کی بلکہ اُنہوں نے ترقی پسندی میں بھی صداقت وحقیقت پسندی کو اپنا شعار بناتے ہوئے ایک الگ راہ اختیار کی۔

اُنہوں نے ہمیشہ ترقی پسند تحریک میں فیشن پرستی اور کھوکھلی نعرے بازی سے اپنے کو دور رکھا۔ ہم سبھی جانتے ہیں کہ کوئی بھی ادب خواہ شعری ہو یا نثری وہ خلا میں تخلیق نہیں ہوتا بلکہ سبھی فن پاروں پر شعرا کی زندگی کے نشیب وفراز، عصری سانحات وحادثات اور مسائلِ روزگار کا عکس ہوتا ہے۔ جاں نثار اختر کا تخلیقی سفر بھی اِن حقیقتوں سے موافقت رکھتا ہے۔ جاں نثار اختر بھی اپنے ہم عصروں کی طرح رومانیت پسند ہیں۔ اُن کی شاعری کا آغاز رومانی نظموں سے ہوتا ہے جن میں جذبات کی سرشاری تو ہے لیکن فکر کی گہرائی نہیں ہے۔ ہاں نوجوانی کا جوش اور محبت کرنے کا حوصلہ ضرور موجود ہے۔ ''سلاسل'' اور ''تارِ گریباں'' کی اکثر نظمیں اِن جذبات کی عکّاسی کرتی ہیں۔ آہستہ آہستہ جاں نثار اختر کی شاعری خارجی عوامل سے باطن کی طرف سبک روی کے ساتھ سے سفر کرتی ہے۔ اُن کی شاعری میں کہیں پیوندکاری اور کھردراہٹ نہیں بلکہ لطافت، سوز وگداز، تجربے، مشاہدے اور اثر انگیزی سے پُر ہے مثلاً چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

چند لمحوں کو تیرے آنے سے تپشِ دل نے کیا سکوں پایا
دھوپ میں گرم کوہ ساروں کی ابر کا جیسے دوڑتا سایہ

برکھا کی تو بات ہی چھوڑو چنچل ہے پُروائی بھی
جانے کس کا سبز دوپٹہ پھینک گئی ہے دھانوں پر
اُس کا کیا میں بھید بتاؤں؟ اُس کا کیا انداز کہوں؟
بات بھی میری سننا چاہے، ہاتھ بھی رکھے کانوں پر

تُو اِس قدر مجھے اپنے قریب لگتا ہے تجھے الگ سے جو سوچوں عجیب لگتا ہے
میں جب بھی اُس کے خیالوں میں کھو سا جاتا ہوں وہ خود بھی بات کرے تو برا لگے ہے مجھے

جاں نثار اختر کو بھی اپنے بعض ہم عصروں مثلاً فیضؔ احمد فیضؔ، ن۔م۔راشد، مخدومؔ محی الدین، مجازؔ، علی سردار جعفری اور ساحرؔ لدھیانوی وغیرہ کی طرح سماجی مسائل، دَبے کچلے طبقات کی مجبوریوں، بھوک، مفلسی، غربت، بیماری، سیاسی عدمِ استحکام اور معاشی نابرابری کی طرف سوچنے پر مجبور ہونا پڑا۔ یہی نہیں بلکہ جاں نثار اختر نے معاشرے کی آدھی آبادی یعنی عورت کے مسائل سے بے اعتنائی پر بھی بہت نزدیک سے غور وفکر کیا۔ اُنہیں عورت کے وجود کا اقبالؔ کی طرح ہی شدّت سے احساس ہے کہ......ع

''وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ''

چناں چہ اُن کی شاعری کا ایک بہت بڑا حصہ اُسی ہستی کے اردگرد گھومتا ہے جس کے بازوؤں کے حصار میں تمام کائنات رقصاں نظر آتی ہے۔ حالاں کہ اُنہیں بھی اِس بات کا شدّت سے احساس ہے کہ کہیں صفیہ اور خدیجہ کی سحر آگیں قربت اُنہیں ظلم و جبر کے خلاف جدوجہد سے دور نہ کردے۔ چناں چہ اُنہوں نے اپنے اِس داخلی خوف کا اظہار خدیجہ کو لکھے ہوئے خط میں اِس طرح کیا ہے:

''خدیجہ پیاری!''

میں نے اکثر محسوس کیا کہ جیسے میری طرح میری شاعری بھی تمہاری رعنائیوں میں محصور ہوکر رہ گئی ہے۔ یہ بات میں نے تم سے کبھی کہی نہیں لیکن آج ایک مختصر سی نظم میں ڈھل ہی گئی۔ اچھا نظم سنو!

مجھ کو اکثر ترے پہلو میں خیال آیا ہے　　تو کہیں مجھ سے مرا ذوقِ سفر چھین نہ لے
یہ تری زلف کی لہراتی ہوئی چھاؤں کہیں　　میرے قدموں سے مری راہ گزر چھین نہ لے
یہ تری نیم نظر کا متبسم جادو　　میرے دل سے غمِ دوراں کا اثر چھین نہ لے
یہ تری نرم لپٹتی ہوئی بانہوں کا گداز　　میرے ہاتھوں سے کہیں تیغ و سپر چھین نہ لے
یہ ترا لوچ ، یہ نرمی ، یہ لطافت ، یہ جمال　　حرفِ فن دے کے کہیں فکر و نظر چھین نہ لے
میری راتوں کے مقدّر کو سجانے والی　　شاعری سے مری ، اعلانِ سحر چھین نہ لے

نظم بہت خوب صورت ہے، مجھے خود بہت پسند آئی لیکن تم بھی پسند کرو تب ہے۔ آؤ مجھ میں زندگی کی روح پھونک دو۔ اچھا کل مفصّل خط لکھوں گا۔

تمہارا جاں نثار

۶ رفروری ۱۹۵۹ء

(ڈاکٹر شاذیہ عمیر، جاں نثار اختر کی عورت، آج کل، فروری ۲۰۱۴ء ص ۱۷)

جاں نثار اختر کی شاعری میں عورت شعور سے لاشعور تک سمائی ہوئی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اس کے بغیر وہ جینے کا تصوّر نہیں کرسکتے۔ کسی نے جاں نثار اختر کے اندر اِن اقدار کو اُن کے والد مضطر خیرآبادی کا عکس تصوّر کیا ہے۔ مضطر خیرآبادی بذاتِ خود ایک اچھے شاعر تھے اور مادرِ وطن اور عورت کی محبت کو بہت نزدیک سے محسوس کیا تھا۔ جاں نثار اختر کا عورت سے محبت کا انداز کچھ اسی طرح کا تھا جس نے عام عورت سے لے کر اپنی شریکِ حیات تک کے لئے اُنہیں زیادہ حسّاس بنا دیا۔ اُنہوں نے عورت کو ایک سایہ دار درخت کے رُوپ میں دیکھا جو نہ صرف میٹھے پھل دیتا ہے بلکہ اپنی چھاؤں میں تھکے ہوئے مسافر کو آرام کرنے کا موقع بھی دیتا ہے۔ جاں نثار اختر کے یہاں عورت نفسیاتی اعتبار سے ماں سے لے کر محبوب تک سمٹی پڑی ہے۔ ممکن ہے کہ صفیہ کی محبت اور اُن سے دوری نے اُنہیں اور حسّاس بنادیا ہو۔

چند اشعار اس کی گواہی دیتے ہیں:

ہر اک تصویر کے رنگوں میں نکہت اُس کی آوارہ　　حسین اور خوش نما اشعار شاداب اُس کے نغموں سے
غرض جب تک یہ دنیا ہے اور اِس کی خوش نمائی ہے　　ہماری زندگی پر صرف عورت کی خدائی ہے

گوری اِس سنسار میں مجھ کو ایسا تیرا روپ لگے جیسے کوئی دیپ جلا ہو گھور اندھیرے جنگل میں
مرے خلوت کدے کے رات دن یوں ہی نہیں سنورے کسی نے دھوپ بخشی ہے، کسی نے چاندنی دی ہے
اب بھی جس وقت چھلک اُٹھتی ہیں آنکھیں میری اپنا آنچل کوئی چپکے سے بڑھا دیتا ہے

جاں نثار اختر نے نظمیں، غزلیں، گیت، دوہے اور رباعیاں بھی لکھی ہیں جن میں اُن کے جذبوں کی لطافت، نرمی، شیرینی اور نغمگی گھُل مل کر ایسی فضا تیار کرتی ہے جس سے قاری مسحور ہوجاتا ہے۔ اُن کے غم کے اظہار میں بھی طرح داریاں ہیں۔ لہجے میں اچھوتا پن، لفظوں، فقروں کا برجستہ و برمحل استعمال، سادگی، تجربہ اور رسیلا پن سب کے سب اُن کی انفرادیت کی گواہی دیتے ہیں۔

اُن کی رباعیات وقطعات کا مجموعہ ''گھر آنگن'' کے نام سے جب ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا تو اس نے جاں نثار اختر کو ہمہ جہت شاعر بنا دیا۔ اس مجموعے نے اردو شعر وادب میں ایک بڑا انقلاب پیدا کر دیا۔ ہمارے معاشرے میں ازدواجی زندگی میں اور گھر کی چہار دیواری میں عورت کو جو مقام اس مجموعے کے توسط سے ملا وہ قابلِ تحسین ہے۔ ''گھر آنگن'' کی رباعیوں میں ہندوستانی تہذیب وتمدّن، ثقافت و معاشرت اور سماجی جزئیات کے تمام عکس قوسِ قزح کی طرح جلوہ فگن ہیں۔ چند رباعیاں اِس کی دلالت کے لئے کافی ہیں:

آہٹ مرے قدموں کی جو سن پائی ہے اک بجلی سی تن بدن میں لہرائی ہے
دوڑی ہے ہر اک بات کی سدھ بسرا کے روٹی جلتی، توے پہ چھوڑ آئی ہے
آنکھیں جو ملیں کچھ تیرے کاجل نے کہا اُڑتا ہوا کچھ زلف کے بادل نے کہا
وہ راز جو کہہ سکا نہ کھُل کر کوئی وہ تیرے لپٹے ہوئے آنچل نے کہا

(۱) جاں نثار اختر کے شعری مجموعے: جاں نثار اختر کا پہلا شعری مجموعہ اکتوبر ۱۹۴۲ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس شعری مجموعے کا پیش لفظ جوشؔ ملیح آبادی نے تحریر کیا تھا۔ جاں نثار کا دوسرا شعری مجموعہ ''تارِ گریباں'' کے نام سے شائع ہوا۔

''تارِ گریباں'' میں اپنے پہلے شعری مجموعے کا تذکرہ کرتے ہوئے جاں نثار اختر نے لکھا ہے کہ:

> ''سلاسل'' کا نام جوشؔ نے ''سنبل وسلاسل'' رکھا لیکن کتابت میں کہاں چوک ہوگئی کہ نام صرف ''سلاسل'' رہ گیا۔ ابھی اختر صاحب سوچ ہی رہے تھے کہ اس کی تصحیح کر دی جائے گی جب تک ایسا موقع آتا جوشؔ صاحب کا مجموعۂ کلام ''سنبل وسلاسل'' کے نام سے شائع ہو کر منظرِ عام پر آ گیا۔ شاید جوشؔ صاحب کو یہ نام خود اپنے مجموعے کے لئے زیادہ موزوں لگا ہوگا اور اُنہوں نے ہی اس مرحلے میں ''سنبل وسلاسل'' میں ترمیم کر کے اختر صاحب کے مجموعے کے لئے صرف ''سلاسل'' کروا دیا ہو ورنہ ایسا کیسے ہوسکتا تھا کہ جو نام جاں نثار اختر کے لئے خود جوشؔ طے کر رہے ہوں وہی نام اپنے مجموعے کے لئے طے کر لیں؟ جوشؔ کے لئے ایسا کرنا کچھ بعید نہ تھا۔ اختر صاحب غالباً سیدھے اور معصوم شخص تھے یا پھر یہ کہہ لیں کہ وہ ایک خالص تخلیقی فن کار تھے۔

(بحوالہ ڈاکٹر کوثر مظہری: جاں نثار اختر کی کائناتِ شاعری: آج کل، فروری ۲۰۱۴ء ص ۱۲)

یہ وہی جوشؔ ملیح آبادی ہیں جنہوں نے جاں نثار اختر کے متعلق لکھا ہے:

''اُن کا چہرہ بھی اُجلا ہے، دل بھی اُجلا ہے، ذہن بھی اُجلا ہے''

(پیش لفظ: ''سلاسل'')

یہ جاں نثار اختر کے ذہن و دماغ کا اُجلاپن ہی تھا کہ اس تبدیلی کے بعد بھی اُن کا دل میلا نہ ہوا۔ ''تارِ گریباں'' کے علاوہ ''جاوداں اور خاکِ دل'' اُن کی شعری یادگار ہیں۔ جاں نثار اختر کو اُن کے مجموعے ''خاکِ دل'' پر ۱۹۷۶ء میں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ دیا گیا۔ ان مجموعوں کے علاوہ جاں نثار اختر کی رباعیوں اور قطعات کا مجموعہ ''گھر آنگن'' کے نام سے ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔ جاں نثار اختر کی اپنے وطن سے محبت کا اٹوٹ رشتہ ''ہندوستان ہمارا'' کی نظموں سے لگایا جاسکتا ہے۔ مذکورہ فن پاروں کے علاوہ جاں نثار اختر کی جدید غزلوں کا مجموعہ ''پچھلے پہر'' کے نام سے مئی ۱۹۷۵ء میں مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نے شائع کیا۔

﴿۲﴾ جاں نثار اختر کی رومانیت: جاں نثار اختر کی شاعری میں اُن کے عہد کے بعض ترقی پسند شعرا کی طرح رومانیت کا عکس ملتا ہے لیکن پوری شاعری کو صرف رومانیت کی شاعری بھی نہیں کہہ سکتے۔ اُن کی رومانیت میں ہندوستانی پریم اور روپ، سنگار کی عکاسی ہوتی ہے۔ جاں نثار اختر کے تقریباً سبھی شعری مجموعوں میں کہیں کم اور کہیں زیادہ، کہیں خام اور کہیں پختہ رومانیت کے ثبوت ملتے ہیں۔ اُن کی غزلیں، نظمیں اور رباعیات وقطعات سبھی اِس کی گواہی دیتے ہیں مثلاً:

ہاتھوں کی ترے بُوے حنا یاد ہے اب تک   اُڑتی ہوئی وہ غازۂ رخسار کی خوشبو
گھلتی ہوئی آنکھوں میں حیا یاد ہے اب تک   وہ تجھ سے ملاقات کی پہلی شبِ رنگیں
وہ جرمِ محبت کی سزا یاد ہے اب تک   شوخی سے مِرے ہاتھ کو زلفوں میں جکڑنا

بعض معروف ترقی پسند شعرا کی طرح جاں نثار اختر بھی ادب میں افادیت اور مقصدیت کے قائل تھے لیکن اُنہوں نے ترقی پسند نظریات کی تبلیغ کے لئے اپنی شاعری میں فنی جمالیات کے عناصر کا خون نہیں ہونے دیا بلکہ اُنہوں نے دونوں اندازِ فکر کو وسعت دی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جاں نثار اختر کی رومانی شاعری کا خمیر باہر سے نہیں بلکہ اُن کے اندر سے تیار ہوا تھا۔ شادی کے بعد عشقیہ احساسات و جذبات کا عام طور سے زوال ہوجاتا ہے۔ ان احساسات کی جگہ زندگی کے تلخ حقائق لے لیتے ہیں اور محبوبہ بیوی بن کر گھر کی چاکری کرنے لگتی ہے۔ جاں نثار اختر کی پوری ازدواجی زندگی رومانیت سے بھرپور ہے اور اکثر نظمیں اُن کی محبت کا خوب صورت اور دل نشیں ثبوت پیش کرتی ہیں۔ جاں نثار اختر نے اپنی نظموں، غزلوں اور رباعیوں کے ذریعے اور صفیہ اختر نے اپنے خطوط کے ذریعے اپنے آئیڈیل کو جلا بخشی۔

آل احمد سرور نے جو جاں نثار اختر کے ہم عصروں میں رہے ہیں اُن کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ہر طرف لپکے ہیں اور ہر شعلے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہے۔ اس کے ساتھ ہاتھ اور دامن جلائے بھی ہیں۔ جاں نثار اختر نے زندگی کی رعنائیوں، ہوا کی موج، روشنی کی کرن اور خوشبو کے جھونکے کے لئے دیدہ و دل کھلے رکھے ہیں اور اس نظریے کے قائل تھے کہ:

''چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہوجانا''

(بحوالہ سیدہ جعفر تاریخِ ادبِ اردو: ج ۴، ص ۳۴۳)

جاں نثار اختر کی رومانی شاعری کا سب سے مثبت پہلو یہ ہے کہ محبت اُنہیں جینے کا حوصلہ دیتی ہے اور جدوجہد زندگی کے لئے عزم فراہم کرتی ہے۔ جاں نثار اختر کی قوتِ مشاہدہ، جمالیاتی ذوق اور منفرد اندازِ فکر نے اُن کی شاعری میں، اُن کی رومانی نظموں میں اور اُن کے محبوب کے خدوخال میں ایسا رنگ بھرا ہے کہ اُنہیں مجسّم کر دیا ہے۔

کتنے لمحوں کے حسیں نرم سبک آنچل سے — تونے بڑھ کر مرے ماتھے کا پسینہ پوچھا
چاندنی بن گئی راہوں کی کڑی دھوپ مجھے — تو مرا عزمِ جواں بن کے مرے ساتھ رہی

یا پھر یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

رُخوں کے چاند، لبوں کے گلاب مانگے ہے — بدن کی پیاس ، بدن کی شراب مانگے ہے
جو اضطراب بظاہر سکون لگتا ہے — ہر ایک شعر وہی اضطراب مانگے ہے
تمام عرصۂ ہستی دھواں دھواں ہے تو کیا — ہر ایک آنکھ محبت کا خواب مانگے ہے

یا پھر یہ دو اشعار رومانیت اور محبت کی لافانی مثال ہیں:

تیری زلفیں، تری آنکھیں، ترے ابرو، ترے لب — اب بھی مشہور ہیں دنیا میں مثالوں کی طرح
کھڑکی کی باریک جھری سے کون یہ مجھ تک آجائے — جسم چرائے، نین جھکائے، خوشبو باندھے آنچل میں

جاں نثار اختر کے مذکورہ اشعار بصری پیکر کے مرقعے کہے جاسکتے ہیں۔ اُن کی معروف رومانی نظموں میں ’’گرلس کالج کی لاری، احساس، اعترافِ جمال، آخری ملاقات، کسی کو دیکھ کر، اُداس شام اور سویا ہوا نصیب‘‘ وغیرہ بطورِ خاص شامل ہیں۔

﴿۳﴾ جاں نثار اختر کی غزلیں: اردو کا شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہوگا جس نے غزل میں طبع آزمائی نہ کی ہو۔ بعض شعرا ایسے ہیں جو اپنی نظموں کے لئے معروف و مشہور ہیں تاہم غزلیں بھی کہی ہیں۔ جاں نثار اختر اُنہی شعرا میں شامل ہیں۔ جاں نثار اختر اپنی نظموں اور رباعیوں کے لئے زیادہ مشہور ہیں لیکن اُن کی غزلیں بھی معیار میں کم نہیں ہیں۔ اُن کے سبھی مجموعوں میں کچھ نہ کچھ غزلیں شامل ہیں۔ جاں نثار اختر کے انتقال سے ایک سال قبل اُن کی غزلوں کا مجموعہ ’’پچھلے پہر‘‘ کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کی غزلوں نے ناقدینِ ادب کو جاں نثار اختر سے متعلق اپنے نظریات کو تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔ اُن غزلوں میں شاعر کا لب ولہجہ، موضوعات اور اظہارِ بیان پچھلی غزلوں کے مقابلے میں منفرد اور ممتاز تھا۔ پچھلی غزلوں میں جاں نثار اختر صرف رومانی شاعری کے قدرے مختلف زاویۂ نظر کی گواہی دیتے ہیں۔ عشق کی مختلف کیفیتوں کو شاعر نے بہت حد تک مختلف اور نکھرے ہوئے انداز میں پیش کیا ہے۔ جاں نثار کی بعض غزلوں کی پہلی قرأت پر اُن کے عشقیہ شاعر ہونے کا گمان گذرتا ہے لیکن دوسری اور تیسری قرأت قاری کو اپنا نظریہ اور طرزِ فکر بدلنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

مثالاً چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سوچو تو بڑی چیز ہے تہذیب بدن کی — ورنہ تو بدن آگ بجھانے کے لئے ہیں
آنکھوں میں جو بھر لوگے تو کانٹوں سے چبھیں گے — کچھ خواب تو پلکوں پہ سجانے کے لئے ہیں
آئے کیا کیا یاد نظر جب پڑتی اُن دالانوں پر — اُس کا کاغذ چپکا دینا گھر کے روشن دانوں پر

دل کا وہ حال ہوا ہے غمِ دوراں کے تلے جیسے اک لاش چٹانوں میں دَبا دی جائے
ہم سے پوچھو کہ غزل کیا ہے؟ غزل کا فن کیا؟ چند لفظوں میں کوئی آگ چھپا دی جائے

جاں نثار اختر کی غزلوں میں پورے عہد کے انتشار کی عکاسی ہوتی ہے۔قدم قدم پہ آدمی کا زندگی کی حقیقتوں سے تصادم نظر آتا ہے۔ ذہن ودل میں سجائے ہوئے خواب ریزہ ریزہ ہوکر بکھرتے ہیں۔بقولِ راشد انور راشد:

''جاں نثار اختر کی غزلوں میں اُن کے اپنے عہد کا انتشار قدم قدم پر نمایاں ہوتا ہے۔وہ خاموش تماشائی کی مانند تمام چیزوں کو صرف رونما ہوتے ہوئے نہیں دیکھتے بلکہ کسی بھی طرح حالات میں تبدیلی کے لئے کوشاں دکھائی دیتے ہیں۔جہاں ایسی کوئی صورت نظر آتی ہے جب وہ اپنی جدوجہد اور عملی کوششوں کے باوجود توازن اور اعتدال کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی،وہاں وہ ایسی ذہنی فضا کی تعمیر میں مصروف ہو جاتے ہیں جوان حالات سے نبرد آزما ہونے میں معاون ثابت ہو سکے۔

(راشد انور راشد''انتشارِ زمانہ کا نباض'': جاں نثار اختر بحوالہ اردو دنیا،فروری ۲۰۱۴)

ظاہر ہے کہ زندگی کی اُلجھنیں اور اُن اُلجھنوں کو سلجھانے کی تگ ودَو ہر باشعور انسان میں انتشار پیدا کرتی ہے۔جاں نثار اختر نے اس انتشار اور حزن وملال کی کیفیت کو غزل کے اشعار میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور یہی اُن کی انفرادیت ہے۔اس انفرادیت کی وجہ سے جاں نثار اختر کی غزل میں کہیں کہیں کھردرے پن کا احساس ہوتا ہے لیکن یہ کھردراپن گراں نہیں گذرتا کیوں کہ انہوں نے ضمیر کی آواز پر لبیک کہنے کی ہمت جٹائی ہے جو ہر ایک میں نہیں ہوتی۔جاں نثار اختر نے بھی اپنے ہم عصر شعرا کی طرح حُسن وعشق کے انوکھے موضوعات اور زاویہ نظر کو اشعار کا جامہ پہنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اُن کے ہر مجموعے میں وہ اشعار منفرد دکھائی دیتے ہیں۔مثال کے طور پر:

جلنے والوں کی آہیں کہاں جل سکیں اک دھواں ہے ابھی تک مکانوں کے بیچ
ساری دنیا میں غریبوں کا لہو بہتا ہے ہر زمیں مجھ کو مرے خون سے تر لگتی ہے
مار ہی ڈالے جو بے موت ، یہ دنیا وہ ہے ہم جو زندہ ہیں تو جینے کا ہنر رکھتے ہیں

جاں نثار اختر کی غزلیہ شاعری میں ذہن کا انتشار،عصری حُسن اور زمانے کا کرب پوری طرح اُجاگر ہے۔سچے جذبات کی ترجمانی، تغزل کی شیرینی اور لہجے کی انفرادیت نے اُن کی غزلوں میں ایک الگ کیفیت پیدا کردی ہے۔اُن کی غزلوں میں سوز وگداز،نرمی وطرح داری،دل کشی ورعنائی اور رجائیت کا امتزاج پایا جاتا ہے۔فیضؔ کی طرح اُن کے اشعار بھی غمِ جاناں اور غمِ دوراں کا مرکب لگتے ہیں۔جاں نثار اختر کی غزلیں رزم وبزم دونوں پہلوؤں کو اُجاگر کرتی ہیں۔اُن کے اشعار میں تصویریں متحرک نظر آتی ہیں جو قاری کو آسودگی ومسرّت کے ساتھ زندگی گذارنے کا حوصلہ فراہم کرتی ہیں۔یہ اشعار اُن کے اس حوصلے کا ثبوت پیش کرنے کے لئے کافی ہیں مثلاً:

اور تو کون ہے جو مجھ کو تسلّی دیتا ہاتھ رکھ دیتی ہیں باتیں تری دل پر اکثر
پیار کی یوں ہر بوند جلادی میں نے اپنے سینے میں جیسے کوئی جلتی ماچس ڈال دے پی کر بوتل میں
جینے کا ہمیں خود نہ ملا وقت تو کیا ہے لوگوں کو سکھاتے رہے جینے کا ہنر ہم

اب ایک آدھ قدم کا حساب کیا رکھیے　　ابھی تلک تو وہی فاصلہ لگے ہے مجھے
شرم آتی ہے کہ اُس شہر میں ہم ہیں کہ جہاں　　نہ ملے بھیک تو لاکھوں کا گذارہ ہی نہ ہو
تیرے بن رات کے ہاتھوں میں یہ تاروں کے ایاغ　　خوب صورت ہیں مگر زہر کے پیالوں کی طرح

﴿۴﴾ جاں نثار اختر کی نظمیہ شاعری: ابتدا کی نظمیہ شاعری پر اختر شیرانی کا اثر نمایاں ہے۔ بنیادی طور پر اختر شیرانی رومانی شاعر تھے اُن سے اثر قبول کرتے ہوئے جاں نثار اختر نے بھی رومانی نظمیں لکھیں۔ جاں نثار اختر کا پہلا شعری مجموعہ اکتوبر ۱۹۴۲ء میں ''سلاسل'' کے نام سے منظرِ عام پر آیا جس میں زیادہ تر نظمیں رومانی ہیں۔

احتشام حسین نے جاں نثار اختر کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اختر طالب علمی کے دَور میں بڑی دل فریب رومانی نظمیں لکھتے تھے۔ دوسرے نئے شعرا کی مانند وہ بھی انقلاب کی طرف آئے۔ وہ ترقی پسند شعرا میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں مگر کچھ لوگوں کو اُن میں اس زور کی کمی نظر آئی ہے جو سیاسی مسائل پر لکھنے کے لئے ضروری ہے۔''

جاں نثار اختر نے اپنے وارداتِ قلبی اور ذاتی زندگی کے مسائل کو اپنی نظموں میں بڑی چابک دستی سے پیش کیا ہے۔ ذاتی احساسات، معاشرتی واردات اور سیاسی وسماجی مسائل کو اُنہوں نے اس طرح پیش کیا ہے کہ ہر پڑھنے والا انہیں یا اُن حالات کو اپنی زندگی سے وابستہ سمجھنے لگتا ہے۔ حالاں کہ اُن کی نظمیں مجموعی طور پر اُن کے ہم عصروں، کیفؔی، ساحؔر، مخدومؔ، مجاؔز اور فیضؔ کی نظموں سے اعلیٰ امتیازات کی حامل نہیں ہیں لیکن جاں نثار اختر کی چند نظمیں مثلاً ''اُن کے گیت گاتا ہوں، اے اہلِ وطن!، تابِ سخن، مال ومتاع، جذبۂ بیدار، آج اور کل، اے ہم یارانِ قافلہ!، آخری مرحلہ، ستاروں کی صدا، مؤرّخ سے، فریبِ بہار، خاکِ دل، امن نامہ، بنگال و بہار، پیمانۂ سرخ، روس کو سلام، سویرا اور آخری لمحہ'' وغیرہ نظمیں انفرادیت کی حامل ضرور ہیں۔

آپ یہ جان چکے ہیں کہ جاں نثار اختر اپنی شریکِ حیات صفیہ سے مدّتوں دُور رہے۔ اپنے اِس احساس کو اُنہوں نے شادی کی سال گرہ کے موقعے پر ''۲۵ر دسمبر ۱۹۵۲ء'' کے عنوان سے صفیہ اختر کے نام لکھے گئے درج ذیل خط میں کیا ہے:

یہ ترے پیار کی خوشبو سے مہکتی ہوئی رات
اپنے سینے میں چھپائے ہوئے دل کی دھڑکن
کتنے لمحے کہ تری پیار بھری نظروں نے
کس سلیقے سے سجائی مِرے دل کی محفل
کس قرینے سے سکھایا مجھے جینے کا شعور
کتنے لمحے کہ حسیں، نرم، سبک آنچل سے
تو نے بڑھ کے مِرے ماتھے کا پسینہ پوچھا
چاندنی بن گئی راہوں کی کڑی دھوپ مجھے

اُنہی لمحوں کے گل آویز شراروں کا تجھے
گوندھ کر آج کوئی ہار پنھا دُوں آجا
چوم کر مانگ تری تجھ کو سجا دوں آجا

اس نظم کو صفیہ اختر نے اپنے لئے آخری تحفہ سمجھا۔ایک اور نظم ''خاکِ دل' اختر کی انفرادیت کو ظاہر کرتی ہے۔صفیہ کی تربت کو لکھنؤ میں چھوڑ کر جہادِ زندگانی کے لئے جب اختر کو ممبئی روانہ ہونا پڑا تو اُن کے جذبات نظم کے قالب میں یوں ڈھل گئے۔نظم سے چند اشعار:

ڈھل چکا دن اور تیری قبر پر دیر سے بیٹھا ہوا ہوں سر نگوں
روح پر طاری ہے اک پیہم سکوت اب وہ سوزِ غم نہ وہ سازِ جنوں
مستقل محسوس ہوتا ہے مجھے جیسے تیرے ساتھ میں بھی دفن ہوں

صفیہ کی یاد اور شدید کرب میں انتہائی جذباتی اندازِ فکر میں لکھی ہوئی ایک نظم ''خاموش آواز'' بھی ہے۔یہ منفرد نظم صفیہ کے انتقال کے ایک سال بعد ۱۹۵۴ء میں لکھی گئی۔اس نظم کو پڑھنے والا ہر قاری اپنے اندر جاں نثار اختر کے جذبات واحساسات کو محسوس کرتا ہے۔

نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں:

کتنے دن میں آئے ہو ساتھی! میرے سوتے بھاگ جگانے
مجھ سے الگ اِس ایک برس میں کیا کیا بیتی تم پہ نہ جانے
دیکھو کتنے تھک سے گئے ہو کتنی تھکن آنکھوں میں گُھلی ہے
آؤ تمہارے واسطے ساتھی! اب بھی مری آغوش کھلی ہے
اتنے دن کے بعد کہیں تم! آئے ہو ساجن! میرے دوارے
آج اندھیرے انگنا مورے ناچ اُٹھے ہیں چاند ستارے
آؤ میں تم سے رُوٹھ سی جاؤں آؤ مجھے تم ہنس کے منالو
مجھ میں سچ مچ جان نہیں ہے آؤ مجھے ہاتھوں پہ اُٹھالو

جاں نثار اختر نے رومانی اور جذباتی نظموں کے علاوہ انقلابی،تاریخی،سیاسی اور انسان دوستی سے متعلق بھی نظمیں کہی ہیں۔ان موضوعات پر لکھی جانے والی نظموں میں ''روس کو سلام،اسٹالن،مؤرّخ سے،ستاروں کی صدا،ریاست اور دانائے راز'' وغیرہ خاص ہیں۔ان نظموں میں سیاسی شعور،قومی ہم دردی،تاریخی پس منظر،حُبُّ الوطنی اور جذبۂ انسانیت وغیرہ کارفرما نظر آتا ہے۔وہ سیاسی وانقلابی نظموں میں ترقی پسند تحریک کے مبلغ کم اور انسان دوست زیادہ نظر آتے ہیں۔ان میں جذبے کی صداقت ہر جگہ کارفرما ہے۔

جاں نثار اختر کو اپنی نظموں کے تئیں یہ احساس تھا کہ گردشِ ایّام کے ساتھ ساتھ عوام ہر اُس ادب کو رَد کر دیتے ہیں جو سیاسی سوجھ بوجھ عطا کرے لیکن جمالیاتی تسکین دینے سے قاصر ہو۔اُن کی نظموں میں مرقع نگاری،منظر نگاری اور تاریخی شعور کے اعلیٰ مرقعے دیکھنے کو ملتے ہیں۔اُن کی ایک نظم ''ہماری تاریخ'' بہت ہی انفرادیت کی حامل ہے۔صرف دو بند مذکورہ حقائق کی صداقت کے لئے کافی ہیں۔

ملاحظہ ہوں:

اے وطن! ہم تری تاریخ لکھیں گے پھر سے — تیری تاریخ ہے دل جوئی و دل داری کی
تیری تاریخ محبت کی ، وفا کی تاریخ — تیری تاریخ اُخوّت کی ، روا داری کی
تیری تاریخ ہے قرآن کا ، گیتا کا ورق — آشتی ، امن ، اہنسا کے اصولوں کا سبق
دہر سے اپنا مقابل کوئی اب تک نہ اُٹھا — کوئی گوتم ، کوئی چشتی، کوئی نانک نہ اُٹھا
آج آزاد ہیں ہم ، ذہن ہمارا آزاد — تنگ جذبات کے گھیروں سے نکل آئے ہیں
جو فرنگی کی سیاست نے کبھی بوئے تھے — ان تعصّب کے اندھیروں سے نکل آئے ہیں
ایک ہے اپنا وطن ، ایک زمیں ، ایک ہیں ہم — ایک ہے فکر وعمل ، ایک یقیں ، ایک ہیں ہم
کون کہتا ہے کہ ہم ایک نہیں ، ایک ہیں ہم

09.05 نظم ''روشنیاں''متن

آج بھی کتنی اَن گنت شمعیں
میرے سینے میں جھلملاتی ہیں
کتنے عارض کی جھلکیاں اب تک
دل میں سیمیں ورق لُٹاتی ہیں
کتنے ہیرا تراش جسموں کی
بجلیاں دل میں کوند جاتی ہیں
کتنی تاروں سے خوش نما آنکھیں
میری آنکھوں میں مسکراتی ہیں
کتنے ہونٹوں کی گل فشاں آنچیں
میرے ہونٹوں میں سنسناتی ہیں
کتنی شب تاب ریشمی زلفیں
میرے بازو پہ سرسراتی ہیں
کتنی خوش رنگ موتیوں سے بھری
بالیاں دل میں ٹمٹماتی ہیں
کتنی گوری کلائیوں کی لویں
دل کے گوشوں میں جگمگاتی ہیں

کتنی رنگیں ہتھیلیاں چھپ کر
دھیمے دھیمے کنول جلاتی ہیں
کتنی آنچل سے پھوٹتی کرنیں
میرے پہلو میں رسمساتی ہیں
کتنی پایل کی شوخ جھنکاریں
دل میں چنگاریاں اُڑاتی ہیں
کتنی انگڑائیاں دھنک بن کر
خود اُبھرتی ہیں، ٹوٹ جاتی ہیں
کتنی گل پوش نقرئی بانہیں
دل کو حلقے میں لے کے گاتی ہیں
آج بھی کتنی اَن گنت شمعیں
میرے سینے میں جھلملاتی ہیں
اپنے اس جلوہ گر تصوّر کی
جاں فزا دل کشی سے زندہ ہوں
اُنھی بیتے جوان لمحوں کی
شوخ تابندگی سے زندہ ہوں
یہی یادوں کی روشنی تو ہے
آج جس روشنی سے زندہ ہوں
''آؤ'' میں تم سے اعتراف کروں
میں اِسی شاعری سے زندہ ہوں

09.06 نظم ''روشنیاں'' تجزیہ

''روشنیاں'' جاں نثار اختر کی معروف نظموں میں سے ایک ہے۔ جاں نثار اختر نے بہت سی رومانی نظمیں کہی ہیں جن میں محبت و جوانی کے مختلف طرح کے جذبات کی عکاسی کی گئی ہے مگر ''روشنیاں'' ایک رومانی فضا میں لکھی گئی نظم ہوتے ہوئے بھی شاعر کے گذرے ہوئے ایّام کی یاد تازہ کرتی ہے اور جوانی کے جذبات کی گواہی دیتی ہے۔ جاں نثار اختر کی بہت سی ایسی نظمیں ہیں جن میں ماضی اور بچپن کی یادیں ہیں۔ ان نظموں میں ایسے بہت سے اشعار ملتے ہیں جو ماضی کے وسیع تر مناظر کو سمیٹ کر یکجا کر دیتے ہیں۔ روشنیاں میں بھی ماضی کے نقوش اور وارداتِ قلبی صفحۂ قرطاس پر نمایاں ہوگئے ہیں۔ عہدِ جوانی اور اس کی یادیں ماضی کے جھروکے سے نکل کر شاعر کے سامنے رقص کرنے لگتی ہیں۔ جوانی کی وہ ساری یادیں، وہ سارے تصوّرات ایک ایک کر کے سامنے آ کر کھڑے ہوتے ہیں۔

اس کے محبوب کا ہیرا تراش جسم، خوش نما آنکھیں ، ریشمی زلفیں، موتیوں سے بھری بالیاں، رنگین ہتھیلیاں، چمکتے آنچل، دمکتی پیشانیاں، دہکتے ہونٹ، پائل کی جھنکاریں، قوسِ قزح بنانے والی انگڑائیاں اور ساری ادائیں یاد آتی ہیں۔ ماضی کے وہ سارے نقوش، وہ ساری یادیں شاعر نے اپنے دل میں آگ کی طرح چھپا رکھی ہیں جو اندر ہی اندر اس کو جلا رہی ہیں۔ جلنے پر روشنی بھی ہو رہی ہے اور تپش بھی محسوس ہو رہی ہے۔ گذرے ہوئے لمحوں کے احساس کی شدّت نے اسے اپنے حصار میں لے رکھا ہے۔ جاں نثار اختر کی غزلوں میں بھی عہدِ ماضی کی یادوں کے حصار دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی تو وہ ان کو جھٹک دینا چاہتے ہیں اور کبھی ان کو سجائے رکھنا چاہتے ہیں مثلاً:

اسی سبب سے ہیں شاید عذاب جتنے ہیں
جھٹک کے پھینک دو پلکوں پہ خواب جتنے ہیں

اب شاعر کے پاس صرف خواب اور یادیں ہی ہیں جن کے سہارے باقی ماندہ زندگی بسر کرنا چاہتا ہے ؎

اب دل کے کہاں گرد وہ مہتاب رہے
پلکوں پہ سلگتے ہوئے کچھ خواب رہے

لیکن پھر بھی وہ اُن خوابوں کو پلکوں پر سجانا چاہتا ہے کیوں کہ اس کے خواب سچ ثابت نہ ہونے کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں چبھ رہے ہیں۔ آنکھوں کو اشک بار کرنے کے باوجود وہ انہیں اپنی پلکوں پر سجائے رکھنا چاہتا ہے ؎

آنکھوں میں جو بھر لوگے تو کانٹے سے چبھیں گے
کچھ خواب تو پلکوں پہ سجانے کے لئے ہیں

زندگی کی کش مکش نے شاعر کے ذہن میں انتشار پیدا کر دیا ہے لیکن عہدِ جوانی کی جلوہ گری، جانِ غزل کی دل کشی اور بیتے ہوئے جوان لمحوں سے شاعر زندگی کی تابندگی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اُنہی یادوں سے روشنی حاصل کرنا چاہتا ہے

اُنہی بیتے جوان لمحوں کی
شوخ تابندگی سے زندہ ہوں
یہی یادوں کی روشنی تو ہے
آج جس روشنی سے زندہ ہوں

دیگر رومانی شعرا کی طرح جاں نثار نے بھی اپنی ذاتی زندگی اور واردات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے لیکن اس چابک دستی سے کہ اس کی ذاتی زندگی کے نقوش اور وارداتِ قلبی دوسرے شخص کو بھی اپنے ذاتی محسوسات لگنے لگتے ہیں۔ اس نظم میں زندگی کے نشاط انگیز لمحات اور رومان آمیز آہنگ کو اس ہوش یاری سے پیش کیا ہے کہ قاری اور سامع کو اپنے گذرے ہوئے ایّام کی یاد آ جاتی ہے۔ آخر میں شاعر اعتراف کرنا چاہتا ہے کہ صرف گذرے ہوئے لمحات کے غموں کا بوجھ ڈھونے میں کوئی فائدہ نہیں بلکہ اُنہی لمحوں اور یادوں کے سہارے، اُنہی کی روشنی سے اپنی زندگی کے باقی دن منوّر کریں کیوں کہ جوانی کی وہی یادیں شعر کہنے کی قوت عطا کرتی ہیں گویا شاعر کی شاعری اُنہی یادوں کی مرہونِ منّت ہے اور اُسے شاعری کی وجہ سے حیاتِ جاوداں مل گئی ہے۔

09.07 نظم ’’زندگی کے موڑ پر‘‘ متن

ہنس رہی ہے روبرو رنگیں بہار
کتنے نظارے ہیں جنت درکنار
راستہ تکتی ہے کب سے رہ گذار
مُڑ کے لیکن دیکھتا ہوں بار بار

آ گیا ہوں دُور کس کو چھوڑ کر
چپ کھڑا ہوں زندگی کے موڑ پر
جانے کس کا ہے ابھی تک انتظار

کتنے ہونٹوں پر ہے عہدِ دل نشیں
منتظر ہیں کتنے آغوشِ حسیں
بڑھ رہے ہیں کتنے دستِ نازنیں
مجھ کو لیکن ہے نہ جانے کیا یقیں

رہ گئی ہے جَم کے اک جانب نظر
چپ کھڑا ہوں زندگی کے موڑ پر
جانے کس کا ہے ابھی تک انتظار

ہو چکی ہیں گل اُفق کی سرخیاں
تیرگی ہے کارواں در کارواں
بجھ گیا ہو جیسے نظروں میں جہاں
کچھ نہیں معلوم، جانا ہے کہاں؟

ظلمتوں میں کھو گئی ہے رہ گذر
چپ کھڑا ہوں زندگی کے موڑ پر
جانے کس کا ہے ابھی تک انتظار

09.08 نظم ’’زندگی کے موڑ پر‘‘ تجزیہ

جاں نثار اختر کی بہترین نظموں میں سے ایک نظم ’’زندگی کے موڑ پر‘‘ بھی ہے۔ یادِ ماضی میں لکھی گئی کئی نظمیں ہیں جن میں جاں نثار اختر کے شعور کی پختگی کا عکس ملتا ہے مثلاً ’’خاکِ دل، حسین آگ، اور خاموش آواز‘‘ وغیرہ۔ شاعری یا کوئی بھی ادب اور فنونِ لطیفہ خلا میں تخلیق نہیں ہوتا بلکہ اس کے پسِ پشت کوئی نہ کوئی محرک ہوتا ہے جو شاعر یا فن کار کی تخلیق کو جلا بخشتا ہے۔ جاں نثار اختر کے شان دار ماضی، علمی

گھرانے، ادبی وراثت اور سب سے زیادہ صفیہ جیسی رفیقۂ حیات نے اُن کے فکری میلان کو وسعت دی۔ظاہر ہے کہ اگر کسی حسّاس شاعر سے اُس کے شان دار ماضی کا اثاثہ چھن جائے تو اُس کے پاس ماضی کے اُن بہترین لمحات کی یاد کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہتا اور زندگی کے باقی ایّام گذارنے کے لئے اُسے ماضی کا سہارالینا پڑتا ہے۔نظم ''زندگی کے موڑ پر'' جاں نثار اختر کے اُنہی گذرے ایّام کی عکاسی کرتی ہے۔

جاں نثار اختر کی شاعری میں حُزن وملال، جاں نثاری اور تڑپ کے پیچھے اُن کی رفیقۂ حیات (جو نہ صرف بیوی تھیں بلکہ زندگی بھر اُن کی محبوبہ بھی رہیں) کا بے وقت انتقال ہے۔ یہ دونوں تقریباً پوری زندگی جدائی کے کرب سے دوچار رہے لیکن یہ کرب، یہ جدائی اور محبوب کا فراق ہی جاں نثار کی شاعری کے لئے فالِ نیک ثابت ہوا کیوں کہ اُنہوں نے اس کو موضوعِ سخن بنا کر مقبولیت حاصل کی۔شاعر اپنی محبوبہ کی جدائی میں (جو اَب ابدی ہے) جاں کاہ تنہائی سے دوچار ہے اور اس کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہورہا ہے کہ اب وہ آگے کیا کرے؟ آئندہ کی زندگی کو کیسے گذارے؟ حالاں کہ دنیا میں اب بھی رنگینیاں ہیں جو اُسے اپنی جانب متوجہ کررہی ہیں، بلا رہی ہیں، للچارہی ہیں۔

نظم کے آغاز سے لگتا ہے کہ شاعر سوچتے سوچتے یک بہ یک درمیان سے اپنی باتیں کہنے لگتا ہے مثلاً:

ہنس رہی ہے روبرو رنگیں بہار
کتنے نظارے ہیں جنت در کنار
راستہ تکتی ہے کب سے رہ گذار
مُڑ کے لیکن دیکھتا ہوں بار بار
آ گیا ہوں دُور کس کو چھوڑ کر
چپ کھڑا ہوں زندگی کے موڑ پر
جانے کس کا ہے ابھی تک انتظار

ظاہر ہے کہ شاعر کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے والی نہیں ہیں کیوں کہ اُس کا محبوب اُسے چھوڑ کر دُور بہت دور جاچکا ہے لیکن جذبات کی رَو بتا رہی ہے کہ وہ اُسی موڑ پر کھڑے ہو کر اپنے محبوب کا انتظار کررہا ہے اور شاید کرتا رہے گا۔شاعر کے سامنے اپنی زندگی کو رنگیں بنانے کے لئے بہت سارے راستے موجود ہیں، بہت سے مناظر اُسے اپنی جانب متوجہ کررہے ہیں لیکن شاعر کی توجہ اُن کی جانب مبذول نہیں ہورہی ہے بلکہ اُسے اپنے اُسی محبوب سے ملنے کا اب تک انتظار ہے۔شاعر صبح سے شام تک اور شام کی سرخیوں کے دُھندلانے اور گھپ اندھیرا ہونے تک اپنے محبوب کا بے چینی سے انتظار کرتا ہے۔وہ ایسے دوراہے پر کھڑا ہے جہاں سے اُسے یہ معلوم نہیں کہ جانا کہاں ہے؟ وہ راستہ جن پر چل کر وہ اپنے محبوب کی گلی تک جاتا تھا وہ دور کہیں اندھیرے میں کھو گیا ہے جس کا ملنا اب دشوار ہے۔ وہ اِسی پس وپیش میں ہے کہ وہ کہاں جائے؟ کیا کرے؟ وہ ابھی تک اُسی محبوب کی یادوں کو سجائے ہوئے اُس کا منتظر ہے۔

''زندگی کے موڑ پر'' نظم میں شریکِ حیات سے مراسم اور محبت کی کیفیات کا پرتو رنج وغم کے ساتھ رومانی اُسلوب میں ڈھل گیا ہے۔ بار بار یہ کہنا کہ ''چپ کھڑا ہوں زندگی کے موڑ پر'' اور ''کچھ نہیں معلوم جانا ہے کہاں؟'' سے شاعر کے رنج وغم کے ساتھ ساتھ اُس کی اُلجھن کی عکاسی ہوتی ہے۔جاں نثار اختر نے اِس نظم میں اپنی تخلیقی ہنرمندی کو بروے کار لانے کی کوشش کی ہے۔نظم میں روانی، آہنگ اور نغمگی ہے جس کی وجہ سے اِس نظم کو جاں نثار اختر کی مترنّم نظموں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

09.09 خلاصہ

اس اکائی میں آپ نے جدید نظم نگاری کے ایک معروف شاعر جاں نثار اختر کے متعلق جان کاری حاصل کی۔ جاں نثار اختر کا شمار ترقی پسند شعرا کی پہلی صف میں کیا جاتا ہے۔ اُن کی پیدائش ۱۸؍فروری ۱۹۱۴ء کو گوالیار، مدھیہ پردیش میں ہوئی۔ جاں نثار اختر کا آبائی وطن خیرآباد، اُتر پردیش میں تھا۔ اُن کے والد کا نام سید افتخار حسین مضطؔر تھا جنھیں دنیاے ادب مضطؔر خیرآبادی کے نام سے جانتی ہے۔ جاں نثار اختر کی ابتدائی تعلیم گوالیار میں ہوئی۔ اُنہوں نے اعلیٰ تعلیم علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے حاصل کی۔ دورانِ تعلیم ہی اُن کا انتخاب وکٹوریہ کالج گوالیار میں بحیثیتِ لیکچرار ہو گیا۔

جاں نثار اختر نہایت سادگی پسند طبیعت کے انسان تھے۔ اُن کی باتوں میں نرمی، شگفتگی اور طرزِ زندگی میں قناعت پسندی دیکھی جا سکتی تھی۔ جاں نثار اختر کی شادی معروف و مشہور ترقی پسند شاعر اسرار الحق مجاؔز کی سگی بہن صفیہ سراج الحق سے ۲۵؍دسمبر ۱۹۴۳ء کو ہوئی۔ شادی کے بعد ملازمت کی مجبوری کی وجہ سے صفیہ کو علی گڑھ اور جاں نثار اختر کو گوالیار میں رہنا پڑا۔ صفیہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے گرلز کالج میں اقتصادیات کی لیکچرار تھیں۔ جاں نثار اختر کا پہلا شعری مجموعہ ''سلاسل'' کے نام سے ۱۹۴۲ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اُن کا دوسرا شعری مجموعہ ''تارِ گریباں'' ہے۔ جاں نثار اختر کے شعری مجموعے ''خاکِ دل'' پر ۱۹۷۶ء میں سویت لینڈ نہرو ایوارڈ دیا گیا۔ اُن کی رباعیوں اور قطعات کا مجموعہ ''گھر آنگن'' کے نام سے ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔ جاں نثار اختر نے اردو شاعری کے تین سَو سال کا انتخاب دو جلدوں میں ''ہندوستان ہمارا'' کے نام سے شائع کیا۔

جاں نثار اختر کی شاعری میں اُن کی ذاتی زندگی اور عصری حالات کی کش مکش کی عکاسی ملتی ہے۔ اُنہوں نے تقریباً ڈیڑھ سَو فلموں کے لئے نغمے لکھے۔ جن میں ''یہ دل اور اُن کی نگاہوں کے سائے، اے دلِ ناداں!، غریب جان کے ہم کو نہ تم مٹا دینا'' وغیرہ معروف و مشہور نغمے ہیں۔ اُنہوں نے لکھنوی تہذیب کی عکاسی کرنے والی فلم ''بہو بیگم'' کو پروڈیوس بھی کیا۔ جاں نثار اختر ابتدا میں رومانیت سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اُن کی شاعری میں پختگی کا ثبوت ملنے لگتا ہے۔ نظمیں ہو یا غزلیں دونوں کے اشعار میں زندگی کی کش مکش نظر آتی ہے۔

جاں نثار اختر کی رومانی شاعری ہو یا وطنی یا تہذیبی، ہر جگہ زندگی جینے کا مثبت پہلو نمایاں ہے۔ محبت کے جذبے سے اُنہوں نے جینے کا حوصلہ حاصل کیا ہے اور اس جذبے کی سرشاری سے اپنے قاری کو بھی روشناس کرانا چاہتے ہیں۔ جاں نثار اختر کی اہلیہ صفیہ اختر کا انتقال اُن کی شاعری کا اہم موڑ مانا جاتا ہے۔ صفیہ اختر کی یاد میں لکھی گئی نظم ۲۵؍دسمبر ۱۹۵۲ء ''خاکِ دل اور خاموش آواز'' انتہائی جذباتی انداز میں لکھی گئی منفرد انداز کی نظمیں ہیں۔ اُن کی دیگر مشہور نظموں میں ''روس کو سلام، اسٹالن، مؤرّخ سے، ستاروں کو سلام، ریاست اور داناے راز، ہماری تاریخ، روشنیاں اور زندگی کے موڑ پر'' وغیرہ ہیں۔ جاں نثار اختر کا انتقال ۱۸؍اگست ۱۹۷۶ء کو ہوا۔

09.10 فرہنگ

اعتدال	:	نہ کمی نہ زیادتی، درمیانی درجہ، میانہ روی	رجائیت	:	آرزو سے پراُمید
انتشار	:	گھبراہٹ، پریشانی، تردد، فکر	رَزم	:	جنگ، معرکہ
پیوندکاری	:	کپڑے میں جوڑ لگانا، ایک درخت کی شاخ کا اسی قسم کے دوسرے درخت کی شاخ میں قلم لگانا	رعنائی	:	خودآرائی، دورنگی چالاکی
			سلاسل	:	سلسلہ کی جمع، بیڑیاں، زنجیریں، کڑیاں
			عارض	:	رخسار، گال
تخریب	:	تباہی، بربادی	فرنگی	:	یوروپی، انگریز
جاں فزا	:	فرحت انگیز، دل خوش کرنے والا	گھن گرج	:	بجلی کی کڑک، زور کی کڑک، نہایت شوروغل
جاوداں	:	ہمیشہ، سدا	محصور	:	گھرا ہوا، روکا ہوا
حزن وملال	:	افسوس، غم	مردم خیز	:	وہ مقام جہاں قابل اور بہادر لوگ پیدا ہوں
خدوخال	:	شکل وصورت، چہرہ مہرہ	نقرئی	:	نقرہ سے متعلق، چاندی کا، چاندی جیسا سفید
خمیر	:	مزاج، طبیعت	نووارِد	:	نیا نیا آنے والا، ابھی ابھی آیا ہوا

09.11 سوالات

سوال نمبر۱ : جاں نثار اختر کی شخصیت اور ازدواجی زندگی پر اظہارِ خیال کیجیے۔

سوال نمبر۳ : جاں نثار اختر کی شاعری کو گھر آنگن کی شاعری کہنا کس حد تک درست ہے؟

سوال نمبر۴ جاں نثار اختر کی تعلیمی زندگی کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۵ : جاں نثار اختر کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب کی عکاسی کس حد تک پائی جاتی ہے؟۔

سوال نمبر۶ : جاں نثار اختر کو شاعری وراثت میں ملی تھی۔ اِس بات میں کتنی سچائی ہے؟

09.12 حوالہ جاتی کتب

۱۔ پچھلے پہر (غزلوں کا مجموعہ) از مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۱۹۷۵ء

۲۔ حیات وفن از جاں نثار اختر

۳۔ تاریخ ادبِ اردو، جلد چہارم از سیدہ جعفر

۴۔ جاں نثار اختر اور شاعر از آفاق حسین صدیقی

اکائی 10 : اختر الایمان ’’یادیں‘‘

ساخت :

10.01 : اغراض ومقاصد
10.02 : تمہید
10.03 : اختر الایمان کے حالاتِ زندگی
10.04 : اختر الایمان کی نظم نگاری
10.05 : نظم ’’یادیں‘‘ متن
10.06 : نظم ’’یادیں‘‘ تجزیہ
10.07 : خلاصہ
10.08 : فرہنگ
10.09 : سوالات
10.10 : حوالہ جاتی کتب

10.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مقصد آپ کو اردو ادب کے معروف نظم گو شاعر اختر الایمان کی نظم نگاری کی خصوصیات اور ان کی شاہ کار نظم ’’یادیں‘‘ سے متعارف کروانا ہے۔ اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ اختر الایمان کے مختصر حالاتِ زندگی بیان کر سکیں۔ اختر الایمان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈال سکیں۔ اختر الایمان کی نظم نگاری کی امتیازی خصوصیات کی نشان دہی کر سکیں اور اختر الایمان کی نظم ’’یادیں‘‘ کا خلاصہ بیان کر سکیں۔

10.02 تمہید

آپ نے اردو میں نظم نگاری کے آغاز وارتقا کا مطالعہ کیا ہوگا۔ اختر الایمان اُس ارتقا کی ایک اہم کڑی ہیں۔ اُنہوں نے اردو نظم میں اپنی اختراعِ ذہنی اور تخلیقی صلاحیتوں سے بیش بہا اضافے کیے ہیں۔ اس اکائی میں ہم اُن کی حیات اور ادبی خدمات سے متعلق معلومات حاصل کریں گے۔ اختر الایمان کی نظم نگاری کی امتیازی خصوصیات پر گفتگو کریں گے جن کے سبب اُنہیں اردو نظم نگاری میں ایک خاص مقام ومرتبہ حاصل ہے۔ ساتھ ہی ہم اختر الایمان کی مشہور نظم ’’یادیں‘‘ کا مطالعہ اور تجزیہ کریں گے جس سے نظم کی تفہیم اور اس کی فنی خصوصیات کو سمجھنے میں سہولت ہوگی۔

10.03 اخترالایمان کے حالاتِ زندگی

اخترالایمان کی پیدائش ۱۲/نومبر ۱۹۱۵ء کو ایک چھوٹے سے قصبے پتھرگنج، نجیب آباد، ضلع بجنور، اُتّر پردیش میں اُن کے ننھیال میں ہوئی۔ اُن کے والد کا نام فتح محمد اور والدہ کا نام سلیمن تھا۔ والد حافظِ قرآن تھے۔ عربی، فارسی اور ہندی میں دست رَس رکھتے تھے اور ساتھ ہی اُنھوں نے طب کی بھی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ بہت ذہین لیکن ضدی انسان تھے۔ امامت کا پیشہ اختیار کیا۔ کہیں مستقل قیام نہیں کیا۔ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کوچ کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے پورے خاندان کو خانہ بدوشوں کی سی زندگی گزارنی پڑتی تھی۔ اُن کی والدہ ایک سادہ لوح اور گھریلو خاتون تھیں۔ اخترالایمان کے تین بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ اُن کے دادا کا نام اقبال راؤ تھا۔

اخترالایمان کے بزرگ اپنے آپ کو راج پُوت کہتے تھے۔ اخترالایمان نے بچپن ہی سے زندگی کے نشیب وفراز دیکھے۔ والدین کے اَن بن اور دُوری اختیار کرنے کے سبب یتیم خانے میں رہ کر تعلیم حاصل کی۔ زبردستی سے کرائی گئی شادی کو نباہ نہ سکے اور طلاق لے لیا۔ ریڈیو اسٹیشن کی نوکری سے اپنی صاف گوئی، بے باکی اور ناعاقبت اندیشی کے سبب نکال دیے گئے۔ فلمی دنیا سے وابستگی میں دھوکے کھائے۔ لوگوں نے کام تو لیا لیکن کبھی اجرت نہیں دی نہ کبھی اُن کی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ اپنی زندگی سے جڑی اِن تمام باتوں اور واقعات کا ذکر اُنھوں نے اپنی خودنوشت سوانح ''اِس آباد خرابے میں'' بڑے مؤثر انداز میں کیا ہے۔

ابتدا میں اخترالایمان کو کمباسی اور اس کے بعد سگھ مدرسے میں داخل کرایا گیا جو ایک یتیم خانہ تھا۔ اُن کے چچا اُن کے والدین سے بہتر پرورش کا یقین دلا کر اُنھیں اپنے ہمراہ دہلی لے گئے اور وہاں یتیم خانہ مؤیدالاسلام میں داخل کرا دیا۔ یتیم خانے سے منسلک ایک اسکول بھی تھا جہاں کے اساتذہ عبدالصمد اور عبدالواحد نے اُن کی ذہنی تربیت میں اہم رول ادا کیا۔ دونوں اخترالایمان کی تحریری وتقریری صلاحیتوں کی ستائش اور ہمت افزائی کیا کرتے تھے۔ اردو کے مشہور ادیب خورشیدالاسلام بھی اُس یتیم خانے میں اخترالایمان کے ساتھیوں میں تھے۔ یہاں اُنھوں نے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۴ء تک کا عرصہ گزارا اور آٹھویں جماعت پاس کر کے وہاں سے نکلے اور ۱۹۳۸ء میں فتح پور مسلم ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ یہاں بھی ایک استاد محمد غوث نے اُن کی صلاحیتوں کو پہچانا اور اُنھیں اسکول میگزین کا مدیر بنا دیا۔

اخترالایمان نے اپنے شعری سفر کا آغاز غزل سے کیا لیکن جلد ہی نظم گوئی کی طرف مائل ہو گئے اور طالب علمی ہی کے زمانے میں نظم ''گورِغریباں'' لکھی جو اسکول میگزین میں شائع ہوئی۔ اس نظم کی خوب پذیرائی ہوئی۔ اسکول کی تعلیم مکمل کر کے اخترالایمان نے اینگلو عربک کالج دلّی میں داخلہ لیا اور غیر تدریسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے ہوئے مسلم اسٹوڈینٹس فیڈریشن کے جوائنٹ سکریٹری بن گئے۔ دوسری جانب اُنھیں ان سرگرمیوں کا خمیازہ بھی اُٹھانا پڑا۔

اخترالایمان یہیں سے ایم۔اے بھی کرنا چاہتے تھے لیکن پرنسپل نے انھیں داخلہ نہیں دیا۔ اسی زمانے میں ساغر نظامی کی دعوت پر ۱۹۴۱ء میں ''ایشیا'' کی ادارت کی ذمہ داری قبول کی اور میرٹھ چلے گئے۔ میرٹھ یونی ورسٹی میں ایم۔اے فارسی میں داخلہ لیا لیکن کچھ ہی دنوں بعد دہلی واپس آ گئے۔ دہلی میں کچھ عرصہ سپلائی ڈپارٹمنٹ میں ملازمت کی اور پھر دہلی ریڈیو اسٹیشن میں ملازمت مل گئی لیکن جلد ہی یہ نوکری بھی ہاتھ سے چلی گئی۔ علی گڑھ میں ایم۔اے اردو میں داخلہ لیا جہاں رشید احمد صدیقی اور شاہد احمد دہلوی نے سرپرستی کی۔ پہلے سال امتیازی کامیابی حاصل کی لیکن معاشی مشکلات کے پیشِ نظر تعلیمی سلسلہ ترک کر دیا۔

۱۹۴۴ء میں اختر الایمان کی زندگی میں ایک اہم موڑ آیا۔ اُنہوں نے حیدر آباد اردو کانفرس میں شرکت کی اور حیدر آباد سے پونہ روانہ ہوئے۔ اس دوران ان کا شعری مجموعہ ''گرداب'' شائع ہو چکا تھا اور وہ ادبی حلقوں میں معروف ہو چکے تھے۔ پونے کے شالیمار اسٹوڈیو میں اختر الایمان ڈبلیو زیڈ سے ملے جنہوں نے اختر الایمان کو فلموں کے لئے کہانیاں لکھنے کا مشورہ دیا اور اس طرح اختر الایمان فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے۔ اختر الایمان کی پہلی شادی ۱۹۳۹ء میں والدہ کے دباؤ میں ایک دیہاتی لڑکی سے ہوئی اور یہ شادی بہت دنوں تک نہیں چلی اور اُن کا طلاق ہو گیا۔ ۳۰ رمئی ۱۹۴۷ء کے ہنگامی دور میں اُن کی دوسری شادی سلطانہ منصور سے ہوئی۔ ابھی رخصتی بھی نہیں ہوئی تھی کہ تقسیمِ ہند کے بعد سلطانہ کے افرادِ خاندان پاکستان ہجرت کر گئے اور سلطانہ اختر الایمان کے پاس ممبئی آ گئیں۔

سلطانہ ایمان سے اختر الایمان کی تین لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے۔ انہوں نے سبھی کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ ان کی بڑی لڑکی شہلا کی شادی معروف اداکار امجد خان سے ہوئی۔ بیٹے رامش ایمان کو فوٹو گرافی کا شوق تھا اور دونوں بیٹیوں اسما اور رخشندہ نے بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ممبئی میں فلمی دنیا سے وابستگی کے زمانے میں اختر الایمان زندگی کی تگ و دو سے جوجھتے رہے۔ کبھی اپنی طبیعت کی ناسازی کے سبب تو کبھی دوسروں کی ریاکاری کی وجہ سے اُنہیں اکثر معاشی مشکلات درپیش رہیں۔ انہوں نے ممبئی میں اپنے ۵۰ رسالہ قیام کے دوران تقریباً ۱۰۰ رفلموں کے لئے منظرنامے (Screen play) اور مکالمے (Dialogues) لکھے۔ جن میں مغلِ اعظم، وقت، قانون، نغمہ، رفتار، زندگی اور طوفان، آدمی، مجرم، شبنم، ضمیر اور انسان جیسی مشہور فلمیں شامل ہیں۔

اختر الایمان نے مختلف ممالک کی سیر کی۔ مشاعروں، سیمیناروں اور فلم بندی کی غرض سے ملک اور بیرونِ ملک کے اسفار کیے۔ پہلی بار ۱۹۷۶ء میں بیروت میں ایفرو ایشائی کانفرس میں شرکت کے لئے سجاد ظہیر اور ملک راج آنند کے ہم راہ سفر کیا۔ اس دوران دمشق، ماسکو، لندن، پیرس اور قاہرہ ہوتے ہوئے ہندوستان واپس آئے۔ فلم ''چاندی سونا'' کی فلم بندی کے لئے ماریشس گئے۔ فلم ''سفاری'' کے لئے کینیا، تنزانیا، یوگینڈا، نیروبی اور فلم ''اپرادھ'' کے لئے جرمنی گئے۔ جرمنی سے واپسی کے دوران جنیوا اور روم ہوتے ہوئے ہندوستان آئے۔

۱۹۸۶ء میں نیویارک، لاس اینجلس، سان فرانسسکو، ڈزنی لینڈ اور شکاگو کے مشاعروں میں شرکت کی۔ واپسی میں فرینک فرڈ، قاہرہ، دُبئی اور کراچی میں کچھ دن قیام کر کے ہندوستان لوٹے۔ ۱۹۸۵ء میں ٹورنٹو میں اپنے ۷۰ رسالہ جشن میں شرکت کی۔ بیوی کے ہم راہ واپسی میں یورپ اور ایشیا کے کئی ممالک کی سیر کی۔ ۱۹۸۵ء میں ہی اختر الایمان کو اردو اکیڈمی نے ''بہادر شاہ ظفر کل ہند ایوارڈ'' سے نوازا۔

اُن کی زندگی خوش حال گزر رہی تھی کہ اچانک جنوری ۱۹۸۶ء میں اُنہیں دل کی شکایت شروع ہوئی اور ممبئی میں برج کینڈی ہاسپٹل میں زیرِ علاج رہے۔ ڈاکٹروں نے بوسٹن لے جانے کا مشورہ دیا اور اپریل ۱۹۸۶ء کو بوسٹن روانہ ہوئے اور وہاں اُن کے پانچ بائی پاس ہوئے اور ایک (Valve) بدلا گیا۔ صحت یاب ہو کر ممبئی واپس آئے اور بہت ساری مصروفیات صحت کے چلتے ترک کر دیں لیکن صحت آئے دن بگڑتی ہی رہی اور ۹ رمارچ ۱۹۹۶ء کو انتقال ہوا اور باندرہ قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

اُن کے مزار کے کتبے پر اُنہی کے یہ شعر کندہ ہے:

اِس مسافت میں رَہ رَہ کے لپٹی تھی جو
میں نے وہ خاک بھی پاؤں سے جھاڑ دی

ادبی خدمات: اختر الایمان کو شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے ایک مضمون میں جدید شاعری کا باوا آدم قرار دیا ہے۔ اُنہوں نے اپنے طرز کی شاعری کی۔ نہ کسی تحریک سے وابستہ ہوئے اور نہ کسی رجحان سے متاثر ہوئے اور نہ ہی فلمی گیتوں کے لئے اپنی شاعری کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کیا۔ اختر الایمان نے فلموں کے لئے منظر نامے اور مکالمے تو ضرور لکھے لیکن گیت نہیں لکھے۔ انہوں نے اپنی خودنوشت 'اس آباد خرابے میں' کے عنوان سے لکھی۔

تصانیف: اختر الایمان کے ۱۰ شعری مجموعے ہیں۔ جن میں ۹ اُن کی زندگی میں اور ایک بعدِ وفات شائع ہوا۔

(۱) گرداب ۱۹۴۳ء (۲) سب رنگ ۱۹۴۶ء (۳) تاریک سیارہ ۱۹۵۲ء (۴) آب جو ۱۹۵۹ء
(۵) یادیں ۱۹۶۰ء (۶) بنتِ لمحات ۱۹۶۹ء (۷) نیا آہنگ ۱۹۷۷ء (۸) سروساماں ۱۹۸۳ء
(۹) زمین زمین ۱۹۹۰ء (۱۰) زمستاں سرد مہری ۱۹۹۷ء

انعامات: اختر الایمان کو اُن کی شعری خدمات پر کئی اعلیٰ اور پُر وقار انعامات و اعزازات سے نوازا گیا۔ اُن کے شعری مجموعے ''یادیں'' کو ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ''بنتِ لمحات'' کو اُتر پردیش اردو اکیڈمی اور میر اکیڈمی نے انعامات سے نوازا۔ ''نیا آہنگ'' پر مہاراشٹر اردو اکیڈمی کا انعام ملا اور ''سروساماں'' پر مدھیہ پردیش حکومت نے اقبال سمان سے نوازا۔ اِسی مجموعے کو غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی اور اردو اکیڈمی، دہلی نے بھی انعامات عطا کیے۔

10.04 اختر الایمان کی نظم نگاری

اختر الایمان کا شمار اردو کے صفِ اوّل کے نظم گو شعرا میں ہوتا ہے۔ اُنہوں نے نظم کی ہیئت میں کامیاب تجربے کیے اور اردو نظم کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا جس کی بنا پر شمس الرحمٰن فاروقی نے اُنہیں ہندوستان میں نئی شاعری کا باوا آدم قرار دیا ہے۔ اختر الایمان نے اردو کی شعری روایت کی کہیں پاس داری کی ہے تو کہیں اُس سے انحراف بھی کیا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے غلبے کے باوجود اُنہوں نے اپنے فکر و فن کی الگ راہ نکالی اور تا دمِ تحریر اُس راہ پر قائم رہے۔

اختر الایمان نے ۱۶ یا ۱۷ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ فتح پور مسلم ہائی اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں ہی اُنہیں اسکول میگزین کا مدیر بنا دیا گیا اور اُسی رسالے میں اُن کی نظم ''گورِ غریباں'' شائع ہوئی جس کی بہت پذیرائی ہوئی۔ وہ ترقی پسند تحریک اور حلقۂ اربابِ ذوق دونوں سے وابستہ رہے لیکن اِس وابستگی کا اثر اُن کی شاعری میں دکھائی نہیں دیتا۔ وہ نظم کی ہیئت یا موضوع کے انتخاب میں کسی خارجی نظریے کی پابندی یا اصول کے قائل نہیں تھے۔ وہ شاعری کو مذہب کا درجہ دیتے تھے۔

اختر الایمان کی نظم نگاری کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔ ڈرامائیت، خود کلامی، مکالماتی انداز، علامتوں کا استعمال، محاکات نگاری، پیکر تراشی اور روزمرہ کی زبان کا تخلیقی استعمال وغیرہ۔ اردو نظم کی روایت پر نظر ڈالیں تو بہت سے شعرا کے یہاں ڈرامائی انداز ملتا ہے۔ اختر الایمان کی شاعری میں ڈرامائیت، شعری زبان اور آہنگ سے عبارت ہے۔ ڈرامے کے مکالمے کی طرح اُن کی نظموں کے مصرعوں کو بھی بولا جا سکتا ہے اور خصوصاً اُن کے یہاں ڈرامائی یک کلامی (Dramatic Monologue) کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔

نظم ''ایک لڑکا'' سے مثال دیکھیے:

یہ لڑکا پوچھتا ہے ، اختر الایمان تم ہی ہو؟ یہ لڑکا پوچھتا ہے جب تو میں جھلاّ کے کہتا ہوں
وہ آشفتہ مزاج ،اندوہ پرور ،اضطراب آسا جسے تم پوچھتے رہتے ہو کب کا مرچکا ظالم!
اُسے خود اپنے ہاتھوں سے کفن دے کر فریبوں کا اُسی کی آرزوؤں کی لحد میں پھینک آیا ہوں!
میں اُس لڑکے سے کہتا ہوں، وہ شعلہ مرچکا جس نے کبھی چاہا تھا اک خاشاکِ عالم پھونک ڈالے گا
یہ لڑکا مسکراتا ہے ، یہ آہستہ سے کہتا ہے یہ کذب وافترا ہے، جھوٹ ہے، دیکھو میں زندہ ہوں!

اختر الایمان نے اپنی شاعری میں علامتوں کو بڑی کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔ علامتی انداز کی نظموں میں ''موت، مسجد، پرانی فصیل، تنہائی اور ایک لڑکا'' قابلِ ذکر ہیں۔ ''مسجد اور پرانی فصیل'' عقائد اور اقدار کی شکست وریخت کی علامتیں ہیں۔ ''موت اور تنہائی میں'' وقت کی بے رحمی اور انسان کی اَزلی و اَبدی تنہائی کو علامتی پیرائے میں پیش کیا ہے اور نظم ''ایک لڑکا'' میں ایک لڑکا انسانی ضمیر کی علامت ہے۔ اختر الایمان علامتوں کے ساتھ ڈرامائی طرزِ اظہار سے نظموں میں دل کشی پیدا کرتے ہیں اور یہی انداز اُن کی نظموں میں فنی اور معنوی سطحوں پر اُن کی تخلیقی صلاحیتوں اور شاعرانہ اظہار کی انفرادیت کا بین ثبوت ہے۔ نظم ''مسجد'' کا ایک بند ملاحظہ ہو:

حسرتِ شام وسحر بیٹھ کے گنبد کے قریب اُن پریشان دعاؤں کو سنا کرتی ہے
جو ترستی ہی رہیں رنگِ اثر کی خاطر اور ٹوٹا ہوا دل تھام لیا کرتی ہے

اِس بند میں حسرت مذہب کے احیا کی علامت ہے۔ مسجد ویران ہوگئی ہے۔ اُس مذہب کے پیروؤں کی اپنے مذہب سے دُوری کے سبب مسجد نمازیوں سے خالی ہے اور اُس کے رکھ رکھاؤ اور صفائی کا بھی انتظام نہیں ہے۔ مذہبی احیا پسند آنکھیں اُسے آباد دیکھنا چاہتی ہیں اور دعاؤں کا رنگِ اثر دیکھنے کی منتظر ہیں۔ اِس نوع کی نظموں میں ''مفاہمت، شیشہ کا آدمی، کل کی بات، بزدل، نیند کی پریاں، یادیں، باز آمد...... ایک منتاج، اپاہج گاڑی کا آدمی، کالے سفید پروں والا پرندہ اور میری ایک شام'' وغیرہ اُن کی بہترین نظموں میں شمار کی جاتی ہیں۔

اختر الایمان کی شاعری میں وقت کو مرکزیت حاصل ہے۔ وقت کی ناگزیریت کے فلسفے کو اُنھوں نے مختلف علامتوں کے ذریعے شعری پیکروں میں ڈھالا ہے۔ اِن نظموں میں کہیں وقت کی جبریت کو موضوع بنایا ہے تو کہیں قوتِ شفا کو۔ وقت انسانوں پر ظلم ڈھاتا ہے جس کے نتیجے میں کبھی فراق تو کبھی ابدی جدائی نصیب بن جاتی ہے لیکن وقت ہی جدائی کے درد کو قابلِ برداشت بھی بناتا ہے اور بڑے سے بڑے زخم کو وقت ہی مندمل بھی کرتا ہے۔ اُن کی نظم ''سحر'' کے اِس بند سے اُن کے فلسفۂ وقت کو سمجھا جاسکتا ہے مثلاً:

کون سی راحتِ دوراں جو میسر آئی
داغ دے کر نہ گئی ، کون سے لمحاتِ نشاط
ٹیس بن کر نہ اُٹھے، زہر نہ چھوڑا مجھ میں
ہر نیا واقعہ اک حادثہ تھا ،ہر نئی بات
فالِ بد نکلی ، کیا زخم دروں کو گہرا

ہر نئے موڑ پہ دنیا ہوئی ثابت وہ بساط
جس پہ انسان فوط مُہرے ہیں اُلٹے، سیدھے
پھر بھی وہ کون سا جادو ہے جو ہر تازہ وفات
یوں بھلا دیتا ہے جی سے کہ نشاں بھی نہ ملیں؟

اختر الایمان اپنی شاعری میں وقت کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ''بنتِ لمحات'' کے پیشِ لفظ میں لکھتے ہیں:

''میری اِن نظموں میں وقت کا تصوّر اِس طرح ملتا ہے جیسے یہ میری ذات کا ایک حصّہ ہے اور یہ طرح طرح سے میری نظموں میں میرے ساتھ رہتا ہے۔ کبھی یہ گزرتے وقت کا المیہ بن جاتا ہے، کبھی خدا بن جاتا ہے، کبھی نظم کا ایک کردار، 'بازآمد' میں رمضانی قصائی وقت ہے، 'بیداد' میں خدا وقت ہے اور کوزہ گر میں سامری وقت ہے۔ وقت جبریلِ امیں ہے جو زمین سے تاحد مسلّط ہے ہماری گزرانِ حیات پر، جس کے پاؤں تحت الثّریٰ سے بھی نیچے ہیں اور سر عرشِ معلّیٰ سے اُوپر۔ ساتھ ہی یہ تصّور نہ مایا کا تصور ہے نہ فنا کا۔ یہ ایک ایسی زندہ اور پائندہ ذات ہے جو اٹَت ہے۔''

اختر الایمان اپنی نظموں میں بے حد خوب صورت لفظی پیکر تراشتے ہیں۔ وہ مناظرِ فطرت ہی کی نہیں بلکہ جذبات واحساسات کی بھی دل کش تصویریں پیش کرتے ہیں جو قاری کے ذہن کے پردۂ سیمیں پر چلنے والی ریل کی طرح ایک کے بعد ایک بدلتی رہتی ہیں۔ اختر الایمان نے فلموں کے لئے منظر نامے اور مکالمے لکھے اور اِس فن کے ماہرین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ یہ فنی صلاحیتیں اُن کی شاعری میں بدرجۂ اتم موجود ہیں جن کے جادو سے فطری پیکر، حسیاتی پیکر میں بدل جاتا ہے۔ نظم ''تنہائی میں'' کا یہ بند دیکھیے:

دُور تالاب کے نزدیک وہ سوکھی سی ببول   چند ٹوٹے ہوئے ویران مکانوں سے پرے
ہاتھ پھیلائے برہنہ سی کھڑی ہے خاموش   جیسے غربت میں مسافر کو سہارا نہ ملے
اُس کے پیچھے سے جھجکتا ہوا اک گول سا چاند   اُبھرا بے نور شعاعوں کے سفینہ کو لیے
میں ابھی سوچ رہا ہوں کہ اگر تو مل جائے   زندگی گو ہے گراں بار پہ اتنی نہ رہے

اختر الایمان نے نظم نگاری کا انتخاب شعوری طور پر کیا بلکہ اُنہیں نظم کی صنف اِس لئے پسند ہے کہ اس میں شاعر اپنے مافی الضمیر کے بیان میں کسی طرح کی رکاوٹ محسوس نہیں کرتا۔ اس میں ہر موضوع کو بیان کرنے کی وسعت اور صلاحیت ہے۔

اختر الایمان ''زمین زمین'' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''زندگی سے متعلق ایسا کوئی موضوع نہیں جس پر نظم نہیں کہی جاسکتی، نظم کا کینوس اتنا بڑا ہے کہ اس پر جو رنگ فن کار ڈھنگ سے استعمال کرے گا، اچھا لگے گا۔''

(اختر الایمان. ''زمین زمین'')

اختر الایمان کی نظمیں اپنے پیش رَووں اور معاصرین دونوں سے مختلف ہیں کیوں کہ اُن کا اُسلوب، لب ولہجہ اور ڈکشن منفرد ہے۔ انہوں نے فارسیت سے عاری لفظیات کے استعمال سے جو الگ پہچان بنائی وہ نا قابلِ تقلید ہے۔اختر الایمان نے اپنے عہد کی زندگی میں انسانوں کے متضاد رویوں اور اخلاقی قدروں کی پامالی پر گہرا طنز کیا ہے۔دراصل اُنہیں انسانی قدریں بہت عزیز ہیں اور جس دور میں اُنہوں نے لکھنا شروع کیا تھا، اُس دَور میں عالمی جنگوں، دہشت، تقسیمِ ہند اور فسادات کی خوں ریزی، بے ضمیری، بے حسی، نفرت اور مفاد پرستی نے انسان کو جکڑ لیا تھا۔امن وعافیت، محبت ویگانگت اور خلوص ودردمندی عنقا ہوتے جارہے تھے۔اختر الایمان نے مختصر نظمیں بھی کہی ہیں اور رمزیت، اشاریت اور علامتوں کے استعمال سے اختصار میں بھی فنی حُسن اور معنویت پیدا کی ہے۔

دوسروں کو سدھارنے مت جاؤ
اپنی اصلاح پر نظر رکھو
لوگ کیا کررہے ہیں، چھوڑو اُنہیں
سرزنش اپنی خوب کرتے رہو۔ایک شہدا جہاں میں کم ہوگا

10.05 نظم ''یادیں'' متن

لو وہ چاہِ شب سے نکلا پچھلے پہر پیلا مہتاب
ذہن نے کھولی رُکتے رُکتے ماضی کی پارینہ کتاب
یادوں کے بے معنی دفتر ، خوابوں کے افسردہ شہاب
سب کے سب خاموش زباں سے کہتے ہیں اے خانہ خراب!
گزری بات صدی یا پل ہو ، گزری بات ہے نقش بر آب

یہ رُوداد ہے اپنے سفر کی اِس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اِس آباد خرابے میں

شہرِ تمنّا کے مرکز میں لگا ہوا ہے میلا سا
کھیل کھلونوں کا ہر سُو ہے اک رنگیں گلزار کھلا
وہ اک بالک جس کو گھر سے اک درہم بھی نہیں ملا
میلے کی سج دھج میں کھوکر باپ کی اُنگلی چھوڑ گیا
ہوش آیا تو خود کو تنہا پا کے بہت حیران ہوا

بھیڑ میں راہ ملی نہیں گھر کی اِس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اِس آباد خرابے میں

وہ بالک ہے آج بھی حیراں، میلہ جوں کا توں ہے لگا
حیراں ہے بازار میں چُپ چُپ کیا کیا بکتا ہے سودا
کہیں شرافت ، کہیں نجابت ، کہیں محبت ، کہیں وفا
آل اولاد کہیں بکتی ہے ، کہیں بزرگ اور کہیں خدا
ہم نے اس احمق کو آخر اسی تذبذب میں چھوڑا
اور نکالی راہ مَفَر کی اِس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اِس آباد خرابے میں

ہونٹ تبسّم کے عادی ہیں ، ورنہ روح میں زہر آگیں
گھپے ہوئے ہیں اتنے نشتر جن کی کوئی تعداد نہیں
کتنی بار ہوئی ہے ہم پر تنگ یہ پھیلی ہوئی زمیں
جس پر ناز ہے ہم کو اتنا ، جھکی ہے اکثر وہی جبیں
کبھی کوئی سفلہ ہے آقا، کبھی کوئی ابلہ فرزیں
بیچی لاج بھی اپنے ہنر کی اِس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اِس آباد خرابے میں

کالے کوس غمِ الفت کے اور میں نانِ شبینہ جُو
کبھی چمن زاروں میں اُلجھا اور کبھی گندم کی بُو
نافۂ مشکِ تتاری بن کر لیے پھری مجھ کو ہر سُو
یہی حیاتِ صاعقہ فطرت بنی تعطّل کبھی نمُو
کبھی کیا رَم عشق سے ایسے جیسے کوئی وحشی آہو
اور کبھی مَر مَر کے سحر کی اِس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اِس آباد خرابے میں

کبھی غنیمِ جور و ستم کے ہاتھوں کھائی ایسی مات
اَرضِ اَلم میں خوار ہوئے ہم ، بگڑے رہے برسوں حالات
اور کبھی جب دن نکلا تو بیت گئے جُگ ، ہوئی نہ رات
ہر سُو مَہ وش، سادہ قاتل، لطف و عنایت کی سوغات
شبنم ایسی ٹھنڈی نگاہیں، پھولوں کی مہکار سی بات

جوں توں یہ منزل بھی سر کی اِس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اِس آباد خرابے میں

خوار ہوئے دَمڑی کے پیچھے اور کبھی جھولی بھر مال
ایسے چھوڑ کے اُٹھے جیسے چھوا تو کر دے گا کنگال
سیانے بن کر بات بگاڑی ، ٹھیک پڑی سادہ سی چال
چھانا دشتِ محبت کتنا آبلہ پا مجنوں کی مثال
کبھی سکندر ، کبھی قلندر ، کبھی بگولہ ، کبھی خیال

سوانگ رچائے اور گزر کی اِس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اِس آباد خرابے میں

زیست خدا جانے ہے کیا شَے، بھوک ،تجسّس ، رشک ، فرار
پھول سے بچے، زُہرہ جبینیں ، مرد مجسّم، باغ و بہار
مرجھا جاتے ہیں اکثر کیوں؟ کون ہے وہ جس نے بیمار
کیا ہے روحِ ارض کو آخر؟ اور یہ زہریلے افکار
کس مٹی سے اُگتے ہیں سب؟ جینا کیوں ہے اک بے گار؟

اِن باتوں سے قطعِ نظر کی اِس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اِس آباد خرابے میں

دُور کہیں وہ کوئل کوکی ، رات کے سنّاٹے میں دُور
کچّی زمیں پر بکھرا ہوگا ، مہکا مہکا آم کا بُور
بارِ مشقّت کم کرنے کو کھلیانوں میں کام سے چُور
کم سن لڑکے گاتے ہوں گے ، لو دیکھو وہ صبح کا نور
چاہ شب سے پھوٹ کے نکلا ، میں مغموم کبھی مسرور

سوچ رہا ہوں اِدھر اُدھر کی اِس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اِس آباد خرابے میں

راہ نوردِ شوق کو رہ میں کیسے کیسے یار مِلے
ابرِ بہاراں ، عکسِ نگاراں ، خالِ رُخِ دل دار مِلے

کچھ بالکل مٹی کے مادھو ، کچھ خنجر کی دھار مِلے
کچھ منجدھار میں ، کچھ ساحل پر ، کچھ دریا کے پار مِلے
ہم سب سے ہر حال میں لیکن یوں ہی ہاتھ پسار مِلے
صرف اُن کی خوبی پہ نظر کی اِس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اِس آباد خرابے میں

ساری ہے بے ربط کہانی، دُھندلے دُھندلے ہیں اوراق
کہاں ہیں وہ سب؟ جن سے جب تھی پل بھر کی دُوری بھی شاق
کہیں کوئی ناسور نہیں ، گو حائل ہے برسوں کا فراق
کِرمِ فراموشی نے دیکھو ! چاٹ لیے کتنے میثاق
وہ بھی ہم کو رو بیٹھے ہیں ، چلو ہوا قرضہ بے باق
کھلی تو آخر بات اثر کی اِس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

خواب تھے اک دن اَوجِ زمیں سے، کاہ کشاں کو چھولیں گے
کھیلیں گے گل رنگ شفق سے ، قوسِ قزح میں جھولیں گے
بادِ بہاری بن کے چلیں گے ، سرسوں بن کر پھولیں گے
خوشیوں کے رنگیں جھرمٹ میں رنج و محن سب بھولیں گے
داغِ گل و غنچہ کے بدلے مہکی ہوئی خوشبو لیں گے
ملی خلش پر زخمِ جگر کی اِس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

نیند سے اب بھی دُور ہیں آنکھیں گو کہ رہیں شب بھر بے خواب
یادوں کے بے معنی دفتر ، خوابوں کے افسردہ شہاب
سب کے سب خاموش زباں سے کہتے ہیں اے خانہ خراب!
گزری بات صدی یا پل ہو گزری بات ہے نقش بر آب
مستقبل کی سوچ ، اُٹھا یہ ماضی کی پارینہ کتاب
منزل ہے یہ ہوش و خبر کی اِس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اِس آباد خرابے میں

10.06 نظم ''یادیں'' تجزیہ

ابھی ہم نے اختر الایمان کی نظم ''یادیں'' کا مطالعہ کیا ہے۔اب ہم اُس کی تشریح و تجزیہ کریں گے۔ یہ نظم یادِایام کی داستان ہے۔یعنی گزرے ہوئے دنوں کی یادوں کا ایک حسین سفر ہے۔اِس نظم میں اختر الایمان نے اپنی زندگی کے سفر کے اہم مرحلوں کو یادوں کی شکل میں محفوظ رکھا ہے۔یادیں ماضی سے متعلق وہ باتیں ہوتی ہیں جو وقت کے بے رحم ہاتھوں سے مٹ جانے سے محفوظ رہ جاتی ہیں۔کچھ یادیں خصوصاً خوش گوار یادیں انسان شعوری طور پر یاد رکھتا ہے اور کچھ یادوں کا تعلق سانحات، حادثات اور نامساعد حالات سے ہوتا ہے جن کا اثر انسان کے دل و دماغ پر بہت گہرا ہوتا ہے۔اس لئے وہ غیر شعوری طور پر انسان کے ذہن میں محفوظ ہو جاتی ہیں۔یادوں کی کچھ ایسی ہی دھوپ چھاؤں ہمیں اس نظم میں دکھائی دیتی ہے۔کہیں مسرّت و انبساط ہے تو کہیں رنج والم گویا زندگی اپنی تمام تر بوقلمونیوں کے ساتھ ان یادوں میں جلوہ گر ہے۔

شاعر(متکلم) نے اس نظم میں اپنی زندگی کی تمام رُوداد بیان کردی ہے۔پہلے بند میں اختر الایمان نے بے حد حسین استعاروں سے جو امیجری تیار کی ہے وہ ایک خوب صورت منظر پیش کرتی ہے۔جب رات کے پچھلے پہر چاند پیلا پڑ جاتا ہے اور تنہائی نے یادوں پر دستک دی ہے اور ذہن نے (جس میں یادیں بستی ہیں اور خواب بنتے ہیں) رُکتے رُکتے ماضی کی پرانی کتاب کھولی جس میں یادوں کے بے معنی دفتر اور خوابوں کے شہاب افسردہ ہو چکے ہیں۔افسردگی کا سبب یہ ہوسکتا ہے کہ زندگی کی تگ ودَو میں وہ خواب کبھی پورے ہی نہ ہو سکے۔سب کے سب خاموش زبان سے یہ کہتے ہیں کہ اے خانہ خراب! (تباہ حال) گزری ہوئی باتوں کو یاد کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا کیوں کہ گزری ہوئی باتیں چاہے وہ صدی پہلے گزری ہوں یا پل بھر پہلے وہ نقش برآب کی طرح ہوتی ہیں یعنی پانی پر بنی لہریں جس طرح پل بھر میں مٹ جاتی ہیں، فانی ہوتی ہیں اسی طرح گزری باتیں بھی بے سود ہوتی ہیں۔یہاں پر خاموش زبان سے کہنے کا عمل بڑا معنی خیز ہے۔

اختر الایمان نے تجسیم کے ذریعے یادوں کے دفتر اور خوابوں کے افسردہ شہاب کو مجسّم بنا دیا ہے اور خاموش زبان سے کہنے کا ایک مطلب تو یہ ہوسکتا ہے کہ زبان بول کر اپنا منشا بیان کرتی ہے لیکن کبھی کبھی خاموشیاں بھی گفتگو کرتی ہیں یعنی ترسیل کی کامیابی کے لئے بولنا اور سننا ضروری ہوتا ہے لیکن بغیر کہے اور بغیر سنے بھی بہت کچھ سمجھا جاسکتا ہے۔یہ شاعرانہ توجیہات ہیں۔یہ محسوسات کی زبان ہے۔یہاں شاعر نے دنیا کو اس کی بوقلمونی کے سبب آباد خرابہ قرار دیا ہے اور اپنے سوانحی حالات کو رُودادِ سفر۔اختر الایمان کہتے ہیں کہ آؤ ہم تمہیں بتائیں کہ یہ دنیا جو ایک آباد خرابہ ہے اِس میں ہم نے اپنی زندگی کس طرح بسر کی۔اختر الایمان کی خودنوشت سوانح کا عنوان بھی ''اِس آباد خرابے میں'' ہے۔جو ابتدا میں رسالہ ''سوغات'' میں قسط وار شائع ہوئی اور اُس رسالے کے ایڈیٹر محمود ایاز نے اُسے یہ عنوان دیا جو نظم میں ٹیپ کا مصرع ہے۔

نظم کے دوسرے بند میں شاعر اپنی زندگی کے بالکل ابتدائی زمانے یعنی بچپن کا ذکر کرتے ہوئے ایک میلے کا منظر پیش کرتا ہے۔ ایک بچہ اپنے باپ کی انگلی تھامے میلہ دیکھنے جاتا ہے۔میلے میں کھیل کھلونوں کی دکانیں، نمائش اور طرح طرح کی دل موہ لینے والی اشیا موجود ہیں لیکن اُنہیں خریدنے کے لئے اُس لڑکے کے پاس پیسے نہیں ہیں۔وہ میلے کی چکاچوند اور کھیل کھلونوں میں کہیں کھو گیا اور جب اُسے ہوش آیا تو خود کو تنہا پا کر بہت حیران ہوا کیوں کہ وہ گھر کا راستہ نہیں جانتا تھا اور باپ کی انگلی (جو اِس اجنبی دنیا میں اُس کی رہ بَری کر رہی تھی) اُس کا سہارا تھی وہ بھی چھوٹ گئی۔

تیسرے بند تک آتے آتے میلہ، دنیا کا استعارہ بن جاتا ہے اور اِس دنیا میں انسانوں نے جو دکانیں سجائی ہیں وہاں شرافت، نجابت، محبت، وفائیں، دعائیں اور آشیرواد سب کچھ بکتا ہے بلکہ نام نہاد خدارسیدہ لوگ بھولے بھالے لوگوں کے عقائد اور جذبات کے سہارے اپنی دکانیں چلاتے ہیں۔ یہاں شاعر نے انسانی اقدار کی شکست وریخت، مادہ پرستی اور صارفیت پر طنز کیا ہے۔ یہاں سب کچھ خریدا اور بیچا جاسکتا ہے۔ شاعر کا ہم زادوہ بھولا بچہ اب تک اِسی پس وپیش میں مبتلا ہے کہ دنیا کیا سے کیا ہوگئی۔ شاعر کہتا ہے کہ آج کے زمانے میں اِن سب باتوں کے بارے میں سوچنے والا بے وقوف سمجھا جاتا ہے۔ یہ طنزیہ لب ولہجہ اِس لئے ہے کہ اِس زمانے میں دوسروں کے لئے سوچنے والے کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے بھی تو غور وفکر میں محو اپنے اُس ہم زاد کو اُس کے حال پر چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کرلی یعنی دنیا سے سمجھوتہ کرلیا ہے۔

چوتھے بند میں اختر الایمان کہتے ہیں کہ دنیا میں انسان کو قدم قدم پر سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے اور وہ اقدار و اُصول جو اُن کو بے حد عزیز ہیں اُن کے ساتھ ساتھ اپنی عزّتِ نفس کو بھی معیشت کی خاطر داؤ پر لگانا پڑتا ہے۔ وہ جبین جس پر ناز تھا کہ وہ کسی کے آگے نہیں جھکی، حالات نے اُسے نالائقوں اور احمقوں کے آگے جھکنے پر مجبور کر دیا اور روزی روٹی کے لئے اتنے بے بس ہوئے کہ اپنے ہنر کو بیچ دیا۔ یہ تو غنیمت ہے کہ ہونٹ مسکرانے کے عادی ہیں اس لئے انسان روح کے اِن زخموں کو بھی برداشت کر لیتا ہے۔

پانچویں بند میں شاعر نے معیشت (روزگار) کی خاطر غریب الوطنی اختیار کرنے اور زندگی گزارنے کے کرب کو موضوع بنایا ہے۔ روزگار، نانِ شبینہ کی تلاش میں انسان میلوں کا سفر طے کرتا ہے، کبھی چمن زاروں میں اُلجھ جاتا ہے تو کبھی گندم کی بُو اُسے تتاری ہرن کی طرح اپنے پیٹ کی تھیلی میں لیے پھرتی ہے۔ زندگی ہر پل رنگ بدلتی رہتی ہے۔ کبھی از حد مشکل ہوجاتی ہے تو کبھی پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کرتی ہے لیکن ہر مشکل کا مقابلہ ڈٹ کر کیا اور زندگی بسر کی۔

چھٹے بند میں شاعر نے حیات کی بوقلمونی کو موضوع بنایا ہے۔ جس طرح ہر رات کے بعد سویرا ہوتا ہے اُسی طرح تکلیف دہ گھڑیوں کے بعد راحت کے لمحے بھی آتے ہیں۔ یہی فطرت اور زندگی کا دستور ہے۔ کوئی بھی شے پائیدار اور دائمی نہیں ہوتی۔ کبھی دشمنوں کے ظلم وستم سہتے رہے، رسوائیاں اُٹھائیں، برسوں حالات سدھر نہیں سکے۔ تکلیف کی گھڑیاں یوں بھی لمبی معلوم ہوتی ہیں اور بڑی مشکل سے گزرتی ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ تکلیفوں بھرے دن کا گزرنا ایسا لگتا ہے کہ کتنے زمانے گزر گئے لیکن یہ دن ختم ہی نہیں ہوتا۔ پھر راحتیں بھی ملیں جن میں شبنم کی سی ٹھنڈک اور پھولوں کی سی مہک تھی جس کے سرور وانبساط میں یہ دن کیسے گزر گئے، پتہ ہی نہیں چلا۔ ہنستے، روتے زندگی کی تمام منزلیں طے کر لیں۔

ساتویں بند میں شاعر زندگی کے اُن پہلوؤں (حقائق) کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جہاں کامیابیاں اور ناکامیاں نصیبوں کا کھیل بن جاتی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ کبھی دَمڑی (پیسے کا چوتھا حصّہ) اور بہت معمولی چیز کے حصول کے لئے پریشان ہونا پڑا اور کبھی دولت کی افراط ہوئی لیکن ہماری طبیعت کی بے نیازی نے اسے قبول نہیں کیا۔ کبھی ہم نے بہت عقل مندی کا مظاہرہ کیا لیکن پھر بھی بات بگڑ گئی اور کبھی سادہ لوحی نے مالا مال کیا۔ محبت کی راہ میں مجنوں کی طرح صحراؤں کی خاک چھانی (مشکلیں اُٹھائیں) کبھی سکندر، کبھی قلندر اور کبھی بگولے کا روپ دھارَڑ کیے، کیا کیا سوانگ رچائے، تب کہیں جا کر اِس آبادخرابے میں گزر بسر کی۔

آٹھویں بند میں شاعر یہ سوال اُٹھاتا ہے کہ زندگی کیا ہے؟ بھوک، تجسّس، اشک یا فرار؟ پھول سے بچے، زہرہ جبینیں اور خوش مزاج مرد سب وقت کے ساتھ مُرجھا جاتے ہیں۔ اس بند میں شاعر نے زندگی کی بے ثباتی کی وجوہات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کون سے زہریلے افکار ہیں؟ جنہوں نے روحِ ارض کو بیمار کیا اور یہ کس مٹی سے اُگتے ہیں؟ اور زندگی کیوں بے گار کی مزدوری کی طرح انسان پر لاد دی گئی ہے؟ اِن تمام ماورائے شعور باتوں سے قطعِ نظر کر کے میں نے اِس آباد خرابے میں زندگی گزاری۔

نویں بند میں شاعر دیہی زندگی کے اُس دل فریب منظر کو پیش کرتا ہے۔ جہاں کوئلیں کُوک رہی ہیں۔ زمین پر پانی کے چھڑکاؤ سے مٹی کی بھینی بھینی خوشبو اور آموں کے بور کی مہک فضاؤں میں پھیلی ہوئی ہے۔ کم سن لڑکے محنت ومشقت کے بعد تھکان کے احساس کو دور کرنے کے لئے کھلیانوں میں گیت گا رہے ہیں۔ صبح کا نور پھوٹ نکلا ہے یعنی محنت ومشقت کے بعد راحت میسّر آئی ہے۔ میں کبھی خوش اور کبھی غمگین وفکر مند اِدھر اُدھر کی باتیں سوچ رہا ہوں یعنی ذہن کے پردے پر کبھی تسلسل کے ساتھ کبھی بے ربط منظر بدلتے جا رہے ہیں جنہیں دیکھ کر میں سوچ رہا ہوں کہ میں نے اِس دنیا میں کس طرح زندگی بسر کی؟۔

دسویں بند میں شاعر کہتا ہے کہ اس شوق کی راہ کے مسافر کو اپنے سفر میں طرح طرح کے انسان ملے، کچھ حسین وجمیل، ذہین وفطین اور مہربان دوست ملے تو کچھ احمقوں سے بھی پالا پڑا اور کچھ خنجر کی دھار کی طرح خطرناک لوگ بھی ملے۔ راہِ حیات میں کچھ خوشی وغم کے ساتھی بنے تو کچھ بیچ راستے میں چھوڑ کر چلے گئے اور کچھ دُور کھڑے تماشا دیکھتے رہے لیکن ہم ہر حال میں دوستی کا حق نبھاتے رہے اور دنیا کی اس مطلب پرستی سے قطعِ نظر کر کے اُن کی خوبیوں پر نظر رکھی اور سب کے ساتھ نباہ کرتے ہوئے زندگی بسر کی۔

گیارہویں بند میں شاعر کہتا ہے کہ اب جب میں ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ ماضی کی کتاب کے اَوراق پلٹ رہا ہوں تو تمام اَوراق دھندلے دُھندلے اور کہانی بے ربط نظر آ رہی ہے۔ وہ لوگ کہاں ہیں جن کے بغیر زندگی دشوار نظر آتی تھی۔ پل بھر کی دوری بھی جاں سوز تھی۔ شاعر تجاہلِ عارفانہ کے انداز میں اپنے آپ سے پوچھتا ہے کہ وہ جدائی کا زخم پھر کیوں ناسور نہیں بنا؟ جب کہ جدائی کے بعد فراق کے کئی برس بیت چکے ہیں۔ وقت کے ساتھ بڑھتے بڑھتے زخم ناسور بن جاتا ہے وہ زخم پھر ناسور کیوں نہیں بنا؟ ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ کرمِ فراموشی نے اُن کو چاٹ لیا اور کچھ باقی نہ رہا یعنی ہم خود ہی عہدِ وفا بھول گئے اور رسمِ وفا نہیں نبھائی لیکن وہ بھی تو ہمیں بھلا بیٹھے ہیں۔ تو یہ جذبات واحساسات کا قرضہ ادا ہوا۔

بارہویں بند میں شاعر کہتا ہے کہ ہم نے یہ خواب دیکھا تھا کہ زمین کا عروج ہوگا تو ہم کہکشاں (ستاروں) کو چھو لیں گے۔ آسمان میں سورج کے طلوع وغروب کے وقت کی شفق کی لالی سے کھیلیں گے اور قوسِ قزح کی دھنک (برسات کے بعد آسمان میں جو سات رنگ کی کمان دکھائی دیتی ہے) میں جھولیں گے، موسمِ بہار کی ہوا بن کر چلیں گے اور سرسوں بن کر پھولیں گے یعنی جس طرح سے سرسوں کے پودوں میں پھول آنے لگتے ہیں تو سارا منظر زرد ہی زرد نظر آتا ہے اور فضائیں گلوں کی مہک سے معطّر ہو جاتی ہیں، ہماری زندگی بھی ویسی ہی پُر رونق ہوگی۔ یہاں کہکشاں کو چھونا، ترقّی اور کامیابی کا استعارہ ہے جب کہ شفق کی لالی، قوسِ قزح کی دھنک، سرسوں کی زردی اور پھولوں کی مہک وغیرہ خوشی کی علامتیں ہیں۔ شاعر یہ کہتا ہے کہ اب زندگی میں خوشیوں کا دَور دَورہ ہوگا اور جو غم اور تکلیفیں ہیں سب ختم ہو جائیں گی لیکن یہ تمنّائیں، حسرتیں ہی بن کر رہ گئیں اور ہمیں اِس آباد خرابے میں زخمِ جگر کی خلش ہی ملی یعنی وہ خواب کبھی حقیقت نہیں بنے۔

تیرہویں بند میں شاعر کہتا ہے کہ رات بھر نیند نہ آنے کے باوجود اب بھی آنکھیں نیند کے احساس سے دُور ہیں۔ رات بھر یادوں کے گلیارے میں گھومتا رہا۔ یادوں کے بے معنی دفتر اور خوابوں کے مُرجھائے ہوئے ستارے مجھ سے اب بھی یہی کہتے ہیں کہ اے آوارہ منش! اے تباہ حال انسان! گزری ہوئی باتیں پانی پر نقش کی مانند ناپائیدار ہوتی ہیں جن سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس منزل پر تجھے عقل و دانش سے کام لینا چاہیے۔ ماضی کی اس پارینہ کتاب کو چھوڑ اور مستقبل کے بارے میں سوچ۔

اس نظم کا موضوع ''یادیں'' ہیں۔ تیرہ بندوں پر مشتمل اس نظم میں اختر الایمان نے زندگی کے مختلف مراحل پر اپنے ساتھ پیش آئے تجربات کو نظم کے پیکر میں ڈھالا ہے۔ یادوں کا یہ سلسلہ بچپن کی معصومیت بھرے دنوں، دل موہ لینے والے فطری مناظر، میلے کی سجاوٹ، جہاں سب کچھ مسرور کن ہے۔ یہاں سے آگے بڑھتے بڑھتے زندگی کے تلخ حقائق سے آنکھیں چار کرنے کے سفر کی داستان ہے۔

شہری زندگی کا تضاد، زندہ رہنے کی کش مکش، اخلاقی قدروں کی شکست و ریخت، مصلحتیں، جبر، وقت کے ساتھ بدلتے انسانی رویّے، مسرت و انبساط سے مسرور کرنے والی یادیں اور درد و رنج کے لمحات کو یاد دلا کر آنکھوں کو پرنم کر دینے والی یادیں اور ہمت و حوصلہ بڑھانے والی یادیں وغیرہ اِس نظم میں شامل ہیں۔ زندگی ہر لحظہ چلتے رہنے کا نام ہے اور اس سفر میں کتنے ہی مقامات آتے اور گزر جاتے ہیں لیکن یہ سفر ذوق و شوق سے جاری و ساری رہتا ہے۔ نظم کا پس منظر ایک دیہات اور پیش منظر شہر ہے۔ دیہی زندگی کی معصومیت اور شہری زندگی کی مصلحت بھی نظم کے ذیلی موضوعات ہیں۔ اس پوری نظم میں جذباتیت کی ایک زیریں لہر کارفرما ہے۔ پوری نظم میں شاعر کبھی قاری کو مخاطب کرتا ہے، کبھی اپنے آپ سے گفتگو کرتا ہے۔ ایک ڈراما کا سا تاثر اُبھرتا ہے جو اختر الایمان کی شاعری کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔

10.07 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے اختر الایمان کی حیات اور ادبی خدمات سے متعلق معلومات حاصل کیں۔ انہوں نے بحیثیتِ نظم گو شاعر اپنی پہچان بنائی اور اپنی مکالمہ نگاری سے کئی کامیاب اور یادگار فلموں کا حصہ بنے اور اپنے اَن مٹ نقوش چھوڑے۔ اختر الایمان کو کئی انعامات و اعزازات سے نوازا گیا۔ انہوں نے شاعری میں اپنی ایک الگ راہ نکالی اور تا عمر اس پر قائم رہے۔ کوئی تحریک یا رجحان انہیں متاثر نہ کر سکا۔ اختر الایمان نے اپنی نظموں میں ڈرامائیت، خود کلامی، مکالماتی اور علامتی انداز سے نظم کے دامن کو ثروت مند کیا۔ نصاب میں شامل نظم ''یادیں'' کا شمار اختر الایمان کی شاہ کار نظموں میں ہوتا ہے۔ اس نظم میں اختر الایمان نے دنیا کی بے ثباتی، وقت کی طاقت و جبریت، اقدار کی شکست و ریخت، انسانوں کی بے حسی اور بے اعتنائی کو یادوں کے پس منظر میں موضوع بنا کر پیش کیا ہے۔

10.08 فرہنگ

آشفتہ مزاج	:	پریشان خاطر	شاہ کار	:	بڑا کام
اُجرت	:	مزدوری، کام کا عوض	عنقا	:	سیمرغ، ایک فرضی پرندہ، نایاب شے
اضطراب	:	بے قراری، بے چینی	فلسفہ	:	علم، حکمت، دانائی
افترا	:	تہمت، بہتان، جھوٹا الزام	کذب	:	جھوٹ، دروغ
اندوہ	:	رنج و غم، فکر و تردد	مصلحت	:	اچھا مشورہ، مناسب تجویز، حکمت

بوقلمونی	:	رنگارنگی	معاصر	:	ہم عصر، ہم زمانہ، ہم عہد
بے ثباتی	:	ناپائیداری	معیشت	:	زندگی، روزگار، روزی
ثروت	:	دولت	منسلک	:	پرویاہوا، شامل
ثروت مند	:	دولت مند	موٴثر	:	اثر کرنے والا، کارگر
خانہ بدوش	:	بے ٹھکانہ، وہ آدمی جس کا کوئی گھر نہ ہو	نامساعد	:	ناموافق، ناسازگار
دائمی	:	ہمیشگی والا، کبھی نہ بدلنے والا	نشیب وفراز	:	اونچ نیچ، اُتار چڑھاوٴ
رمز	:	اِشارہ	نقش برآب	:	فانی، جلد مٹ جانے والا، بے ثبات

10.09 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر ا : اختر الایمان کی تعلیمی زندگی پر روشنی ڈالیے؟

سوال نمبر ۲ : اختر الایمان کے بچپن کے حالات قلم بند کیجیے؟

سوال نمبر ۳ : اختر الایمان کی فلموں سے وابستگی پر ایک نوٹ لکھیے؟

تفصیلی سوالات

سوال نمبر ا : نظم ''یادیں'' کا تجزیہ کیجیے؟

سوال نمبر ۲ : اختر الایمان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے؟

سوال نمبر ۳ : اختر الایمان کے حالاتِ زندگی کا تفصیلی جائزہ لیجیے؟

10.10 حوالہ جاتی کتب

ا۔ اِس آباد خرابے میں از اختر الایمان

۲۔ یادیں از اختر الایمان

۳۔ بنتِ لمحات از اختر الایمان

۴۔ زمین زمین از اختر الایمان

۵۔ تنہائی میں از اختر الایمان

۶۔ شعر، غیرِ شعر اور نثر از شمس الرحمٰن فاروقی

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

Teenpani Bypass Road, Behind Transport Nagar

Haldwani - 263 139, Nainital (Uttrakhand)

Phone: 05946-261122, 261123 Fax No.: 05946-264232

www.uou.ac.in email: info@uou.ac.in

Toll Free No: 1800 180 4025

https://www.youtube.com/@91.2fmhellohaldwani7

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی کا عوامی ریڈیو جس کے ذریعہ طلبا کے لئے مفید پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔

https://www.youtube.com/@uoulive

MAUL-506-1(004020)